فروری 2013
ماہنامہ
کرن
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب
آپ کی صحت
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

مستقل سلسلے

فروری 2013

جلد 35 شمارہ 11

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ ہم مسلمانوں کو اس نعمت کُل کی یاددہانی کراتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنا بے بدل رحم کرکے انسانوں پر اپنی اکمل و اتم نعمت کا ظہور فرمایا۔ اس مبارک مہینے میں وہ مبارک ذات مبعوث ہوئی تھی جس نے روئے زمین پر انسانوں کو آپس میں اتحاد و یگانگت سے رہنے کا درس دیا۔ آپ کا وجود ایک قوم یا ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک سب انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ کا نمونہ پیش کرتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا۔ آپ کی محبت کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا اور محبت کا تقاضا ہے کہ اپنی ساری تگ و دو اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے کی جائے۔ عقائد، عبادات، خیالات، معاشرت، تجارت، انفرادی اور اجتماعی کاموں غرض کہ زندگی کے ہر پہلو میں اللہ تعالیٰ اور آپ کے اوامر و نواہی کی پابندی کی جائے۔ یہ ہی وہ ذریعہ ہے جسے اپنا کر ہم خود کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بنا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سالگرہ نمبر،

مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ یہ سالگرہ نمبر کرن کی روایت کے مطابق ایک شاندار معیاری حیثیت کا حامل ہوگا۔ مصنفین اور قارئین سے گزارش ہے کہ اپنی تحریریں ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- اداکارہ عروۃ الوثقیٰ سے ملاقات،
- براق ریڈیو پشاور کے مشہور آر جے مدثر خٹک کی باتیں،
- "مقابل ہے آئینہ" میں نسیم محمود الحسن کے جوابات،
- "مجھ سے ملیے" میں تانزیہ جمال نیر قارئین کے روبرو،
- "ماں" کے لیے ثمرین حبیب کا خراج تحسین،
- فوزیہ یاسمین اور نبیلہ عزیز کے سلسلے وار ناولز،
- ریحانہ امجد بخاری کا ناولٹ "وہ اک پری ہے" اپنے اختتام کی طرف،
- شازیہ جمال نیر کا دلکش ناولٹ "ابھی کچھ خواب باقی ہیں"،
- عنیقہ محمد بیگ اور نادیہ امین کے مکمل ناول،
- رفعت سلطانہ کا ناولٹ "کانچ سی زینا"،
- اشیلا کرن کا ناولٹ "محبت جیت ہوتی ہے"،
- سعدیہ عزیز آفریدی، رفاقت جاوید، سدرۃ المنتہیٰ اور فرحین اظفر کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

صحت کے حوالے سے معلوماتی کرن کتاب "آپ کی صحت" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حمد و ثنا کے گلشن نو کو سجائیں ہم
اس ربِ ذوالجلال سے ہی لو لگائیں ہم

غفار ہے، رحیم ہے، رحمانِ بےنظیر
اس بحرِ بے کنار میں ہی ڈوب جائیں ہم

مشکل کشا و حاجت روا اُس کی ذات ہے
کیوں اُسی کے در پہ ہی نہ دیں صدائیں ہم

اُن کے کرم سے دل کا ہے آباد گلستاں
لازم ہے اُس کے ذکر کے ہی گل کھلائیں ہم

بے یار و مددگار ہیں، تنہا ہیں اور غریب
زنجیرِ المدد کی ہی کیوں نہ ہلائیں ہم

وہ مائلِ کرم ہے ازل سے غریبوں پہ
اس کی کرم نوازی کو ہی گنگنائیں ہم

وہ جانتا ہے، دیکھتا، سنتا ہے ہر جگہ
سہراب دل میں جو بھی ہے کیسے چھپائیں ہم

سہراب جنگ

نعت رسول مقبول

محمد ﷺ کی جس پر نظر ہو گئی
وہ ہستی بڑی معتبر ہو گئی

نہ خوفِ لحد ہے، نہ محشر کا ڈر
میری زندگی بے خطر ہو گئی

عقیدت کی شمع جو روشن ہوئی
عجب روشنی میرے گھر ہو گئی

چلا جو مدینے تو آئی ندا
دعا تیری اب باثر ہو گئی

میں صلوٰۃ پڑھتا گیا قبر میں
لحد میری طیبہ نگر ہو گئی

تو طیبہ سے پھر آ فلسطین میں
یہ امت تیری در بدر ہو گئی

کرم وہ کریں گے رضی دیکھنا
میرے دل کی اُن کو خبر ہو گئی

باقر رضا زیدی

عروۃ الوثقیٰ سے ملاقات

شاہین رشید

کبھی کبھی نئے چہرے اچانک ہی اسکرین پہ نمودار ہوتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری ڈرامہ انڈسٹری پر چھا جاتے ہیں۔ آج کل دو بہنیں اسکرین پہ چھائی ہوئی ہیں۔ بہت ہی پیاری اور بہت ہی باصلاحیت اور اضافی خوبی یہ کہ نہایت باادب اور باتمیز ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان سے بات کرکے اچھا لگتا ہے۔ "عروہ" اور "ماورا" آج کل آپ کو ہر دوسرے نہیں تو تیسرے ڈرامے میں تو نظر آرہی ہوں گی اور چونکہ عروہ، ماورا سے بڑی ہیں اس لیے انٹرویو کے لیے "عروہ" سے ہی بات ہوئی۔

☆ "ہیلو کیسی ہیں آج کل کافی کام کر رہی ہیں اور بہت اچھا کام کر رہی ہیں؟"

* "جی ٹھیک ٹھاک۔۔۔ اور بہت شکریہ۔"

☆ "آپ کا سوپ "خوشبو کا گھر" "لاڈلی" "ملیحہ مدیحہ" دیکھا اور ابھی دیکھ رہی ہوں۔ ماشاء اللہ سب میں پرفارمنس بہت عمدہ ہے "ملیحہ مدیحہ" دو بہنوں کی کہانی تھی یہ بتائیں حقیقت میں ایسی بہنیں ہوتی ہیں جو نفرت کریں؟"

* "سچی بات بتاؤں، میں نے تو اپنی اس وقت تک کی زندگی میں کوئی ایسی بہن نہیں دیکھی جو اپنی بڑی یا چھوٹی بہن سے نفرت کرے۔ ہم بھی دو بہنیں ہیں اور آپ یقین کریں کہ ہم دونوں میں اتنا پیار ہے کہ سب ہماری مثالیں دیتے ہیں۔۔۔ اب آگے اللہ جانے رائٹر نے کچھ دیکھا ہوگا تب ہی لکھا بھی ہوگا۔"

☆ "بھائیوں میں نفرت اور جھگڑا ضرور دیکھا ہے مگر بہنوں میں نہیں اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

* "جی بالکل۔۔۔ بہنیں تو ایک دوسرے کی دوست ہوتی ہیں اور اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے سے کرتی ہیں۔ اور جہاں تک مصروفیات کی بات ہے تو کچھ چینلز کے لیے سیریلز ریکارڈ ہو رہے ہیں اور آپ

دیکھیں گی کہ سب میں میرے کردار بہت مختلف اور بہت اچھے ہیں۔"

☆ "ماشاء اللہ آج کل آپ دونوں بہنوں کی بہت ڈیمانڈ ہے اور آپ دونوں کی شکلیں اتنی ملتی ہیں کہ میں آپ دونوں کو ایک ہی شخصیت سمجھتی رہی؟"

* "بس جی اللہ کا شکر ہے اور میں چاہوں گی کہ ہماری ڈیمانڈ ہمیشہ رہے یہ سب میری اماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور آپ ہی ہم دونوں بہنوں کے لیے کنفیوژڈ نہیں ہوئیں اور لوگوں کو بھی ہمارے بارے میں بہت کم معلوم ہے کہ ہم دونوں بہنیں ہیں جب سیریل "یہاں پیار نہیں ہے۔" چل رہا تھا تو لوگ مجھے فون کر کے مبارک باد دیتے کہ تم بہت اچھا پرفارم کر رہی ہو اور "میری لاڈلی" میں ماورا کو بہت مبارکیں ملتی تھیں۔ تو جب آپ ہم دونوں کو اصل میں دیکھیں گی تو ہم آپ کو ایک جیسی ہی لگیں گی۔ لیکن بہرحال اب کافی لوگوں کو پتا چل گیا ہے کہ یہ کوئی ایک شخصیت نہیں بلکہ دو بہنیں ہیں ہم دونوں میں صرف سوا سال کا فرق ہے۔"

☆ "اور آپ اچانک اسکرین پہ نظر آئیں کہاں تھیں اتنا عرصہ؟"

* "بات یہ ہے کہ کبھی سوچا نہیں پلان نہیں کیا تھا کہ ٹی وی اسکرین پہ آنا ہے جب ہم اسلام آباد میں تھے تو تھیٹر کرتے تھے تو وہاں پہ بھی نجی چینل سے آفر آئی کہ ایک شو "ہوسٹ" کر دیا کریں روزانہ شام کو۔ چنانچہ کالج سے وہاں جاتی اور شو کرتی تھی اسی دوران کراچی سے کال آئی کہ آپ ہمیں جوائن کرلیں۔۔۔ مجھے تین سال ہوگئے ہیں کراچی آئے ہوئے اور یہاں بھی میں ایک شو ہوسٹ کر رہی ہوں۔ مجھے ساتھ ساتھ ڈراموں میں آفرز آرہی تھیں مگر میں نے کچھ خاص توجہ نہیں دی، لیکن جب آفرز زیادہ آنے لگیں اور اچھی آفرز بھی تو میں نے سوچا کہ مجھے اداکاری کی طرف بھی آنا چاہیے اور جب میں ہوسٹ تھی تو ساتھ ہی ساتھ کمرشلز بھی کرتی تھی مختلف برانڈز کے۔"

☆ "پہلے کچھ اپنے بارے میں اور اپنے نام کے معنی بھی بتائیں پھر بات چیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں؟"

* "جی میرا نام عروۃ الوثقیٰ اور اس کا مطلب ہے "ایمان کی مضبوط گرفت" اور مجھے سب عروہ ہی کہتے ہیں البتہ گھر والے پیار سے "پری" کہتے ہیں اور میں 2 جولائی 1991ء میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرے بابا آرمی میں ہوتے ہیں ان کے ٹرانسفرز کی وجہ سے ہم شہر شہر گھوم چکے ہیں اور اب گزشتہ تین سال سے کراچی میں ہیں اور ہمارا تعلق سرگودھا سے ہے ہم پنجابی ہیں بنیادی طور پر امی کا تعلق تدریس سے رہا۔۔۔ وہ مکمل طور پر ہاؤس وائف ہیں۔ اب وہ آرام کرتی ہیں اور ہم ان کی خدمت کرتے ہیں۔ میں گریجویشن کر رہی ہوں کراچی یونیورسٹی سے اور گریجویشن کے بعد ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے اور ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں بڑی ہوں پھر ماورا ہے اور پھر بھائی ہے جس کا نام "انس" ہے۔"

☆ "بہت یونیک نام ہیں تینوں کے، کس نے رکھے اور کیا والدین کے نام بھی اتنے ہی یونیک ہیں؟"

* "ہمارے نام ہماری اماں نے رکھے ہیں اور میری مما بھی ماشاء اللہ ڈبل ماسٹرز ہیں ایجوکیشن میں اور اردو

ادب میں اور پڑھائی کی طرف ان کا بہت رجحان رہا ہے اور ہر زبان کو پڑھنے کا شوق ہے امی کا نام نبیلہ ہے ان کے نام تو ان کے والدین نے رکھے ہوں گے۔"

☆ "پڑھائی بھی مکمل ہونے والی ہے کام بھی بہت کر رہی ہیں اپنے بارے میں کچھ اور بھی سوچا ہے؟"

* "شادی بھی ہو جائے گی جیسے والدین چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔ ویسے ہماری پسند کا بھی دخل تو ضرور ہو گا۔"

☆ "ماشاءاللہ تھیٹر سے آغاز کیا پھر ہوسٹنگ کی اور پھر ڈرامے اور ڈرامے میں آتے ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگیں۔ کیا ایسا ہی ہے؟"

* "ایسا بھی ہے لیکن مجھے شہرت کمرشلز سے ملی اس سے پہلے جب میں ایک میوزک شو کر رہی تھی تو بحیثیت "وی جے" کے مجھے کافی لوگ جاننے لگے تھے جب میں نے سیریل "میری لاڈلی" کیا تو اس نے مجھے بہت شہرت دی اور اس کے ساتھ جو دیگر ڈرامے ہو رہے تھے ان میں سب سے زیادہ مقبول "میری لاڈلی" ہی تھا اور اس نے ریکارڈ بزنس کیا اور آپ یقین کریں کہ ان دنوں میں کہیں بھی جاتی تھی تو لوگ مجھے "میری لاڈلی" کے حوالے سے پہچان کر بہت تعریف کرتے تھے۔"

☆ "جب آپ اس فیلڈ میں آئیں تو گھر والوں نے کوئی اعتراض کیا کہ یہ فیلڈ اچھی نہیں ہے؟"

* "آپ یقین کریں گھر والوں نے بہت سپورٹ کیا ـــــ خاص طور پر میری مما نے مجھے بہت زیادہ سپورٹ کیا جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا کہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔ بس اللہ تعالیٰ نے خود ہی راستہ بنا دیا۔ میرا تو اس بات پہ ایمان ہے کہ پلان سے کچھ نہیں ہوتا جس فیلڈ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو لے جانا ہوتا ہے وہاں کے راستے وہ خود ہی ہموار کرتا چلا جاتا ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔"

☆ "اس فیلڈ میں دولت کی بھی کشش ہے؟"

* "بالکل ہے اور انسان محنت ہی پیسے کی خاطر کرتا ہے مجھے یاد ہے کہ جب میں نے تھیٹر میں پہلی مرتبہ کام کیا اور ایک انگریزی ڈرامے میں پرفارم کیا تھا تو مجھے دس ہزار روپے ملے تھے اور میں ان کو پا کر بہت خوش ہوئی تھی اور یہ دس ہزار میں نے اپنی مما کو لا کر دے دیے تھے اور اب بھی میں ایسا ہی کرتی ہوں۔ میرا سارا حساب کتاب میری مما ہی سنبھالتی ہیں۔"

☆ "آپ نے کہا کہ پلان نہیں کرتیں اللہ راستے خود ہی ہموار کرتا ہے گویا قسمت پر یقین ہے۔ کبھی پامسٹ کو ہاتھ دکھایا ـــــ وہ کیا کہتے ہیں؟"

* "جی مجھے قسمت پر مکمل یقین ہے جو قسمت میں لکھا ہوا ہوتا ہے وہی ملتا ہے اور مجھے تو بہت زیادہ شوق ہے پامسٹ کو ہاتھ دکھانے کا۔ لیکن باتیں سب ایک جیسی کرتے ہیں تو یقیناً" اس میں سچائی ہو گی پامسٹ کہتے ہیں آپ لکی ہیں آپ جو کچھ کرنا چاہتی ہیں اس میں کامیاب ہوں گی اور آپ کا فیوچر بہت برائٹ اور اسٹرونگ ہے۔ تو بس اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

☆ "شوبز میں آنے کے لیے خوب صورتی اور ٹیلنٹ کا کتنا عمل دخل ہے؟"

* "میرا خیال ہے کہ ٹیلنٹ اور خوب صورتی دونوں کا ہی عمل دخل ہے۔ اگر آپ خوب صورت ہیں اور اداکاری نہیں آتی تب بھی آپ کامیاب نہیں ہیں اگر آپ کو اداکاری آتی اور آپ گڈ لوکنگ نہیں ہیں تو آپ فیلڈ میں اس صورت میں چل سکتی ہیں بشرطیکہ آپ ہیروئین نہ بننا چاہیں۔ ہاں ہیروئین کے رول کے لیے خوب صورت ہونا ضروری ہے۔"

☆ "عروہ آپ بتا رہی تھیں کہ آپ کی امی کو مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ آپ کو بھی ہے یہ شوق؟ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ آج کل کی نسل مطالعہ سے دور ہوتی جا رہی ہے؟"

* "مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے مگر افسوس کہ مجھے مطالعہ کا وقت بہت کم ملتا ہے اور کبھی کوئی ایسی کتاب ہاتھ لگ جائے جو بہت دلچسپ ہوتی ہے تو پھر اس کو مکمل کر کے ہی چھوڑتی ہوں خواہ مجھے رات بھر جاگ کر ہی کیوں نہ پڑھنا پڑے۔ آگے کیا ہوا والا انتظار تو

مجھ سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ مطالعہ ہماری زندگی کے لیے بہت ضروری ہے اس سے نالج میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔"

☆ "ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے؟"

* "جی بالکل ہوتا ہے۔ کئی بار ملک سے باہر جا چکی ہوں اور باہر کی سب سے اچھی بات مجھے یہ لگتی ہے کہ وہاں سینس آف فریڈم ہے۔ آپ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو خواہ آپ نے شلوار قمیص پہنا ہوا ہو کوئی آپ کو مڑ مڑ کر نہیں دیکھے گا۔ جبکہ پاکستان میں آپ برقعہ پہن کر بھی باہر نکلیں تو لوگ حیرانی سے دیکھیں گے کہ اس نے برقعہ کیوں پہنا ہوا ہے حالانکہ وہ بیچاری پورے پردے میں ہوتی ہے مگر لوگوں کو خوامخواہ تشویش ہو رہی ہوتی ہے۔ ہاں باہر کے ملکوں میں مجھے لوگوں کی ایک بات بہت بری لگتی ہے کہ وہ اپنی سڑکوں کو صاف رکھتے ہیں اپنے گھر کو صاف رکھتے ہیں مگر اپنے آپ کو صاف نہیں رکھتے جبکہ ہمارے لوگ بہت پاک صاف رہتے ہیں۔ ہاں باہر کے لوگ مخلص بہت ہیں۔"

☆ "اپنے ملک میں تو مخلص لوگ نقصان ہی اٹھاتے ہیں ـــــ ویسے محبت کا صلہ ملتا ہے؟"

* "ملنا تو چاہیے مگر ملتا نہیں ہے مجھے اپنی شخصیت کی سب سے کمزور بات یہ لگتی ہے کہ میں کسی کو پسند کرتی ہوں تو پھر پسند کی آخری حد تک چلی جاتی ہوں جیسے اپنی مما کو یا اپنی بہن کو یا پھر دوستوں کو۔ مگر گھر والوں سے تو محبت کا ریٹرن مل جاتا ہے لیکن جب دوستوں سے ریٹرن نہیں ملتا تو پھر مجھے احساس ہوتا ہے کہ کسی کے لیے اتنا بھی آگے نہیں نکلنا چاہیے۔ ایسے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ آج کل کے لوگ بہت Fake ہو گئے ہیں۔ اگر ہم ان جیسے بن جائیں تو زندگی بڑی آسان گزرے چونکہ میں نئی نئی اس فیلڈ میں ہوں اور نئے نئے لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے تو کبھی کبھی ایسے لوگوں سے گھبرا جاتی ہوں اور پھر فوراً" اپنی مما کو کال کرتی ہوں ـــــ اور ہر بات ڈسکس کرتی ہوں۔"

☆ "کیا ڈراموں کے کردار فنکار کی شخصیت کے قریب ہوتے ہیں؟ ہوتے ہیں تو کتنے؟"

* "میرے خیال میں تو بہت کم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں "مدیحہ ملیحہ" کی مثال دوں گی۔ ایسی بہن میں نے نہیں دیکھی اور بہن تو پھر بہن ہوتی ہے میں نے تو کسی سہیلی کے لیے بھی ایسا نہیں سوچا ـــــ اور سچ بات بتاؤں کہ "مدیحہ ملیحہ" میں "ملیحہ" کا کردار کرنے میں مجھے دشواری بھی بہت پیش آئی کیونکہ مجھ سے برا نہیں بنا جا رہا تھا مگر میرے ڈائریکٹر نے میری بہت مدد کی کہ سوچو کہ تم کس طرح سے بول سکتی ہو۔ کس طرح سے ایکسپریشن لا سکتی ہو۔ شکل پہ غصہ لے کر آؤ اور مجھے یاد ہے کہ جس زمانے میں میں ملیحہ کا رول کر رہی تھی کسی حد تک میں ملیحہ ہی بن گئی تھی تو مما پریشان تھیں کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تو کردار کا اثر ضرور ہو جاتا ہے کر کر کے مگر کردار میں شخصیت کا عکس نہیں ہوتا۔"

☆ "اتنی مصروفیات میں گھر والوں کے لیے وقت تو نہیں ملتا ہو گا؟"

* "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ گھر والوں کے لیے تو میں وقت نکال ہی لیتی ہوں۔ البتہ میرا ایک شوق ہے گانا گانے کا۔ بس اس کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو رہا ہے آج کل میں ایک اچھی گٹارسٹ بننا چاہتی ہوں ـــــ میرے جو رسل شوق ہیں ان کے لیے وقت نکالنا میرے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔"

☆ "سیاست سے لگاؤ ہے ـــــ اور فیلڈ میں سیاست ہے؟"

* "سیاست سے بہت زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ مگر میں سیاست کو سمجھتی بہت ہوں۔ اگر آپ ملک کی سیاست کی بات کریں تو ہمارا ملک اس وقت شدید بحران کا شکار ہے اگر ملک میں بجلی آ جائے اور ہماری گورنمنٹ تبدیل ہو جائے تو میں سمجھتی ہوں کہ پاکستان سے اچھا کوئی ملک ہی نہیں ہے۔ اس حکومت نے تو ملک میں بہت تباہی مچا دی ہے اور جہاں تک فیلڈ کی سیاست کی بات ہے تو میں ہر قدم بہت پھونک پھونک کر اٹھاتی ہوں جہاں کہیں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ فلاں کو میری

یہ بات بری لگی ہے میں اس سے سوری کر لیتی ہوں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ اتنا سوری نہ بولا کرو۔ تو میں کہتی ہوں کہ نہیں، کسی کو میری بات بری لگے تو مجھے فوراً "سوری کر لینا چاہیے۔ اس سے انسان کی عزت میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔"

☆ "لڑکیاں جب مشہور ہو جاتی ہیں تو ان کو یہ بہت محسوس ہوتا ہے کہ ہماری پرائیویسی ختم ہو گئی ہے۔ ہم کہیں آزادی سے آجا نہیں سکتے ایسا ہے آپ کے ساتھ؟"

* "ہاں ایسا ہے تو سہی اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں عام انسان کی طرح زندگی گزاروں۔ ویسے تو یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے شہرت دی، لیکن پھر بھی جب بھی گھر سے نکلو تو مشکل ہو جاتا ہے کسی جگہ پر کھڑا ہونا اور شاپنگ کرنا تو کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہم بھی مارکیٹ جائیں اور عام لوگوں کی طرح شاپنگ کریں اور میں اپنے ناظرین کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہمارا کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہم صبح نو بجے گھر سے نکلتے ہیں اور رات، گیارہ بجے فارغ ہو کر گھر آتے ہیں بارہ گھنٹے کی شفٹ ہوتی ہے اور ہر روز ہوتی ہے تو بس ایک اتوار کا دن ہوتا ہے جو ہمارا ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی میں اپنے پرسنل شوق پورے نہیں کر سکتی۔ تو عام انسان سے میں یہ ضرور کہوں گی کہ اگر ان کے پاس ٹائم ہے تو وہ ضرور اپنے شوق پورے کریں۔ اپنے وقت کو ضائع نہ کریں۔"

☆ "کوئی کردار جس کو کرنے کا بہت شوق ہو؟"

* "میرا دل ہے کہ میں گاؤں کی لڑکی کا کردار کروں، جو کہ بہت ہی بے پرواہ ہوتی ہے نہ اسے میک اپ کا پتا ہے نہ اسے نت نئے فیشن کا پتا ہے۔ بہت ہی بھولی بھالی الھڑ مٹیار ہے۔ جس کا جو دل چاہتا ہے وہ کرتی ہے بہت شوخ و چنچل، مست ملنگ۔"

☆ "کھانے پینے کی شوقین ہیں؟"

* "نہ صرف شوقین ہوں بلکہ اپنا خیال بھی بہت رکھتی ہوں۔ ایک روٹین لائف کے تحت زندگی گزارتی ہوں کہ کتنے بجے اٹھنا ہے۔ کتنے بجے سونا ہے۔ کس وقت کھانا ہے کتنے گلاس پانی پینا ہے۔ کتنا کھانا ہے کتنا نہیں کھانا۔۔۔ کیا کھانا ہے کیا نہیں کھانا لیکن سچ پوچھیں تو میں اپنی اس روٹین لائف سے تنگ آجاتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش میں بھی ان لوگوں کی طرح ہو جاؤں جو بھول جاتے ہیں کہ کتنا پانی پیا کتنا کھایا۔ کب اٹھے کب سوئے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"

☆ "شہرت کے زوال سے ڈر لگتا ہے؟"

* "بہت ڈر لگتا ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ شہرت نہیں رہے گی تو پھر کیا ہو گا۔ بے شک ابھی شہرت کا آغاز ہے مگر کم عمری میں اللہ نے بہت کچھ دے دیا ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ جو چیز مل جاتی ہے پھر اس کی عادت پڑ جاتی ہے جیسے میں سوچتی ہوں کہ میں جہاں جاتی ہوں لوگ مجھے پہچان لیتے ہیں لیکن اگر یہ پہچان ختم ہو گئی تو۔۔۔ اس لیے کہ مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔"

☆ "فلموں میں کام کرنے کی خواہش ہے اور رائٹر ڈائریکٹر دیکھ کر ڈرامہ لائن کرتی ہیں؟"

* "میری خواہش ہے کہ میں ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کروں۔ ہر ایک کی فلم میں نہیں صرف ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی چونکہ نئی ہوں تو اپنا کردار ضرور پڑھتی ہوں کہ کیسا ہے۔ پسند آتا ہے تو سائن کر دیتی ہوں۔ کاسٹ کو بھی ضرور دیکھتی ہوں۔ ویسے مجھے اندازہ ہے کہ رائٹر بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن چونکہ وہی بات کہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس فیلڈ میں تو مجھے نہیں معلوم کہ کون سا رائٹر اچھا ہے اور کون سا ڈائریکٹر اچھا ہے۔"

☆ "گھرداری کر لیتی ہیں۔۔۔ کھانا پکانے کا شوق ہے؟"

* "گھرداری سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔۔۔ اور بہت اچھا کھانا پکا لیتی ہوں۔ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں کہ جن کو انڈا بھی ابالنا نہیں آتا (قہقہہ)"

☆ "اور کس انڈین اسٹار سے لوگ میچ کرتے ہیں؟"

* "ہاں بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ کرینہ کپور سے شکل ملتی ہے مگر مجھے نہیں لگتا کم سے کم اسکرین پہ تو بالکل بھی نہیں۔۔۔ شاید آف دی اسکرین لگتی ہوں گی۔"

☆ ☆

میری بھی سنیے

ارشد ملک

شاہین رشید

☆ نام؟
○ ارشد ملک
☆ پیدائش/اسٹار؟
○ 3 مارچ 1978ء راولپنڈی، حوت
☆ تعلیم؟
○ اسکول کالج سے زیادہ دنیا سے سیکھا ہے۔
☆ ازدواجی زندگی کا آغاز
○ 12 اکتوبر 2000ء راولپنڈی میں ہوا اور رمیل، ربیعہ، رائمہ، عبدالرافع میرے پھول سے بچے ہیں۔
☆ فن شاعری میں طبع آزمائی کا آغاز؟
○ شاعری کا بچپن سے بہت شوق تھا لیکن 1988ء میں پہلے انتخاب میں پہلی غزل لگی جسے بہت پسند کیا گیا تو شوق نے ترقی کے سفر کا آغاز کیا۔
☆ پہلا شعر؟
تم ہی کو چاہتے ہیں ہم، تم ہی سے پیار کرتے ہیں
یہی برسوں سے عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے
☆ شاعری کی کتابیں؟
○ دل درد کا ٹکڑا ہے، کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں، محبت اک سمندر ہے
☆ پسندیدہ کتاب؟
○ ممتاز مفتی کی کتاب "تلاش"
☆ پسندیدہ تحفہ؟
○ کسی کو دینا ہو تو اس کی پرسنیلٹی دیکھ کر تحفہ دینا، خود کو پرفیوم ملے تو اچھا لگتا ہے!
☆ سب سے قیمتی چیز؟
○ میری شاعری
☆ بچپن؟
○ شرارتی
☆ اسکول لائف کا پسندیدہ شاعر؟
○ احمد فراز
☆ پسندیدہ جملہ؟
○ خود پہ اعتماد کرنا سیکھیں
☆ پسندیدہ سوال؟
○ کامیابی کے موضوع پر سوال کرنا پسند ہے
☆ کامیابی کی تعریف؟
○ مطلوبہ مقام پا لینے کے بعد بھی آپ میں تکبر نہ آئے اور آپ میں پہلے جتنی عاجزی رہے
☆ خود کو کامیاب سمجھتا ہوں کیوں؟
○ کیونکہ میرا ہر نیا دن پہلے والے دن سے بہتر گزرتا

ہے
☆ پسندیدہ موسم؟
○ اسے کہنا کہ بارش کھڑکیوں پہ اس کے آنسو پینٹ کرتی ہے
مطلب بارش
☆ پسندیدہ قلم؟
○ ہمراہی اور کبھی کبھی
☆ پسندیدہ گانا؟
○ ہمیں تم سے پیار کتنا
☆ پسندیدہ شاعر؟
○ عدیم ہاشمی
☆ خود میری کوئی خاص عادت؟
○ پر اعتماد گفتگو سننا اور اپنے مقصد سے سچی لگن ہونا
☆ مستقبل کی خواہش؟
○ مستقبل میں شاعر کو معتبر مقام دلاؤں
☆ ماضی کی کوئی یاد؟
○ ہر بات بتانے والی تو نہیں ہوتی
☆ شہرت کی وجہ؟
○ اپنے قاری کو ساتھ لے کر چلتا ہوں اور قاری کے معیار کے مطابق لکھنا
☆ پسندیدہ کھانا؟
○ پالک گوشت
☆ پسندیدہ لوگ؟
جو میرے مزاج سے ملتے ہوں
☆ مجھے غصہ آتا ہے؟
○ جب کوئی دھوکہ دے
☆ پسندیدہ موضوع؟
○ کامیابی
☆ بہت ڈرتا ہوں؟
○ کسی کا دل ٹوٹنے سے
☆ بہت خوش ہوتا ہوں؟
○ کوئی بھی اچھا کام کرنے کے بعد
☆ برداشت نہیں کر سکتا؟
○ ڈسپلن کی خلاف ورزی
☆ بہت آزمایا (بات، قول)؟
○ حضرت علی کا قول "جس شخص پہ احسان کرو اس کے شر سے بچو"
☆ میں بھول جاتا ہوں؟
○ کسی سے انتقام لینا
☆ محبت کے بارے میں خیال؟
○ محبت سوچتا ہوں محبت سیکھتا ہوں
☆ اگر حکومت ملے تو؟
○ غریب اور امیر کے لیے نظام تعلیم ایک جیسا کر دوں
☆ مجھے زیادہ داد ملی؟
○ رحیم یار خان کے ایک مشاعرے میں
☆ ادبی کارنامہ؟
○ ادبی اور ثقافتی تنظیم "سخنور" کا قیام خود عمل میں لایا ہوں
☆ بچپن کی یاد؟
○ لمبے بال، موٹر سائیکل اور گنگنانا
☆ امی سے ڈانٹ پڑی؟
○ کئی دفعہ اسکول سے چھٹی کرنے کی ضد پر
☆ شدید خواہش؟
○ آج کا شاعر اساتذہ کے کلام کو زیادہ پڑھے اور خود کم لکھے
☆ بہت اچھا لگتا ہے؟
○ بچوں کے ساتھ وقت گزارنا
☆ سکون ملتا ہے؟
○ اچھا شعر کہہ کر
☆ دل چاہتا ہے؟
○ کہ پاکستان اور اس کے باسیوں کو پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے؟
☆ پسندیدہ شہر؟
○ اسلام آباد
☆ متاثر ہوں؟
○ محمد علی جناح سے کہ بظاہر کمزور نظر آنے والا شخص ایک عظیم کام کر گیا
☆ میرے نزدیک قیمتی چیز؟
○ وقت، جسے ہم ضائع نہیں کرتے مگر اکثر جو کام کر رہے ہوتے ہیں وہ فضول ہوتا ہے
☆ بہترین خدمت؟
○ لوگوں میں خوشیاں بانٹی جائیں
☆ میرے خیال میں؟
○ ہر شخص کو خطبہ حجتہ الوداع زبانی یاد ہونا چاہیے۔ جسے انسانی حقوق کا اہم ترین اور بلند ترین چارٹر تسلیم کیا جاتا ہے
☆ پسندیدہ رنگ؟
○ ڈریس (بلیک کلر) گاڑی (وائٹ کلر)
☆ سب سے پیارا رشتہ؟
○ باپ بیٹی کا
☆ میری لکھی پہلی نعت؟
○ کرو ذکر میرے حضور کا
کہ کھلے دریچہ شعور کا
☆ پسندیدہ دن؟
○ ویسے تو جمعہ کا دن، لیکن حج کا دن جب طواف بیت اللہ میں مصروف تھا
☆ پریشان ہوتا ہوں؟
○ مجھے یقین نہیں آتا
☆ پسندیدہ موسیقی؟
○ نصرت فتح علی خان کی قوالی "تم ایک گورکھ دھندا ہو"
☆ روحانی تجربہ؟
○ حج بیت اللہ
☆ یادگار لمحات؟
○ بیت اللہ پر پہلی نظر
☆ پسندیدہ پھول؟
موتیا

☆ پسندیدہ لباس؟
○ پینٹ شرٹ
☆ یادگار تعریفی کلمات؟
○ آپ کی پرسنالٹی بہت اچھی ہے
☆ قارئین کے نام پیغام؟
○

اس تیرگی میں ایک دیے سے شگاف کر
کوئی تو کام تو بھی ہوا کے خلاف کر

یہ جو اڑائے پھرتی ہے تجھ کو تیری انا
مٹی کے پاس بیٹھ ذرا اعتکاف کر

ارشد جو تجھ کو حسن حقیقت کی ہے تلاش
پہلے تو اپنی ذات کے اندر طواف کر

☆ ☆

مدثر خٹک

شاہین رشید

ایف ایم ریڈیو کا دائرہ کار پورے پاکستان میں ہے اور تمام ایف ایم میں اردو سروس کے ساتھ ساتھ اس صوبے کی مقامی زبان میں بھی پروگرام کیے جاتے ہیں جو مقبول عام ہیں۔

صوبہ خیبر پختونخواہ کے شہر پشاور میں ایف ایم ریڈیو براق 104 بہت مشہور ہے اور ان کے آر جے بھی ..... توانہی مقبول آر جے میں آج مدثر خٹک سے کی گئی گفتگو آپ کی نذر ہے۔

☆ "کیا حال ہیں اور کیا کر رہے تھے؟"

* "جی اللہ کا شکر ہے اور پڑھائی کر رہا تھا کیونکہ میرا ایم بی اے کا فائنل ایئر ہے۔"

☆ "او ..... اچھا۔ گڈ ..... ریڈیو کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

* "فی الحال تو یہی ہے کہ یونیورسٹی سے ریڈیو اور ریڈیو سے گھر، پڑھائی ہے اور کچھ بھی نہیں فارغ ہوتا ہوں تو کچھ گیمز وغیرہ کھیل لیتے ہیں۔"

☆ "تعلیم کا خرچہ خود برداشت کر رہے ہیں یا یہ ذمہ داری والدین پہ عائد کی ہوئی ہے؟"

* "جی فی الحال تو ابو ہی سب کچھ کرتے ہیں اور ایم بی اے مارکیٹنگ میں کر رہا ہوں کیونکہ مارکیٹنگ کا بہت اسکوپ ہے آج کل۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں ..... اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

* "خیبر پختونخواہ میں بنوں کی سائیڈ پہ ایک گاؤں ہے "کرک" وہاں سے ہمارا تعلق ہے۔ میرے والد ٹیلی کام انجینئر ہیں اور وہ نجی ٹیلی کام میں بحثیت انجینئر کے کام کرتے ہیں اور ہم چار بھائی ہیں اور دو بہنیں ہیں والدہ ہاؤس وائف ہیں اور ماشاء اللہ بہت عقلمند ہیں ..... اور میرا ایک بھائی موبی لنک میں کام کرتا ہے۔"

☆ "او..... ہو، تو فون سارے فری ہوتے ہوں گے؟"

* "میرے تو مفت نہیں ہیں ان لوگوں کے مفت ہیں اور جب میں اس سائیڈ پہ گیا تو میرے بھی مفت ہو جائیں گے ..... خیر ہم چار بھائی بہنوں میں میرا نمبر پہلا ہے اور میری تاریخ پیدائش 10 اکتوبر 1989ء ہے اور میرے کزن جو چھوٹے ہیں وہ اکثر کہتے ہیں کہ تم سے چھوٹے کزن تو ڈرائیونگ بھی کرتے ہیں اور جاب بھی کرتے ہیں اور تم کچھ نہیں کرتے۔"

☆ "جو گھر کے بڑے ہوتے ہیں ان کی شادی کا گھر والوں کو بہت ارمان ہوتا ہے۔ آپ کے گھر والوں کو بھی ہو گا؟"

* "شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے اور ہمارے یہاں تو اس وقت تک لڑکے کی شادی نہیں کرتے جب تک وہ کمانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور اچھا کمانے نہیں لگتا جب تک سوچتے بھی نہیں ہیں اور ابھی تو میرے چاچا کی باری ہے اس کے بعد میرے بارے میں سوچا جائے گا۔ ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ جب لڑکے کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کے سر پر "دو تلواریں" آجاتی ہیں اور دو تلواروں کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

☆ "ویسے اپنی پسند سے کریں گے یا والدین کی پسند سے کریں گے اور بہنیں شادی شدہ ہیں؟"

* "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری پسند بھی ہو اور والدین کی پسند بھی ہو۔ میں لو پلس ارینج پر یقین رکھتا ہوں کیونکہ لڑکے لڑکی میں انڈر اسٹینڈنگ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میری دو بہنوں میں ایک بہن کی شادی ہو چکی ہے اور دوسری کو صحافت کا بہت شوق ہے وہ اخبارات میں آرٹیکل لکھتی ہے اور آرٹیکل لکھنے پر اس کو فرسٹ پرائز بھی ملا تھا اور میٹرک میں بھی اس کی پوزیشن آئی تھی۔ اس کا نام صبا خٹک ہے۔"

☆ "گڈ..... اچھا یہ بتائیں کہ ریڈیو پہ آنے کا شوق کیسے ہوا اور ریڈیو پہ ہی آنا کیوں پسند کیا جبکہ آج کل کے نوجوان تو ٹی وی پہ آنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

* "انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ اگر آپ بڑا بننا چاہتے ہیں تو پہلے چھوٹے کام سے اسٹارٹ کریں۔ میں نے 2006ء میں ریڈیو جوائن کیا تھا اور اس وقت میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ میٹرک کے امتحان کے بعد میں فارغ تھا کچھ کرنے کو دل چاہ رہا تھا تو میں ریڈیو گیا اور ریڈیو کا شوق ایسے ہوا کہ ریڈیو "بنوں" میں ایک آر جے تھے "نوید صاحب" ان کو سنتا تھا تو میرا دل چاہا کہ میں بھی ان کی طرح ریڈیو پہ بولوں اور پروگرام کروں اور ان سے ملاقات کروں۔ چنانچہ پھر میں ایک دن نوید صاحب سے ملا اور شوق کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ بھی اس فیلڈ میں آسکتے ہیں۔ بس تب سے ہی میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں ضرور اس فیلڈ میں آؤں گا۔ پھر جب ڈی جی خان میں میں نے گومل یونیورسٹی میں داخلہ لیا وہاں گومل یونیورسٹی میں ایک کیمپس تھا ایف ایم ریڈیو کا وہاں ہمارے گاؤں کے ایک پروڈیوسر تھے ان سے میں نے اپنے شوق کا اظہار کیا انہوں نے کہا کہ آڈیشن دے دو اور ایک دو اسکرپٹ لکھوائے جو کہ چھ سات دن کے تھے۔ میں نے بہت ریسرچ کر کے اور بہت ہی محنت کے بعد اسکرپٹ لکھے جب میں نے وہ اسکرپٹ دکھائے تو انہوں نے کہا کہ بس بیٹھ جاؤ اور شو کرو۔ چنانچہ میرا پہلا شو کمبائن تھا اور اس وقت میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔"

☆ "آپ بتا رہے ہیں کہ آپ نے لمبے لمبے اسکرپٹ لکھے تو کیا آپ کو لکھنے کا شوق تھا؟"

* "جی بالکل تھا میرے لکھنے کا شوق میری بہن میں منتقل ہوا..... اور گومل یونیورسٹی کے میگزین کے لیے بھی لکھتا تھا اور گومل یونیورسٹی کے لیے رپورٹنگ بھی

کرتا تھا مگر پیسے نہیں لیتا تھا۔۔۔ کیونکہ مجھے اس فیلڈ میں آنا تھا اور ہماری ایک میڈم تھیں فاطمہ وہ مجھے بہت گائیڈ کرتی تھیں کہ اسکرپٹ کس طرح لکھا جاتا ہے۔ تو میرا اسکرپٹ میڈیا کے ریوائیول کے بارے میں تھا کہ اسلام کی شروعات سے اب تک میڈیا میں جو ترقی تنزلی ہوئی ہے اس کے بارے میں لکھا تھا اور پھر ایف ایم کی ہسٹری کے بارے میں بھی لکھا اور پھر اسے اردو اور انگریزی میں ترجمہ کر کے لکھا تو انہوں نے کہا تھا کہ اب آپ شو کریں۔"

☆ "تو کیا تاثرات تھے جب پہلے پروگرام یا شو کو کرنے کے لیے کہا گیا؟"

* "عجیب تاثرات تھے کیونکہ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی آفر آجائے گی اور شو کروں گا۔ کیونکہ اس کے لیے تو میں نے دیکھا تھا کہ لوگوں کو کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن مجھے دو چار دن کے بعد ہی شو کرنے کے لیے کہا گیا تو میں تو بہت زیادہ خوش ہو گیا لیکن وہ لوگ جو مجھ سے بھی پہلے آئے تھے اور جو میرے ساتھ آئے تھے ان کو جب پتا چلا کہ مجھے شو کرنے کی آفر آئی ہے تو انہوں نے بہت اعتراض کیا کہ ہم تو ویٹ کر رہے ہیں اور ایک گاؤں کے لڑکے کو سلیکٹ کر لیا گیا ہے۔ ایک سینئر آر جے نے بھی بہت اعتراض کیا کہ یہ تو کالج کا لڑکا ہے اسے کیوں پروگرام کرنے کو کہا گیا ہے۔"

افغانستان کا ایک چینل تھا Pact Radio یہ ریڈیو چینل ڈی جی خان میں آیا اور اس میں میرے دوست بھی کام کرتے تھے۔ تو میں نے دوستوں سے کہا کہ میں بھی آؤں گا اور دیکھوں گا کہ آپ سب کس طرح پروگرام کرتے ہیں اس طرح مجھے بھی کچھ سیکھنے کا موقع مل جائے گا۔۔۔ اس چینل کا نام گلوبل ایف ایم 91ء تھا تو میں ایک دن اس کے پروگرام منیجر سے ملا اور کہا کہ اگر آپ مجھے ایک شو کرنے کے لیے دے دیں تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔۔۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ دو بجے فارغ ہو تو آجاؤ اور پروگرام کر لو اب یہاں بھی مجھے اچانک ہی پروگرام مل گیا۔۔۔ اور جب میں پروگرام کر رہا تھا تو پروگرام منیجر بھی میرے سامنے بیٹھے تھے اور اسٹیشن ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی میرے سامنے بیٹھے تھے اور میں پروگرام کرنے میں محو رہا تو اس پروگرام کا رسپانس بہت اچھا ملا۔"

☆ "کس زبان میں زیادہ شو کیے آپ نے؟ پشتو میں زیادہ کیے ہوں گے؟"

* "کیے ہوں گے کیا؟ کیے اور میرے اوپر تو لیبل ہی لگ گیا تھا کہ آج پشتو والے آر جے نظر نہیں آ رہے کیا ہوا ہے ۔۔۔' میں نے اردو میں بھی اور سرائیکی زبان میں بھی شوز کیے ہیں اور آج کل میں پشتو میں ہی کر رہا ہوں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ایف ایم 104 براق ریڈیو سے پروگرام کر رہا ہوں اور یہ پشاور سے ہوتا ہے تو انہیں پشتو کا آر جے چاہیے تھا تو میں پشتو میں ہی پروگرام کرتا ہوں۔"

☆ "کن کن FM میں کام کر چکے ہیں آپ؟ لوگ سنتے ہیں شوق سے؟"

* "میں نے ایف ایم 85 میں کام کیا ہے جو کہ بنوں میں ہے پھر ایف ایم 91 میں کیا اب ایف ایم 104 سے وابستہ ہوں اور لوگ بہت شوق سے سنتے ہیں۔ حالانکہ اب ٹی وی کا زمانہ ہے۔ مگر اس کے باوجود ڈرائیونگ کے وقت اور لوڈ شیڈنگ کے وقت لوگ ریڈیو ہی سنتے ہیں اور دیہات اور گاؤں کے لوگ ریڈیو بہت زیادہ سنتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ٹی وی اور کیبل کی سہولت ذرا کم ہی ہوتی ہے۔"

☆ "آپ کے پروگرام کا فارمیٹ کیا ہوتا ہے؟"

* "میرا یوتھ شو ہوتا ہے نوجوانوں کے حوالے سے پروگرام ہوتا ہے اور ہفتے میں چار دن پروگرام کرتا ہوں ۔ پیر سے لے کر جمعرات تک اور دوپہر دو بجے کرتا ہوں۔"

☆ "پڑھائی کے ساتھ ساتھ ریڈیو بھی چل رہا ہے تو ٹائم نکالنا مشکل نہیں ہوتا کیا؟"

* "اب چونکہ ایم بی اے کا فائنل ہے اور مجھے صرف تھیسس ہی لکھنے ہیں تو اب میرے لیے ٹائم نکالنا مشکل نہیں ہے۔ اب چونکہ ٹائم زیادہ ہے تو

میں اپنے پروگرام پر زیادہ توجہ دیتا ہوں تین دن سوال جواب کا سلسلہ ہوتا ہے اور چوتھے دن ان سے یعنی سامعین سے گپ شپ بھی رہتی ہے اور عام موضوعات پر بات بھی کرتا ہوں۔"

☆ "لائیو کالز لیتے ہیں تو کس عمر کے لوگ اور خواتین آپ کو کال کرتی ہیں؟"

* "یہ مشہور بات ہے کہ ایف ایم ریڈیو زیادہ تر لڑکیاں سنتی ہیں کیونکہ میرے پاس تو لڑکیوں کی کالز زیادہ آتی ہیں اور جو SMS آتے ہیں وہ بھی 80 فیصد لڑکیوں کے ہی ہوتے ہیں۔ شاید ان کے پاس وقت بہت زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ ہماری ایک آر جے آمنہ ہیں ان کے پاس زیادہ تر لڑکوں کی کالز آرہی ہوتی ہیں۔"

☆ "یہ حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ مخالف سمت کی طرف ہی چلتا ہے خیر آپ نے ریڈیو سے شروعات کی ۔ اب اگلا قدم ٹی وی کی طرف ہو گا؟"

* "ہمارا۔ فیملی بیک گراؤنڈ ۔۔۔ مذہبی ہے اور ہمارے یہاں ریڈیو ٹی وی کی اجازت نہیں ہے ۔۔۔ ہمارے گھر میں ٹی وی ہے نہ ریڈیو ہے اور مجھے بھی صرف میری بہنیں سنتی ہیں۔ امی سنتی ہیں نہ ابو اور ابو کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ میں ریڈیو پہ کام کرتا ہوں اور جس دن ابو کو پتا چل گیا کہ میں ریڈیو پہ آتا ہوں تو پھر وہ دن ریڈیو پہ میرا آخری دن ہو گا۔"

☆ "ارے کیوں۔۔۔ آپ لڑکی تو نہیں ہیں کہ انہیں پریشانی ہو گی؟"

* "کیا کریں بندے کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ ان کی نظر میں ریڈیو ٹی وی پہ کام کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے اور مذہب بھی اس کی اجازت نہیں دیتا اور مزے کی ایک بات بتاؤں کہ میں جب ڈی جی خان میں شو کرتا تھا تو اپنے نام سے نہیں کرتا تھا بلکہ میں "ارمان" کے نام سے کرتا تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ابو کو نہ پتا چلے کہ میں پروگرام کر رہا ہوں اور دلچسپ بات یہ کہ میرے

سب سے بڑے فین میرے ابو تھے ۔۔۔ یہ بات ہمارے ڈرائیور نے مجھے بتائی جس دن میں نے پشاور شفٹ ہونا تھا اس دن "ڈی جی خان" میں میرا آخری شو تھا اور اسی دن میرے ابو کی ٹرانسفر کی بات بھی ہو رہی تھی کہ کوہاٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گا اتفاق سے میرا بھی آخری شو تھا تو میں بار بار کہہ رہا تھا کہ آج میرا آخری شو ہے اور پھر میں پشاور میں دوسرے چینل پہ چلا جاؤں گا۔" تو ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ آپ کا پروگرام سن کر ابو کہنے لگے کہ دیکھو یہ بچارا بھی مسافر ہو گیا ہے اور ہم بھی مسافر ہو گئے ہیں۔"

☆ "تو کیا آپ کے ابو آپ کی آواز نہیں پہچانتے تھے؟"

* "یہی تو مجھے حیرت ہے کہ ابو میری آواز بھی نہیں پہچانتے تھے۔ شاید ان کے گمان میں بھی نہیں تھا اور نہ ہے کہ ان کا بیٹا پروگرام کرتا ہو گا۔ جب میں ڈی جی خان سے پروگرام کرتا تھا تو میں 4th ایئر کا طالب علم تھا۔"

☆ "کبھی گھر میں ذکر کیا کہ ریڈیو پہ "ارمان" نام کا بندہ بہت اچھا پروگرام کرتا ہے؟"

* "امی بتا رہی تھیں کہ ایک مرتبہ میں ساتھ جا رہی تھی تو ریڈیو لگا کر بولے کہ اس ایم ایف میں ایک دو آر جے ہی ایسے ہیں جو بہت اچھا پروگرام کرتے ہیں ان

میں ایک پشتو والا ہے۔ جو بہت نرم زبان میں بات کرتا ہے..... (پشتو میں بھی ایک زبان بہت سخت یعنی مشکل زبان ہے اور پشاور کی زبان نرم یعنی آسان ہے) میں پشاور کی زبان بولتا تھا ابو کو میری زبان بہت اچھی لگتی تھی تو امی بتا رہی تھیں کہ میرے ابو پروگرام کی بہت تعریف کرتے تھے۔"

☆ "آپ کو خود اپنا پروگرام سننے کا موقع ملا یعنی ریکارڈ کرکے؟ میڈیا میں جانے کا رجحان ہے؟"

* "میں نے آج تک اپنی آواز نہیں سنی ریڈیو پہ..... اور جس دن سن لوں گا اس دن پھر میں شو نہیں کروں گا کیونکہ مجھے اپنی آواز بہت بری لگتی ہے اور میڈیا میں اگر آیا تو پھر انٹرٹینمنٹ کی طرف جاؤں گا۔"

☆ "کچھ نجی سوال کہ آپ مزاج کے کیسے ہیں۔ غصے کے تیز ہیں یا نرم ہیں؟"

* "غصہ آتا نہیں ہے اور آتا ہے تو بڑا تیز آتا ہے پھر جلدی گزر بھی جاتا ہے اور جس پر غصہ آتا ہے اس کو وہاں سے جانے کا کہتا ہوں یا پھر خود چلا جاتا ہوں۔ اگر فون پر غصے والی بات ہو رہی ہو تو پھر فون بند کر دیتا ہوں ضد بھی مجھ میں بہت ہے۔ مگر غصہ اور ضد خطرناک حد تک نہیں ہے۔"

☆ "کھانے پینے کے شوقین ہیں؟"

* "کھانے پینے کا تو بہت شوق ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ اچھا کھانے کو مل جاتا ہے کھا لیتا ہوں ہماری زبان میں ایک ضرب المثل ہے کہ جو تیار ہے وہی مہمان کے لیے پیش کر دو..... تو میں خود بھی یہی کرتا ہوں جو تیار ہوتا ہے وہ خوشی خوشی کھا لیتا ہوں۔"

☆ "نخرہ نہیں ہے کیا آپ میں؟"

* "نہیں..... نخرہ تو نہیں ہے لیکن ایک سبزی ایسی ہے جو مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے وہ "کدو" ہے حالانکہ یہ سنت والی سبزی ہے۔"

☆ "آپ کے ابو نے آپ کو آواز سے کبھی نہیں پہچانا تو دیگر لوگ تو بالکل بھی نہیں پہچان پاتے ہوں گے؟"

* "جی بالکل..... بس میرے دوست یار، میرے جاننے والے ہی مجھے جانتے ہیں۔ عام لوگ اگر پہچان بھی لیں تو اظہار نہیں کرتے کہ اگر بندہ کوئی اور نکلا تو خوامخواہ شرمندگی ہوگی اور ویسے بھی دلچسپ بات بتاؤں کہ بہت سے لوگوں کو میرا اصلی نام نہیں معلوم زیادہ تر لوگ مجھے "ارمان" کے نام سے جانتے ہیں اور مزید دلچسپ بات یہ کہ اسٹیشن ڈائریکٹر کو بھی نہیں معلوم کہ میرا اصلی نام کیا ہے یہ میں ڈی.جی خان کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن یہاں پشاور میں، میں اپنا اصلی نام ہی استعمال کرتا ہوں۔"

☆ "کھیلوں سے لگاؤ ہے۔ کرکٹ ہاکی وغیرہ؟"

* "کرکٹ بہت زیادہ پسند ہے، ہاکی کبھی نہیں کھیلی، فٹ بال کی وجہ سے میرے ایک دوست کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس لیے یہ کھیل بھی نہیں کھیلتا..... ہاں کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل ہے اور ہر صورت میں دیکھتا ہوں۔ خواہ پیپر ہو یا کوئی اور بھی کام ہو۔"

☆ "خود کبھی کھیلے آپ یا بچپن میں کیا بننے کی خواہش تھی؟"

* "جب میں چھٹی کلاس میں تھا تو وہ دور ایسا ہوتا ہے جب کچھ نہ کچھ بننے کی خواہش ہوتی ہے اور مجھے یاد ہے میرے ابو ایک کتاب لے کر بیٹھے ہوئے تھے جس میں ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ اور جرنلسٹ کے بارے میں سب کچھ لکھا ہوا تھا تو میرے ابو نے کہا کہ آؤ میرے پاس بیٹھو اور بتاؤ کہ تم ان میں سے کیا بنو گے تو میں نے تھوڑا غور کیا اور پھر جرنلسٹ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ابو نے پوچھا کہ یہ کون ہوتے ہیں تو میں نے کہا کہ مجھے کیا پتا کہ یہ کون ہوتے ہیں میں نے تو ایسے ہی ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تو بچپن میں تو کچھ عقل نہیں ہوتی انسان کو بڑے ہونے پر سب کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"

☆ "تو پھر بڑے ہو کر سوچا کہ کیا بننا ہے؟"

* "جی بالکل..... ہماری فیملی میں زیادہ رجحان بزنس کی طرف ہے تو بس اس لیے میں نے ایم بی اے مارکیٹنگ میں کرنے کا سوچا باقی تو اللہ مالک ہے وہ جس طرف بھی لے جائے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے مدثر خٹک سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

مقابل ہے آئینہ

نسیم محمود الحسن

سوال ۔ آپ کا پورا نام؟ گھر والے پیارے سے کیا کہتے ہیں؟

جواب ۔ نسیم محمود الحسن، مانو بلی۔

سوال ۔ کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟

جواب ۔ آئینے نے کہا۔ تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا۔

سوال ۔ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟

جواب ۔ دوران تعلیم مسلسل محنت اور لوگوں کا تکلیف دہ رویہ۔

سوال ۔ آپ کے لیے محبت کیا ہے؟

جواب ۔ ایک خوب صورت جذبہ۔

سوال ۔ مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟

جواب ۔ اپنے ماں، باپ، ماں باپ (یعنی ساس، سسر) کو حج کروانا، اپنا گھر بنانا۔

سوال ۔ پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟

جواب ۔ آبادی میں اضافہ، مسرور اس بات پر ہوں کہ میرے شوہر اور میرا بڑا بیٹا اسلامی مہینے کے مطابق 12 ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ دوسرا بیٹا 21 اپریل کو پیدا ہوا۔ دونوں ہی میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش ہیں۔

سوال ۔ آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟

جواب ۔ توقع۔

سوال ۔ اپنے آپ کو بیان کریں؟

جواب ۔

گیلے کاغذ کی طرح زندگی تھہری اپنی
کوئی لکھتا بھی نہیں، کوئی جلاتا بھی نہیں

سوال ۔ کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟

جواب ۔ میں اتنی گناہ گار ہوں، کیا میرا رب مجھے معاف کر دے گا؟

سوال ۔ آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟

جواب ۔ اللہ..... اللہ کی وجہ سے میں بدلہ نہیں لیتی، اس لیے کمزور ہو جاتی ہوں اور اللہ پر سب کچھ چھوڑ کر طاقت ور بن جاتی ہوں کہ وہ ذات کبھی میرے ساتھ برا نہیں کرے گی۔

سوال ۔ آپ خوش گوار لمحے کیسے گزارتی ہیں؟

جواب ۔ ہوٹلنگ، شاپنگ کرکے، یعنی میاں کی جیب خالی کرکے۔

سوال ۔ آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟

جواب ۔ ہاتھ کی میل، اس لیے ہاتھ صاف کرتی رہتی ہوں۔

سوال ۔ گھر آپ کی نظر میں؟

جواب ۔ اولین ترجیح عورت کے لیے، مرد کے لیے آرام گاہ۔

سوال ۔ کیا آپ بھول جاتی ہیں یا معاف کر دیتی ہیں؟

جواب ۔ بدلہ نہیں لیتی معاف کر دیتی ہوں، لیکن بھول بھی نہیں پاتی۔

سوال ۔اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟
جواب ۔
میری کشتی کو طوفاں کے حوالے کر کے
دیکھا تماشا ساحل پہ لوگوں نے
سوال ۔کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟
جواب ۔کامیابی مزید بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔
سوال ۔سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا۔یا واقعی یہ ترقی ہے؟
جواب ۔کاہل، بے بس اور لاچار (بجلی ہوگی تو ترقی ہوگی نہ)
سوال ۔کوئی عجب خواہش یا خواب؟
جواب ۔ہمارے ملک میں سب اچھا ہو جائے۔
سوال ۔برکھارت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟
جواب ۔بارش میں نہا کر، لانگ ڈرائیو پر جا کر، پیزا کھا کر۔
سوال ۔آپ جو ہیں وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟
جواب ۔اب بھی ماں ہوں، تب بھی ماں ہوتی۔
سوال ۔آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب..........؟
جواب ۔اللہ کے گھر جا کر۔اللہ کو یاد کر کے۔
سوال ۔آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟
جواب ۔تعلیم یافتہ ہونا، حافظ ہونا۔
سوال ۔کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب کچھ پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟
جواب ۔الحمد للہ.....اللہ نے میری اوقات سے بڑھ کر مجھے نوازا ہے۔

سوال ۔اپنی ایک خوبی یا خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟
جواب ۔خوبی یہ کہ میں بدلہ نہیں لیتی، خامی یہ کہ چاہنے کے باوجود تلخ یادیں نہیں بھول پاتی۔
سوال ۔کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟
جواب ۔چاہتے ہوئے بھی والدین کا حق ادا نہ کرنا۔
سوال ۔کیا مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟
جواب ۔انجوائے کرتی ہوں اول آنے کی کوشش کرتی ہوں۔(لیکن آتی نہیں ہوں)
سوال ۔متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟
جواب ۔پیر کامل، عمیرہ احمد، ماں۔
سوال ۔آپ کا غرور؟
جواب ۔میرا شوہر، میرے بچے۔
سوال ۔کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہے؟
جواب ۔مری شادی۔
سوال ۔کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟
جواب ۔کبھی کسی سے حسد نہیں کیا۔
سوال ۔مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟
جواب ۔دل کی تسکین، روح کا سکون۔
سوال ۔آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے، جو آپ اپنے علم، تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟
جواب ۔زندگی میں بے بسی کا مقام آجائے تو ان میں سے کچھ بھی کام نہیں آتا۔
سوال ۔آپ کی پسندیدہ شخصیت؟
جواب ۔نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم۔
سوال ۔ہمارا پیارا پاکستان سارا کا سارا خوب صورت ہے، آپ کا کوئی پسندیدہ مقام؟
جواب ۔لاہور فوڈ اسٹریٹ، مری۔

مجھ سے ملیے

نازیہ جمال نیّر

اِدارہ

1 "تاریخ پیدائش' اسٹار؟"

○ "14 اگست' وطن عزیز اور اپنی برتھ ڈے دھوم دھام سے مناتی ہوں۔ اسٹار میرا لیو ہے۔"

2 "خدا سے تعلق؟"

○ "بہت مضبوط' میں نے خالق ارض سموات کی اتنی عبادت نہیں کی' جتنا اس کی ذات کو سوچا ہے' کھوجا ہے۔"

3 "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"

○ "پرانے ڈائجسٹوں میں اپنی فیورٹ رائٹرز کو پھر سے پڑھنا۔"

4 "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"

○ "مقابل کا لب و لہجہ اور انداز گفتگو۔"

5 "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"

○ "جب اگلا بندہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا ہو۔"

6 "مشکل ترین لمحہ؟"

○ "جب میری امی پہ فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کا چہرہ بہت متاثر ہوا تھا۔ کھانا پینا' ہنسا بولنا حتی کہ زبان کو حرکت دینے سے بھی قاصر تھیں۔ بہت مشکل وقت تھا وہ ہمارے لیے۔ رو رو کر خدا کے حضور ان کی صحت یابی کی دعائیں مانگیں اور یہ دعائیں مستجاب ٹھہریں۔ بھی آج ہماری امی بفضل خدا صحت یاب ہو چکی ہیں۔"

7 "بہترین تعریف جو وصول کی؟"

○ "بہت سی ہیں۔ ہاں جب کوئی میرے خلوص اور ہمدرد نیچر کو سراہتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔"

8 "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"

○ "موبائل پہ فضول میسجنگ اور فیس بک۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان خرافات سے دور ہوں۔"

9 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

○ "کوئی اچھی سی کتاب۔"

10 "ایسی تاریخی شخصیت جس سے میں ملنا چاہوں؟"

○ "حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہہ۔"

11 "پسندیدہ ساتھی؟"

○ "کتاب۔"

12 "پسندیدہ ہستی؟"

○ "فخر موجودات' باعث تخلیق کائنات حضرت محمدؐ' محمد علی جناح اور بقید حیات ہستیوں میں مجھے اپنے نانا جان بہت پسند ہیں۔ حاجی خدا بخش سرابہ۔۔۔۔"

"جی الانا" اپنے مضمون The Liberator میں قائداعظم محمد علی جناح کے عزم' حوصلے اور جہد مسلسل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" He Drained away the last reserves of his energy like a spend thrift child of nature"

(انہوں نے فطرت کے فضول خرچ بچے کی طرح اپنی توانائی کے جمع شدہ ذخیرے کے آخری قطرے کو بھی خرچ کردیا۔)

انہی الفاظ کا اطلاق میں اپنے نانا جی پر بھی کرتی ہوں۔ میرے نانا ہو بہو قائداعظم کی تصویر ہیں۔ کمزور بیضوی چہرہ' بڑی بڑی روشن آنکھیں دبلا پتلا مگر بے حد مضبوط سراپا۔ ان کی زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت ہے۔ صبر و ایثار کا مرقع' صدق و صفا کی تصویر اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے چشمہ شفقت سے جی بھر کر سیراب ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں صحت و سلامتی عطا فرمائے۔ آمین۔"

13 "پسندیدہ پروفیشن؟"

○ "ٹیچنگ' میں گزشتہ آٹھ سالوں سے پڑھا رہی ہوں۔"

14 "بہترین کاوش؟"

○ "بات اک بوند سی' پیاسی شاموں کے بھید۔"

15 "پسندیدہ ملکیت؟"

○ "میری فیملی۔"

16 "زندگی کی خواہش؟"

○ "ہزاروں خواہشیں ایسی۔۔۔۔"

بہت سی ہیں۔ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ کرن کے لیے بہت اچھا لکھنا چاہتی ہوں۔ نبیلہ عزیز کو ایس ایم ایس کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میرے پاس ان کا نمبر نہیں ہے۔"

17 "پریشان کن لمحہ؟"

○ "جب امی کو پریشان دیکھتی ہوں تو پریشان ہو جاتی ہوں۔"

18 "جب موڈ آف ہوتا ہے تو کیا کرتی ہوں؟"

○ "بس منہ بند کیے کوئی اکیلا کونا تلاش کرکے بیٹھ جاتی ہوں۔"

19 "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں۔"

○ "میرے ابو جی۔۔۔۔ وہ بہت تیز مزاج انسان ہیں۔ میں تو کیا اکثر لوگ ان کے سامنے زیادہ بولنے' کھڑے ہونے سے کتراتے ہیں' بالخصوص ان کے غصے کے وقت۔"

20 "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"

○ "جب اخلاقی و مذہبی حدود و قیود کی نفی کرنے لگے۔"

21 "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"

○ "میرا تو دل اس وقت ٹوٹتا ہے جب کوئی میرے خلوص کی قدر نہ کرے۔ میری محبت کو غلط معنوں میں لے۔"

22 "کیا چیز جذباتی کردیتی ہے؟"

○ "اپنے مذہب اور وطن سے متعلق ہر بات مجھے جذباتی کردیتی ہے۔"

23 "زندگی کا یادگار دن؟"

○ "ابھی وہ دن آیا نہیں۔ یقیناً" وہ دن یادگار رہے گا جب میری بہنیں اپنے گھروں کو وداع ہوں گی۔"

24 "موسیقی میرے نزدیک؟"

○ "موڈ کو خوشگوار بنانے کا فارمولہ۔"

25 "پسندیدہ گانا؟"

○ "موڈ پہ منحصر ہے۔ ویسے آج کل عاطف اسلم کا بخدا تم ہی ہو کبھی کبھی گنگنا لیتی ہوں۔"

26 "پسندیدہ فقرہ؟"

○ "مجھے ان لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔"

27 "پسندیدہ کردار؟"

○ "آج کل "دردل" کا "دلاور شاہ" بہت پسند آرہا ہے۔"

28 "سب سے قیمتی اور عزیز اثاثہ؟"

○ "میری امی کی پیار بھری ڈانٹ' تینوں بھائیوں سے ــــــ' ان کی عمر کے حساب سے باتیں کرکے خوب قہقہے لگانا اور بہنوں کے ساتھ رات کے کھانے کے بعد واک۔"

29 "اچھا اور خوب صورت موسم؟"

○ "بہار۔۔۔۔ جب ہمارے گھر کے سارے کیکر اور دھریک کے درخت پھلیوں اور زرد پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔"

30 "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"

○ "بالکل بچوں کے سے انداز میں خوشی کا اظہار کیا تھا۔ خوب اونچا اونچا ہنستے ہوئے۔ آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں کے ساتھ بار بار اپنی تحریر پڑھی تھی۔"

31 "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"

○ "19مارچ کی رات، جب ہمیں اپنی بہت پیاری دادی جان کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ وہ ساری رات ہم نے جاگ کر روتے ہوئے گزاری تھی۔"

32 "میرا خواب؟"

○ "سچی اور پکی مسلمان بن جاؤں۔"

33 "پسندیدہ مزاح؟"

○ "ثمرہ بخاری اور فائزہ افتخار اتنا بہترین مزاح لکھتی ہیں کہ ان کے سامنے مجھے ڈاکٹر یونس بٹ کی کامیڈی بھی ایویں لگنے لگتی ہے۔"

34 "حسد محسوس کرتی ہوں؟"

○ "کبھی نہیں، البتہ رشک ضرور محسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جن میں صبر و تحمل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔"

35 "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"

○ "خوشبو اس لیے پسند ہے کہ دل و دماغ پہ خوشگوار اثرات مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ موڈ پہ بھی اچھا اثر ڈالتی ہے۔"

36 "پسندیدہ خوشبو؟"

○ "مٹی کی۔۔۔
بارشوں سے نہیں مہکتا کبھی
مجھے پکا آنگن نہیں چاہیے۔"

37 "آخری کتاب جو میں نے پڑھی؟"

○ "جاوید ہاشمی کی تختہ دار کے سائے تلے۔"

38 "پسندیدہ جگہ؟"

○ "میرا اپنا گھر۔"

39 "میری قوت ارادی؟"

○ "بہت مضبوط ہے۔ جس کام کی ٹھان لوں، کر کے ہی دم لیتی ہوں۔"

40 "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"

○ "ہم سب بہنوں اور امی کا مشترکہ کمرہ۔ جہاں ہم مل کر بیٹھتے، پڑھتے، سوتے اور ٹی وی دیکھتے ہیں۔"

41 "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"

○ "شلوار قمیص۔ جو سادہ سلی ہو۔ مجھے ڈیزائننگ والے کپڑے خاص پسند نہیں۔"

42 "پسندیدہ رنگ؟"

○ "وائٹ اور بلو۔"

43 "پسندیدہ مصنف؟"

○ "کافی لمبی فہرست ہے۔ کرن کی ساری رائٹرز، نبیلہ عزیز، نایاب جیلانی، آمنہ ریاض، فوزیہ یاسمین، مہوش افتخار۔"

44 "پسندیدہ شاعر؟"

○ "فیض احمد فیض۔۔۔ افسوس اس شاعر زنداں کا ہمارے پاس ایک بھی ٹی وی ریکارڈ انٹرویو نہیں ہے۔"

45 "ویران جزیرے پہ پہلا کام کیا کریں گی؟"

○ "جزیرے کا کونا کونا پھر کر فطرت کے ان چھوٹے راز اکٹھے کر کے اپنے دامن میں چھپا لوں گی۔"

46 "اپنی بری عادت؟"

○ "دوسروں سے بہت زیادہ توقع رکھنا۔"

47 "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"

○ "ہمارا برآمدہ، جہاں میری امی ناشتا تیار کرتی ہیں اور ہم ساتوں بہن بھائی ایک ہی چٹائی پہ "تقریباً" ایک دوسرے کی گود میں گھس کر کھانا کھاتے ہیں۔"

48 "اگر مصنفہ نہ ہوتی تو؟"

○ "اگر مصنفہ نہ ہوتی تو بھی ایک قاری ضرور ہوتی۔ یہ تو طے ہے کہ ادب کی کسی نہ کسی صنف سے خود کو گانٹھے رکھنا تھا۔"

49 "ایک لفظ جو مجھے واضح کردے؟"

○ "عاجزی۔"
"ہر ادنیٰ کو اعلا کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت۔"

50 "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"

○ "متضاد ہے۔ ہاں اگر احساس کمتری کا شکار نہ ہوں تو پھر متاثر ہونا بنتا ہے۔"

51 "محبت کے بارے میں خیال؟"

○ "انسان کو انسانیت کے درجے پہ فائز کرنے والا آفاقی جذبہ۔"

52 "پسندیدہ رشتہ؟"

○ "خالق اور مخلوق کا۔"

53 "پسندیدہ لو سٹوری؟"

○ "دل اک شہر جنوں۔ ولید و شہرینہ کی لو اسٹوری۔"

54 "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"

○ "ٹائی ٹینک۔"

55 "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"

○ "بہت کچھ میرا چہرہ تو سب کچھ اگل دیتا ہے۔ زبان کو کم ہی زحمت ملتی ہے۔"

56 "شاعری کے بارے میں خیال۔"

○ "جذبات و احساسات کو خوب صورت لفظوں کا پیرہن پہنانے کا نام شاعری ہے۔"

57 "میری جستجو، میری کھوج؟"

○ "کوئی ایسا منتر پڑھ کے پھونکوں کہ دنیا سے نفرت کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ ہر طرف امن، سکون کی ہریالی لہلہانے لگے۔"

58 "بہترین کامیابی؟"

○ "اس فانی جہان کی راحتیں، بہت عارضی ثابت ہو رہی ہیں۔ ہر مومن کی طرح اس دن میں بھی اپنے رب کی طرف سے یہی کامیابی کی نوید سننا چاہوں گی۔

"اے نفس مطمئنہ! پلٹ اپنے رب کی طرف وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔ داخل ہو جا میرے بندوں میں۔ پھر داخل ہو جنت میں۔"

59 "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"

○ "اپنے ذہن میں فوراً "کوئی مثبت سوچ لا کے۔"

60 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

○ "الیکٹرک سٹی۔"

61 "بدترین ایجاد؟"

○ "تباہ کن مہلک ہتھیار۔"

62 "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہو؟"

○ "میری دادی جان۔۔۔ وہ میری بہترین دوست ہمراز اور دمساز تھیں۔ میں ان کی بہت لاڈلی تھی۔"

63 "بستر پر کیا جانے والا آخری کام؟"

○ "کوئی کتاب یا ڈائجسٹ پڑھ کے قرآنی آیات کا ورد کرتی ہوں پھر سونے کی کوشش کرتی ہوں۔"

64 "ایک بات، جو ہمیشہ یاد رہی؟"

○ "یہ جو دن ہیں۔ ہم تمہارے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔"
"ہر گزرتے دن کے ساتھ اس فرمان الہیٰ پر میرا ایمان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔"

65 "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

○ "بہت سارے ہیں، جب چار بہنوں کے بعد فیصل جمال نے اس دنیا میں آکر آنکھ کھولی۔ کرن میں پہلی تحریر شائع ہوئی۔"

66 "قارئین کے لیے پیغام؟"

○ "اکثر ایک جملہ قارئین کی طرف سے پڑھنے کو ملتا ہے کہ ٹاپک پرانا ہے۔ بہت بار پڑھ چکے ہیں۔ مجھے بتائیں کیا انسان نے محبت کرنا چھوڑ دی؟ انسانی دل میں آج بھی حسد، رشک، ہمدردی اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے ایک صدی پہلے ہوا کرتے تھے۔ رشتوں کی ماہیت نہیں بدلی۔ محسوسات کو نئے قالب نہیں ملے۔

ایک ذہین اور باذوق قاری (جیسے انیقہ انا) کو میں ایک پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑے سپہ سالار سے تشبیہ دیتی ہوں جو بلند مقام پہ کھڑا نیچے دامن میں بر سرپیکار فوج کی سمتیں درست کرنے کی ہدایات جاری کرتا رہتا ہے۔

"تعریف جہاں ہم جیسے نو آموز لکھاریوں کے لیے آکسیجن کا کام دیتی ہے وہاں مثبت تنقید آئینے کا۔"

67 "کرن کے بارے میں رائے؟"

○ "کرن ایک ایسا پلیٹ فارم ہے، جس پہ میں نے خود شناسی کا مرحلہ سر انجام دیا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں میری ذات منعکس ہو کر خوبیوں و خامیوں سمیت روشن ہو کر میرے سامنے آگئی ہے۔ میرے بے ربط و بے ہیئت احساسات و جذبات کو لفظوں کی ایک پرسکون ندی میں بدل ڈالا۔ تھینک یو کرن۔"

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن' بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۸
اٹھائیسویں قسط

اور مر تو جیسے دل آور شاہ بھی گیا تھا۔ کیونکہ علیزے آفندی نے وہ بات کہہ ڈالی تھی۔ جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی جو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور جس کو سن کر وہ خود بھی دم بخود سا اس کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے دکھ' اذیت اور بے بسی کی انتہا کو چھوتی ہوئی ہچکیوں سے رو رہی تھی اور اس کے پورے جسم کے ساتھ ساتھ دل آور کے ہاتھ پہ اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی لرز رہی تھی اور اس کی ایسی حالت اور ایسی کیفیت دیکھ کر دل آور کی اپنی حالت اور کیفیت بھی عجیب سی ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ بھی جیسے اپنی جگہ پہ جوں کا توں ساکت سا رہ گیا تھا۔

"شادی۔۔۔؟" دل آور کے منہ سے نکلنے والا لفظ بھی جیسے بے یقین اور پریشان سا لگ رہا تھا۔

"ہاں شادی۔۔۔ ہپ۔۔۔ پلیز۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔ مجھ سے شادی کر لو۔ پھر۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے تمہارا ہر ستم اور ہر سزا قبول ہو گی۔۔۔ پھر۔۔۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ مجھے جان سے بھی مار دو گے۔۔۔ تو بھی میں اف نہیں کروں گی۔۔۔ بس۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔" علیزے کا لہجہ بکھر رہا تھا۔ آواز میں لرزش تھی اور الفاظ بے ربط سے ہو رہے تھے۔

"پلیز ڈرائیور! مجھے مارو۔۔۔ لیکن عزت کی موت مارو۔۔۔ یوں ذلت کی موت مت مارو۔۔۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے میری عزت' میری آبرو' مجھے واپس بخش دو۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔" علیزے نے ہچکیوں سے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور جواباً" دل آور کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے ٹرے میں جا گرا تھا۔

اس کے دو عالم لرز اٹھے تھے۔ وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے قدموں کے نیچے زمین پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی ہو اور وہ زمین کے اندر نیچے ہی نیچے دھنستا جا رہا ہو۔ کسی بھنور کی طرح چکراتی ہوئی زمین اسے اپنے بھنور کی لپیٹ میں لیتی۔ اپنی طرف ہی کھینچے جا رہی تھی اور اسے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی حل بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایسا ششدر ہوا تھا کہ کچھ کہہ ہی نہیں پا رہا تھا اور وہ تھی کہ تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی اپنی ذات کی قبولیت کی بھیک مانگ رہی تھی۔

"ڈرائیور۔۔۔! میں۔۔۔ میں تمہارا ہر ظلم سہہ لوں گی۔۔۔ ہر جبر برداشت کر لوں گی۔۔۔ بس مجھے دین و دنیا کی نظر میں سرخرو کر دو۔۔۔ مجھے بچا لو سب کی نظروں اور سوالوں سے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ میں مر جاؤں گی ڈرائیور۔۔۔ مر جاؤں گی۔۔۔ خدا کے لیے ڈرائیور۔۔۔ مجھے چھپا لو۔۔۔ سب سے چھپا لو۔۔۔ پلیز ڈرائیور۔۔۔ مجھے چادر دے دو۔۔۔ مجھے ڈھانپ دو۔۔۔ میں ننگے سر کھڑی ہوں۔۔۔ میری عزت رکھ لو۔۔۔ نکاح کر لو مجھ سے۔" وہ روتے ہوئے اس قدر تڑپ رہی تھی کہ اگر اس لمحے وہ دل آور شاہ سے اس کی عمر بھر کی کمائی' اس کی تمام جمع پونجی اور اس کے گھر بار سمیت اس کی جان بھی مانگتی تو وہ یقیناً" دے دیتا۔

لیکن اس لمحے جو کچھ وہ اس سے مانگ رہی تھی وہ دینا تو دل آور شاہ کے لیے جان دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی عاجز اور بے بس سوالی کا سوال سن کر دل آور شاہ کی مٹھی میں اسے دینے کے لیے خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس "کچھ نہیں" کا احساس ہوتے ہی دل آور شاہ کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات بھی ایک دم منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔ جس کے باعث اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنا رو رہی ہے؟ کتنا تڑپ رہی ہے؟ اور کتنا گڑگڑا رہی ہے؟ وہ اسی جامد کیفیت' احساسات اور دل و دماغ کے ساتھ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور قدم واپسی کے لیے موڑے۔ اور علیزے اس کی خاموشی اور اس کے قدموں کی واپسی پہ یوں تڑپی تھی کہ جیسے دل آور شاہ نے چپ چاپ قدم واپس نہیں موڑے تھے بلکہ اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور وہ اس شہ رگ کے کاٹے جانے کے درد سے بلبلا کر اک جھٹکے سے زمین سے اٹھی اور تیزی سے اک سائیڈ سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے اس کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔

"نہیں ڈرائیور۔۔۔ اس طرح نہیں۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔۔۔ تمہیں کچھ تو کہنا ہو گا۔۔۔ تمہیں کچھ تو کرنا ہو گا۔۔۔ تم مجھ پہ ظلم کرنا چاہتے ہو نا؟ تو کرو' جتنا مرضی ظلم کرو' جتنا تمہارا دل چاہتا ہے' اتنا کرو' مگر خدا کے واسطے مجھے ٹھکراؤ مت۔ کیونکہ تم نے اگر مجھے ٹھوکر ماری تو میرا کہیں بھی کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔۔۔ میں۔۔۔ میں دو جہان سے ٹھکرا دی جاؤں گی۔۔۔ پلیز ڈرائیور۔۔۔ پلیز۔۔۔!" اس نے بے تحاشا روتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل آور شاہ کے قدم ایک بار پھر زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ علیزے کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے اور جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر سر جھکانے پہ مجبور ہو گیا تھا اور علیزے اس کے سر جھکانے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ سر انکار میں جھکا ہے اقرار میں نہیں اور اس کے جھکے ہوئے سر نے علیزے کو اور بھی تڑپا دیا تھا جبکہ دل آور نے اس کے سامنے سے ہٹ کر وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔

مگر اب کی بار اس کے قدم زمین نے نہیں بلکہ کسی اور نے جکڑ لیے تھے اور دل آور شاہ اپنی جگہ پہ جم کے رہ گیا تھا اس کے عرش اور فرش کانپ گئے تھے اس کی پوری ہستی لرز اٹھی تھی وہ بری طرح دہل گیا تھا آخر بڑی حویلی کی عزت اور آن وقار آفندی کی بیٹی اس کے قدموں میں جھک گئی تھی اس نے اپنے ہاتھ اس کے پیروں پہ رکھ دیے تھے تو گویا اس نے آج اپنی انا' اپنا غرور اور اپنی ذات دل آور شاہ کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ تو گویا اب اس کے پاس باقی کچھ بھی نہیں رہا تھا؟ وہ خالی ہو چکی تھی۔۔۔ ہار چکی تھی۔۔۔ اور لٹا چکی تھی۔۔۔ سب کچھ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا۔

لوگ محبت یا نفرت کی جنگ میں دل ہارتے تھے لیکن وہ اپنا آپ ہار گئی تھی اپنی انا' اپنا غرور' اپنی ذات ہار گئی تھی' صرف اور صرف اپنی عزت کی خاطر اس نے سب کچھ ہار دیا تھا۔ وہ بے بس اور پسپا ہو چکی تھی اور اس کی اسی بے بسی اور پسپائی کا خیال آتے ہی اس کے ہاتھوں کا لمس دل آور کو پیروں پہ کسی کرنٹ کی طرح محسوس ہوا تھا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے۔ مگر علیزے پھر بھی اس کے پاؤں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

وہ اپنے اس عمل کے دوران کس پل صراط پر سے گزر رہی تھی؟ دل آور شاہ اس چیز کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا' مگر وہ اس کے اس عمل کے دوران کس پل صراط پر سے گزر رہا ہے؟ علیزے آفندی اس چیز کا کبھی بھی اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ علیزے کی حالت سے باخبر تھا جبکہ علیزے اس کی کیفیت سے بے خبر تھی وہ بس تڑپے جا رہی تھی اور تڑپائے جا رہی تھی۔

"پلیز ڈرائیور۔۔۔ آج۔۔۔ آج جو جی چاہے کرو۔۔۔ مگر پلیز انکار مت کرو۔۔۔ آج تم مجھے عزت دو گے' تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے پہ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہو گا تم میری عزت اور میرے بابا کا عیب ڈھانپ دو خدا کے لیے تمہیں ڈھانپ دو اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا پلیز ڈرائیور' مجھ سے نکاح کر لو۔" دل آور کے کانوں میں جیسے سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی اور دل پہ جیسے اک لرزا سا طاری ہو گیا تھا۔

اس کی ایسی حالت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب اس کی اماں اس کے بابا کی لاش چارپائی پہ گھر آتے دیکھ کر تڑپی تھیں دیوانہ وار بھاگی تھیں روئی تھیں کرلائی تھیں اور دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اس کے بابا کی لاش سے لپٹ گئی تھیں اور اس قیامت خیز منظر نے دل آور شاہ کی معصومیت اور بچپن کو مار کر اسے اتنا سخت اور سفاک بنا دیا تھا کہ وہ آج اس مقام کو پہنچ گیا تھا کہ جہاں ایک عورت اس کے قدموں میں جھکی اس سے عزت و آبرو کی بھیک مانگ رہی تھی اور وہ اسے یہ عزت اور ابرو دینے سے قاصر تھا۔

کیونکہ علیزے کو دینے کے لیے اس کے پاس دکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اس کے معاملے میں اس سے

زیادہ بے بس اور لاچار تھا کیونکہ اس کی اماں کا درد اور بابا کی لاش اسے اپنے عزم اور ارادوں سے پیچھے نہیں ہٹنے دیتے تھے کیونکہ یہ بائیس سالہ عزم اور ارادے اس کے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ سوئے تھے اس کے ساتھ جاگے تھے۔ اس کی زندگی کا حصہ تھے وہ دل آور شاہ کی ہڈیوں اور خون میں رچ بس چکے تھے اس کے دماغ میں لاوے کی طرح پکتے تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد اور اولین ترجیح ہی یہ عزم اور ارادے تھے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان سے پیچھے ہٹ جاتا؟ یا پھر اپنے قدموں سے اکھڑ جاتا؟

ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ انسان تھا اس کے سینے میں دل تھا اور دل میں ایک کونا ضمیر کا بھی تھا۔ جو اس وقت اس لڑکی کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا تھا اور اسے بھی کر رہا تھا اور دل آور شاہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح پتھر ثابت کرتا ہوا اس کی گرفت سے اپنے پاؤں کو آزاد کروا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔!" اور وہ وہیں فرش پہ بیٹھی ذلت، اذیت اور بے بسی کے احساس سے چیخ اٹھی تھی مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور باپ بیٹی کا یہ کھیل کافی دیر سے جاری تھا جس کو کھیلتے کھیلتے وہ بالآخر تھک گئے تھے اور وہیں لان چیئر پہ بیٹھ گئے تھے جبکہ وہ یوں ہی ان کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ لیکن اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ گھر سے باہر نکل آئی ہے اور کس راستے پہ کس طرف جا رہی ہے؟ وہ بس ہاتھوں سے ہوا میں راستے کی سمت ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور جس راستے پہ وہ آگے بڑھ رہی تھی وہ راستہ اونچائی کی طرف جا رہا تھا، اتنی اونچائی کی طرف کہ جس کو دیکھ کر ہی خوف آ جائے اور وہ تھی کہ دیکھ ہی نہیں رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں پہ تو پٹی بندھی ہوئی تھی اسے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا وہ تو بے خبری میں موت کے منہ میں جا رہی تھی۔

"پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ بولیں نا۔۔۔ کہاں ہیں آپ؟ آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ پلیز آپ سامنے آ جائیں نا۔۔۔ میں آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔" وہ اپنی دھن اور بے خبری میں انہیں پکارتی ایک بہت ہی اونچی پہاڑی کی طرف آ نکلی تھی جس کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف کھائی تھی ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور گہری کھائی اسے نگلنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور وہ ان سب سے انجان اپنے پاپا کو ہی پکار رہی تھی۔

"پاپا۔۔۔!" اب کی بار اس نے انتہائی زور سے پکارا تھا اور تھوڑی دیر سانس بحال کرنے کی غرض سے بیٹھنے والے وقار آفندی کے لیے یہ پکار دل دہلا دینے والی ثابت ہوئی تھی وہ یک دم گھبرا کے اٹھے تھے اور اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر آ گئے تھے وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے ان کے جسم سے جان ختم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ انہیں یاد تھا کہ علیزے کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔۔۔ اور اس کا نہ دیکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا اسی لیے وہ زیادہ بوکھلا رہے تھے۔

"پاپا۔۔۔!" علیزے کی پکار بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ بے ساختہ اس طرف کو بھاگے تھے جس طرف سے آواز آ رہی تھی اور وہ اس طرف آ ہی گئے تھے اور وہاں آ کر انہیں یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے جسم میں رہی سہی جان بھی کسی نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر نکال دی ہو اور وہ جہاں تھے وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ کیونکہ ان کے کلیجے کا ٹکڑا۔۔۔ ان کی زندگی۔۔۔ ان کا سرمایہ حیات۔۔۔ ان کی علیزے موت کے منہ میں کھڑی تھی اور وہ بس دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ بے بس اور لاچار کمزور اور عاجز۔۔۔ کچھ کرنے کی تو سکت ہی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اختیار تھا۔

"پاپا پلیز ہیلپ می۔۔۔ مجھ سے یہ۔۔۔ یہ پٹی نہیں کھل رہی۔۔۔ پاپا۔۔۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔۔۔ پلیز یہ کھول دیں پاپا۔۔۔ پلیز ہیلپ می۔" وہ سختی سے بندھی ہوئی پٹی کو کھولنے کی کوشش میں کبھی ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی اور کبھی پیچھے ہٹ رہی تھی۔۔۔ اور اس کی زندگی بس اسی ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے کے درمیان ڈول رہی تھی۔ اگر ذرا جو تیسرا قدم اٹھا لیتی تو یقیناً "موت کی آغوش میں پہنچ جاتی اور وقار آفندی اسے اسی تیسرے قدم سے باز رکھنا چاہتے تھے اسے پکارنا چاہتے تھے اسے بچانا چاہتے تھے مگر اچانک نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ان کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہیں پا رہے تھے اور کوشش کے باوجود بھی ان کے حلق سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اسے روکنے سے اور پکارنے سے قاصر تھے اور یہی سوچ کر وقار آفندی کی رگوں میں اک سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی اور پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ ان کے سامنے تھی لیکن وہ ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی بہت دور، بہت فاصلے پہ تھی اتنے فاصلے پہ جتنے فاصلے پہ زندگی سے موت تھی۔۔۔ یا تو لمحہ بھر کا فاصلہ۔۔۔ یا پھر عمر بھر کا فاصلہ۔۔۔! اور ادھر علیزے آفندی اپنی آنکھوں پہ بندھی پٹی سے الجھ رہی تھی اور بے بس ہو رہی تھی۔

"پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ پلیز کہاں گئے ہیں آپ؟" علیزے کی پریشان اور بھرائی ہوئی آواز انہیں یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن ان کی اپنی آواز اور قوت گویائی سلب ہو چکی تھی اور اس کشمکش اور پریشانی کے عالم میں انہوں نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار اور منہ زور جھونکا علیزے کے قدم اکھاڑ گیا تھا اور وہ اتنی نازک تھی کہ ہوا کے سرپھرے جھونکے سے ہی لڑکھڑا گئی تھی اور اس کا یہ لڑکھڑانا اسے موت سے قریب کر گیا تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ سیدھی ہزاروں فٹ نیچے گہری کھائی میں جا گری تھی اور اس کی دلخراش چیخیں پوری وادی میں گونج رہی تھیں۔

"پاپا۔۔۔!" اس کی آخری چیخ اور آخری پکار بھی یہی تھی اور وقار آفندی تھرا اٹھے تھے۔

"علیزے۔۔۔!" انہوں نے اپنی پوری قوت سے اسے پکارا تھا اور ان کی اس پکار سے بھی پوری وادی گونج اٹھی تھی۔ ان کی علیزے ان کی آنکھوں کے سامنے مر گئی تھی اور وہ اسے بچا بھی نہیں سکے تھے اور اسی خیال اور اسی درد کے ہاتھوں وہ سرتاپا پسینے میں شرابور ہو گئے تھے اور ان کا جسم مرغ بسمل کی مانند تڑپا تھا۔ جس کے باعث ان کے ساتھ بیڈ پہ سوئی آسیہ آفندی کی بھی آنکھ کھل گئی تھی انہوں نے فوراً" اٹھ کر لیمپ جلا دیے تھے۔

"وقار۔۔۔! کیا ہوا ہے آپ کو۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" آسیہ آفندی نے کافی تشویش سے پوچھا تھا کیونکہ ان کے جسم کو ہلکے ہلکے سے جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"وقار۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کی حالت تو بہت خراب لگ رہی ہے؟"

"ع۔۔۔ ع۔۔۔ لیز۔۔۔ ے۔۔۔ ع۔۔۔ عل۔۔۔ یے۔۔۔ علیزے۔!" ان کی فالج زدہ زبان سے بمشکل علیزے کا نام ادا ہوا تھا اور آسیہ آفندی ساکت و صامت سی رہ گئی تھیں۔

"علیزے۔۔۔؟" انہوں نے یہ نام زیر لب خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تھا۔ دو ماہ بعد ان کی مفلوج زبان نے پہلی بار حرکت کی بھی تھی تو علیزے کے نام پہ؟ وہ حیران نہ ہوتیں تو اور کیا ہوتا؟

یعنی ان کا لاچار، مفلوج اور بے بس جسم علیزے کے نام پہ اور علیزے کی تکلیف پہ اب بھی تڑپ اٹھتا تھا؟ تو اس کا مطلب تھا کہ ان کی یہ حالت علیزے کی "وجہ" سے نہیں بلکہ علیزے "کے لیے" ایسی ہو گئی تھی؟ انہیں بس علیزے کے دکھ کا دکھ تھا انہیں بس علیزے کی تکلیف کی تکلیف تھی وہ آج بھی اپنے درد پہ نہیں علیزے کے درد پہ تڑپتے تھے۔ جیسے اس وقت تڑپ رہے تھے اور رات کے اس پہر ان کی ایسی حالت اور ایسی تڑپ دیکھ کر آسیہ آفندی گھبرا گئی تھیں کیونکہ ان کی حالت رفتہ رفتہ مزید بگڑ رہی تھی۔

"ع۔۔۔ ع۔۔۔ علیز۔۔۔ ے۔۔۔ لیز۔۔۔ ے۔۔۔ ع۔۔۔ عل۔۔۔ لیز۔۔۔ زے۔" وہ بمشکل ہانپتی ہوئی سانسوں کے دوران لڑکھڑاتی زبان سے اس کا نام مکمل کر پا رہے تھے اور ان کا لہجہ جیسے بھیگ رہا تھا۔

"اس وقت علیزے آپ کو کیوں یاد آگئی؟ کیا آپ نے اسے خواب میں دیکھا ہے؟ کیا ہوا ہے اس کو؟" آسیہ آفندی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ جان گئی تھیں کہ ضرور انہوں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ سوال کہ "کیا ہوا ہے اس کو؟" انہیں دوبارہ سے کچھ دیر پہلے کے منظر کی یاد دلا گیا تھا اور وہ منظر پھر سے ان پہ لرزا ساطاری کر گیا تھا اور ان کی روح بھی کپکپا گئی تھی۔

"وقار... وقار! آپ پلیز سنبھالیں اپنے آپ کو... میں... میں ابھی دانیال کو بلاتی ہوں۔" آسیہ آفندی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ تیزی سے موبائل اٹھا کر دانیال کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھیں۔ عائشہ آفندی کی فیملی انیکسی میں رہتی تھی اور اپنے بیڈ روم سے نکل کر انیکسی تک جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا بھی کسی دوسرے گھر جانے اور آنے کے برابر لگتا تھا اور اس جانے اور آنے میں کافی ٹائم بھی لگ جاتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ فون کال کا سہارا لے لیتیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

"ہیلو...؟" دانیال کی آواز نیند کی وجہ سے کافی بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

"دانیال...! میں بات کر رہی ہوں تمہاری آنی... بیٹا... تمہارے ڈیڈ کی حالت بہت خراب ہے، تم جلدی پہنچو۔" آسیہ آفندی کا خود پہ اختیار نہیں رہا تھا اور وہ رو پڑی تھیں اور ان کے رونے کی آواز سن کر دانیال کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"پلیز آنی... آپ پریشان نہ ہوں... میں آ رہا ہوں۔" دانیال نے عجلت اور پریشانی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور پھر اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے پاس ان کے سامنے موجود تھا۔ لیکن وقار آفندی کی اس قدر بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اس نے فوراً "ان کو اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور مبارک خان کو کال کر کے گاڑی نکالنے کا کہا تھا البتہ ان کے شور کی آواز سن کر باقی سب بھی بیدار ہو چکے تھے اور پوری حویلی میں ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
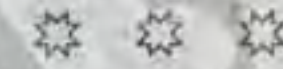
وہ رات تھی کہ کوئی پہاڑ؟ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے سرکنے کو تیار نہیں تھی اور اس پہاڑ نما رات میں دل آور شاہ کو اپنا آپ بھی کسی پہاڑ کی مانند ہی لگ رہا تھا۔ ایک ہی جگہ پہ ساکت، جامد، ٹھہرا ہوا... لیکن مٹی کا ڈھیر... دیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ... مگر اپنے لیے کچھ بھی نہیں، بے شک وہ پتھریلی چٹان کی مانند تھا لیکن اس کی بنیاد تو آخر مٹی ہی تھی نا؟ اگر ذرا سی کمزور پڑ جاتی تو پوری چٹان ڈھیر ہو جاتی اور اس چٹان کے ڈھیر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ زمین بوس ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ اس وقت اس مقام پہ تھا جہاں پہ نہ چٹان بن کے رہنا آسان تھا اور نہ ہی زمین بوس ہونا آسان تھا۔ بلکہ وہ تو اس وقت اس مقام پہ تھا جہاں پہ ہر قدم اور ہر فیصلہ ہی موت اور اذیت کا فیصلہ تھا اور یہ فیصلہ بہت مشکل تھا اتنا مشکل کہ دل آور شاہ جیسا بااختیار انسان بھی بے بسی کی سولی پہ لٹک گیا تھا اور کلیجے کے اندر نیزے کی انی گڑی رہ گئی تھی۔

وہ جب سے علیزے کے پاس سے اٹھ کے آیا تھا بس یوں ہی یک ٹک کھڑکی میں کھڑا گھر کی بیک سائیڈ میں بنے سوئمنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے شفاف پانی کے اوپر ہلکی ہلکی دھند اور غبار کی تہ چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ایسی ہی دھند اور غبار کی تہ دل آور شاہ کو اپنے دل پہ چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جس میں ایک چہرہ تھا جو کبھی چھپ رہا تھا اور کبھی ابھر رہا تھا کبھی اداس اور مایوس لگتا تھا اور کبھی خوش اور شاد نظر آتا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جس کے رخساروں پر دل آور کا دل بوسے دیتا تھا اور آنکھیں سجدہ کرتی تھیں... دل کے بوسے اور آنکھوں کے سجدے صرف اس چہرے کو ہی تو نصیب تھے اور دل آور کو وہ چہرہ ہی نصیب نہیں تھا۔

"زری...!" دل آور نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور دل میں سسکتا ہوا لفظ ایک کپکپاہٹ کی صورت ہونٹوں سے ادا ہوا تھا۔

"آج تم مجھے عزت دو گے، تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے پہ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہو گا تم میری عزت اور میرے بابا کا عیب ڈھانپ دو... خدا کے لیے ہمیں ڈھانپ دو۔ اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا... پلیز... ڈرائیور... مجھ سے نکاح کر لو... پلیز ڈرائیور... مجھ سے نکاح کر لو... پلیز ڈرائیور... مجھ سے نکاح کر لو۔" اس کے کانوں میں بس اس ایک جملے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی اور وہ تھک ہار کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کھڑکی کے قریب ہی رکھی راکنگ چیئر پہ بیٹھ گیا تھا۔

"علیزے...!" دل آور کو خود بھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کے ہونٹوں نے بے دھیانی میں علیزے کے نام کو چھوا ہے۔ بس اس کے ذہن میں تو سوچوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ تھا کہ اس سمندر میں پوری طرح سے ڈوبا ہوا تھا۔

"دیکھو شاہ...! زندگی میں ایسا کچھ مت کرنا کہ میں تمہیں کبھی معاف ہی نہ کر پاؤں... تم وقار آفندی کو بیچ چوراہے میں الٹا لٹکا کر گولی بھی مار دو گے تو مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہو گا لیکن اگر اس کی بیٹی کی عزت پہ ہاتھ ڈالو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکوں گی' آخر ایک مرد کا بھگتان عورت کیوں بھگتے؟ وقار آفندی کی سزا وقار آفندی کو ملنی چاہیے اس کی بیٹی کو نہیں' کیونکہ عورت محبت کی طرف سے ملنے والی چوٹ تو سہہ لیتی ہے لیکن عزت کی طرف سے ملنے والی چوٹ نہیں سہہ پاتی... ہمیشہ اس چوٹ سے بلبلاتی رہتی ہے اور یہ چوٹ اور بلبلانا تم نہیں جان سکتے۔" بتول شاہ کی تلخ سی آواز اس کی سماعتوں میں ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

"اماں...!" وہ بے ساختہ بے چینی سے کہتا ہوا دوبارہ راکنگ چیئر سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔

اور رات کے اس پہر دل آور کو گاڑی نکالتے دیکھ کر گلاب خان پریشان سا تیزی سے قریب آیا تھا۔

"صاحب...! آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟" اس نے پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

"ہوں... تم گیٹ کھولو۔" اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا اور گلاب خان اس کا موڈ دیکھتے ہوئے پلٹ کر گیٹ تک چلا گیا اور گیٹ کھول دیا تھا اور وہ اپنی گاڑی زناٹے سے نکال لے گیا تھا۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا اور وہ گھر سے نکل کر سڑکوں پہ آ گیا تھا۔ اس کے اندر ابال اٹھ رہے تھے وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور اسی بے کل اور مضطرب کیفیت کو ضبط کرتے کرتے اس نے اسٹیئرنگ پہ مکا دے مارا تھا۔

"میں دنیا کا بے بس ترین انسان ہوں... میں کبھی کچھ بھی نہیں کر پایا... کسی کو محبت نہیں دے سکا اور کسی کو عزت نہیں دے سکا بلکہ یہ سب تو دور کی بات ہے میں تو اپنی ماں کو اس کی محنت کا صلہ بھی نہیں دے سکا میں بہت بدقسمت انسان ہوں، مجھ سا بدقسمت دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا، کوئی بھی نہیں۔" وہ انتہائی رش ڈرائیو کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پہ اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں اور دل و دماغ میں ایک محشر برپا تھا اور ایسے عالم میں تو اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی گاڑی کا رخ کس طرف ہے؟

☼ ☼ ☼
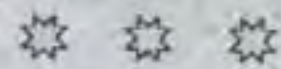
"شاہ... تم یہاں...؟ اس وقت؟"

صبح کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا اور وہ تیار ہو کر ناشتا کرنے کے لیے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں کہ

اچانک گھر کے مختصر سے کوریڈور کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے دل آور شاہ کو دیکھ کران کے رواں قدم سیڑھیوں پہ ہی رک گئے تھے۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کر ذرا سے توقف کے بعد ان کے قدموں میں پھر سے روانی آگئی تھی اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب رکی تھیں۔

"شاہ... تم بول کیوں نہیں رہے؟ کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہونا؟" بتول شاہ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں اماں! زندہ سلامت ہوں' آپ کے سامنے ہوں' آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟"

"شاہ...! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" انہوں نے اسے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اماں پلیز... آپ پریشان نہ ہوں' سب ٹھیک ہے' میں یہاں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں' آپ کو پریشان کرنے کے لیے نہیں آیا۔" دل آور نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پہ رکھے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"تم اس وقت اتنی دور سے مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو؟ مگر کیوں؟ خیریت؟" وہ بھی آخر دل آور کی ماں تھیں' اس کے جواب پہ مطمئن ہونے والی نہیں تھیں جیسے وہ خود نہیں ہوتا تھا۔

"یہاں آنے سے پہلے جو آخری خیال آیا وہ آپ کا تھا اور اس خیال کے ساتھ ساتھ میں بھی آپ کی طرف آگیا۔" وہ ان کے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھپکتے ہوئے بولا تھا اور بتول شاہ نے چونک کر خاصی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"پہلا خیال کس کا تھا؟" ان کا سوال مختصر اور دوٹوک تھا۔ جس پہ دل آور کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر ان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"تمہیں زری کے خیال آتے ہیں اور زری کو تمہارے خواب آتے ہیں تم یہ خواب و خیال کے سلسلے جوڑ کیوں نہیں دیتے؟" انہوں نے اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کافی مضبوط لہجے میں پوچھا تھا اور صوفے کی سمت بڑھتے دل آور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ گویا وہ پہلے خیال تک جا پہنچی تھیں؟

"کیونکہ مجھے اور بھی بہت سے خیال آتے ہیں۔" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"کیسے خیال؟" وہ عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

"بس کچھ دوستوں کے اور کچھ دشمنوں کے۔" اس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں' جبکہ بتول شاہ نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"دوستوں کا خیال آنا تو محبت کی علامت ہے مگر دشمنوں کا خیال آنا کس چیز کی علامت ہے؟" ان کا لہجہ قدرے تیکھا سا محسوس ہو رہا تھا۔

"انسانیت کی...!" دل آور کے اگلے جواب پہ وہ اور زیادہ چونکی تھیں۔

"تو کیا تمہاری انسانیت کو اس کا خیال آتا ہے جو انسان ہی نہیں ہے؟" بتول شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

"پلیز اماں! میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے وقار آفندی کا خیال آتا ہے؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"تو پھر...؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"مجھے اس کی بیٹی کا خیال آتا ہے۔" دل آور کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

"اس کی بیٹی کا؟" انہیں ایک اور جھٹکا لگا تھا۔

"ہاں...! اس کی بیٹی کا... علیزے کا؟" اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مگر کیوں؟" ان کے سوال کافی مختصر سے تھے اور لہجہ بھی بدل چکا تھا۔

"گزشتہ رات میں اسے کھانا دینے گیا تھا۔" وہ بتاتے ہوئے ٹھہر سا گیا تھا۔

"پھر...؟" انہوں نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

"پھر میں نے وہ سب دیکھا جو میرے پلان میں نہیں تھا۔" دل آور کہتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا اور بتول شاہ اس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

"وہ... وہ... میرے قدموں میں جھک گئی تھی۔" وہ بڑے کرب سے بتا رہا تھا اور بتول شاہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی اور سینے کے اندر سالوں سے رکھا پتھر بھی کانپ گیا تھا وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھے دل آور کو دیکھ کے رہ گئیں۔

"تم اپنی بتاؤ... تم جھکے یا نہیں؟" وہ اس کا جواب سننا چاہتی تھیں "میں کیسے جھک جاتا اماں؟ یہ... یہ... میرے جھکنے کا مقام نہیں ہے۔ یہاں دل آور شاہ جھکے تو بے غیرت کہلائے گا۔" وہ بے ساختہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"جس انسان نے جھکنا ہو۔ وہ "در" نہیں دیکھتا دل آور شاہ... چاہے وہ در زری کا ہو' چاہے علیزے کا... جب جھک ہی جانا ہے تو پھر یہ در کیا؟ اور وہ در کیا؟" وہ عجیب تلخ سے لہجے میں بولی تھیں۔

"مگر میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا اماں... ہرگز نہیں... مر بھی جاؤں تب بھی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"نکاح...؟" بتول شاہ نکاح کے لفظ پہ جیسے سناٹے میں آگئی تھیں۔

بے شک یہ انہی کا ظرف تھا کہ وہ اسے جھکنے کا کہہ رہی تھیں مگر نکاح کا لفظ سن کر ایک بار تو انہیں یوں لگا تھا کہ جیسے ان کے جسم اور ان کے دل پہ کسی نے جلتے دہکتے کوئلے انڈیل دیے ہوں اور ان کے جسم کے ساتھ ساتھ ان کے دل کے بھی پرخچے اڑ گئے ہوں اور وہ کھڑے کھڑے دھجیوں میں بکھر گئی تھیں ان کی ذات پہ سیاہ تاریکی کے سائے لہرا گئے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے کسی ہزاروں فٹ کی اونچائی سے پھینکے جانے والے شیشے کی ہوتی ہے۔ چکنا چور... ریزہ ریزہ... ٹکڑوں میں تقسیم۔

اور ان تقسیم شدہ ٹکڑوں کو دوبارہ جمع کر کے ایک شکل میں لانا انتہائی ناممکن سی بات تھی مگر وہ واقعی ایک مضبوط اور پتھریلی چٹان نما عورت تھیں وہ ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی ہمت اور حوصلہ رکھتی تھیں ان کی حالت شیشے کے ٹکڑوں جیسے تو ہو سکتی تھی مگر ان کی طاقت شیشے جیسی کمزور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہادر خاتون تھیں اور انہوں نے بہادر ہی رہنا تھا وہ اپنی زندگی کو ایک جنگ سمجھتی تھیں اور یہ جنگ انہوں نے اپنے آخری دم تک لڑنی تھی اور اس جنگ مسلسل کا انہوں نے کبھی اپنے رب سے شکوہ بھی نہیں کیا تھا اور وہ شکوہ و شکایت کرنے والوں میں سے تھیں بھی نہیں' بلکہ وہ تو صبر و شکر کرنے والوں میں سے تھیں... ورنہ انہوں نے آج تک اللہ نے جو انہیں دیا تھا اس پہ شکر کیا تھا اور جو ہوا تھا اس پہ صبر کیا تھا اور آج بھی ان کی آزمائش کی گھڑی تھی' آج پھر اللہ نے انہیں آزمایا تھا اور وہ آزمائش کا پیالہ پی گئی تھیں۔

"وقار آفندی مت بنو دل آور شاہ۔" بتول شاہ پیالہ پی چکی تھیں اور دل آور شاہ دم بخود سا رہ گیا تھا وہ اپنے سامنے کھڑی عورت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ واقعی ایک عورت ہیں یا پتھریلی چٹان؟ اتنا حوصلہ' اتنا ظرف اور اتنا صبر تو اس نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج اپنے سامنے کھڑی عورت میں دیکھ رہا تھا۔

"اماں...؟" دل آور کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا یہ لفظ بھی کپکپا رہا تھا کیونکہ وہ بے یقینی کی انتہا پہ تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں دل آور شاہ! وقار آفندی مت بنو' تمہاری رگوں میں دوڑتا بابر شاہ کا خون اور اس خون

میں بستی، بتول شاہ کی تربیت تمہیں کبھی بھی یہ اجازت نہیں دیتی کہ تم بے رحمی اور سفاکی کے راستے پہ چلو... یا پھر تم کسی وحشت یا درندگی کا مظاہرہ کرو، میں تمہیں ایک انسان دیکھنا چاہتی ہوں، حیوان نہیں۔" بتول شاہ کا لب و لہجہ اچھا خاصا بے لچک نظر آرہا تھا۔

"اماں... آپ... آپ... یہ سب کیا کہہ رہی ہیں؟" دل آور نے ان کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے انہیں دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا اور ان کے احساسات سے عاری اور سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، میں جو کہتی ہوں وہ ایک ہی بار کہتی ہوں اور مجھے بھی پتا ہے کہ تم ایک بار میں ہی سمجھ جاتے ہو۔" بتول شاہ قدموں سے اکھڑنے والی عورت نہیں تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی بات اور اپنے فیصلے پہ اٹل ثابت ہوتی تھیں۔ تب ہی تو دل آور کو سن کر اس قدر دھچکا لگا تھا کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ سب کرنا انتہائی مشکل، بلکہ ناممکن سی بات تھی۔ اسی لیے وہ آہستگی سے نفی میں سر ہلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"نہیں اماں... ! میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ آپ... آپ مجھے حکم دو کہ میں اپنا سر کاٹ کے آپ کے قدموں میں رکھ دوں، تو قسم ہے اس پاک ذات کی میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ لیکن... یہ... یہ سب نہیں کر سکتا۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر اس کو اس نوبت پہ پہنچانے والے بھی تو تم ہو... کہ وہ تمہارے قدموں میں جھکنے پہ مجبور ہو گئی ہے پہلے اس نے اپنے باپ کے کیے کا بھگتان بھگتا ہے اور اب تمہارے کیے کا بھگتان بھگتے گی... کیوں؟ کس لیے آخر؟ وہ عورت ہے اس لیے... یا پھر تم مرد ہو اس لیے؟ حالانکہ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تم ایسا کوئی کام مت کرنا کہ میں زندگی میں کبھی تمہیں معاف نہ کر پاؤں... مگر تم نے میری ایک نہیں سنی... تم نے تب بھی اپنی مرضی کی... اور تم آج بھی اپنی مرضی کر رہے ہو؟ کیا اس سب کے بعد بھی تم مجھ سے معافی کی توقع رکھو گے۔" وہ خاصے سخت لہجہ میں بولتے ہوئے دل آور کے چہرے کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

"مگر اماں... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ مجھے کبھی معاف ہی نہ کر پائیں... وہ جیسی تھی... ویسی ہی ہے... میں نے اس کے اور اپنے درمیان مرد اور عورت والی "ہوس و نفس" کو جگہ نہیں دی... وہ تو اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی۔" دل آور نے ماں کے سامنے گواہی دی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی، مگر یہ بات تم کس کس کو بتاؤ گے؟ اور کون کون اس بات کو مانے گا کہ وہ جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ یہ بات تو یا تم جانتے ہو یا پھر تمہارا خدا جانتا ہے... لیکن خدا کی خدائی نہیں جانتی... کیونکہ خدائی وہی کچھ جانتی ہے جو سامنے نظر آرہا ہوتا ہے... اب سامنے نظر آنے والی چیز کے پیچھے کیا ہے۔ یہ کوئی بھی جاننے کی زحمت نہیں کرتا۔" بتول شاہ نے انتہائی دکھ سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اماں... ! آپ کی ہر بات اور ہر حکم سر آنکھوں پہ... لیکن میں اس کے لیے بس اتنا کر سکتا ہوں کہ اسے واپس بڑی حویلی چھوڑ آؤں... اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا... میں مر تو سکتا ہوں... مگر وقار آفندی کی بیٹی کو بیوی نہیں بنا سکتا... چاہے میرے لیے اس دنیا میں رہ جانے والی وہ آخری لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔" دل آور کا لہجہ بتول شاہ سے بھی زیادہ سخت اور پتھریلا ہو رہا تھا۔

"اگر تم نے اسے واپس ہی چھوڑنا تھا تو لائے ہی کیوں تھے؟" وہ دونوں ماں، بیٹا ایک دوسرے کو دوبدو جواب دے رہے تھے۔

"میں وقار آفندی کو سزا دینے کے لیے اسے لایا تھا... اور وہ یہ سزا بھگت بھی رہا ہے... یہ دیکھیے... یہ میرا موبائل دیکھیے... اس میں وقار آفندی پہ دورہ پڑنے کی اطلاع ہے... جو اسے آج رات ہی پڑا ہے... اور وہ اس

وقت اسپتال میں ہے۔۔۔ یہ ہے اس کی سزا۔۔۔ عبرت ناک سزا۔۔۔ جب جب سوچے گا' مرے گا۔۔۔ اور میں اسے اسی طرح ماروں گا۔۔۔ تڑپا تڑپا کر۔۔۔ ورنہ میں چاہتا تو اسے گولی بھی مار سکتا تھا۔۔۔ اس کا ایکسیڈنٹ کروا کر اسے اپاہج بھی بنا سکتا تھا مگر اسے پھر بھی اتنی اذیت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جتنی اب پہنچ رہی ہے۔۔۔ صرف اس خیال سے اس سوچ سے کہ اس کی بیٹی دل آور شاہ کے پاس ہے۔۔۔ بابر شاہ کے بیٹے کے پاس۔۔۔

آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ میری طرف سے ملنے والی یہ سزا وقار آفندی کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔۔۔ اور رہی بات علیزے آفندی کی بے بسی کی' تو وہ میں ایک دو دن میں ختم کر دوں گا۔۔۔ واپس بھیج دوں گا اسے۔" اس نے کہتے ہوئے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور ان کے سامنے سے ہٹ کر باہر نکل گیا تھا اب اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا اور بتول شاہ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼
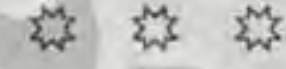
وہ گھر کیا آیا تھا کہ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی ماں بھی خوش تھی اور بہنیں بھی آگے پیچھے دوڑتی پھر رہی تھیں' ایک تو اس کی رہائی کی خوشی اور دوسری اس کی جاب کی خوشی نے انہیں اپنی ساری تکلیفیں بھلا ڈالی تھیں' اللہ نے واقعی انہیں صبر کا پھل دے دیا تھا اور وہ تب سے اب تک دل آور شاہ کے لیے دعائیں کر رہی تھیں جس نے ان غریبوں پہ اتنا بڑا احسان کیا تھا۔

"کیا بات ہے آخر۔۔۔؟ آج بڑی دل لگا کر تیاری کی جا رہی ہے؟ آپ نے آفس ہی جانا ہے یا کسی ڈیٹ کا پلان ہے؟" مریم اس کا کمرا صاف کرنے کی غرض سے دوبارہ اس کے کمرے میں آچکی تھی مگر وہ ابھی تک آئینے کے سامنے کھڑا تیار ہو رہا تھا جبھی تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل مسکراتا ہوا اس کی سمت پلٹا تھا۔

"اف یار۔۔۔ پہلی بار تو کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں اور آپ لوگوں کو پہلی بار ہی کھٹکنے لگا ہے؟" اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ مریم حیران رہ گئی تھی۔

"اوہ۔۔۔! تو آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو کھلی چھوٹ دے دیں؟ آپ پہ نظر بھی نہ رکھیں اور آپ ایک روز اچانک ہی ہماری بھرجائی گھر لے آئیں۔۔۔ وہ بھی ہمیں خبر کیے بغیر؟" مریم نے اسے بغور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر حیرت اور معنی خیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"یہ بھی خوش فہمی ہے تمہاری۔۔۔ ورنہ اچانک تمہاری بھرجائی کو گھر لے آنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ جتنا تم تصور کر رہی ہو۔۔۔ یہ کام امیر لوگوں کے ہیں۔۔۔ ہم غریب لوگوں کے نہیں۔۔۔ اچانک شادیاں وہی ارینج کر سکتے ہیں۔" عدیل نے کندھے اچکائے تھے اور چارپائی کے پائے پہ پاؤں رکھ کے ذرا سا جھکتے ہوئے جوتوں کے تسمے باندھنے لگا تھا۔

"ایسی کرم نوازیاں اللہ کبھی کبھی غریبوں پہ بھی کر دیتا ہے۔۔۔ بس مایوس نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ اس کا کرم کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔" مریم کہتے ہوئے اس کے کپڑے اور جوتے وغیرہ اٹھا کر سمیٹنے لگی تھی لیکن ابھی عدیل نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ باہر دروازے پہ دستک ہونے لگی تھی اور عدیل جلدی جلدی تسمے باندھ کے سیدھا ہو گیا تھا۔

"ارے آج صبح صبح کون آگیا؟" وہ برآمدے میں لگے وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے باہر دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

"کون۔۔۔؟" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے یوں ہی پوچھا تھا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھول دیا تھا مگر دروازہ کھول دینے کے بعد وہ حیران پریشان اور بے یقین سا دیکھتا رہ گیا تھا اس کے سامنے مدحیہ حیات کھڑی تھی اور وہ حیرت زدہ

سا کھڑا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔!" مدحیہ نے اس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وعلیکم السلام۔" وہ بمشکل اپنی حیرت اور پریشانی کے گھیرے سے باہر آتے ہوئے متوجہ ہوا تھا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" اس نے خود ہی اندر آنے کے لیے اجازت مانگی تھی اور عدیل اپنی بدحواسی اور کوتاہی پہ خود کو سرزنش کرتا ہوا سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"ایم سوری۔۔۔ آیئے آپ اندر آیئے۔" اس نے اسے راستہ دیا تھا اور مدحیہ اندر آگئی تھی حالانکہ اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور وہ اندر سے جھجک بھی رہی تھی آخر وہ عدیل عمر کے گھر پہلی بار آئی تھی' جس پہ عدیل کی بھی حالت ایسی ہی تھی جیسی اس کی ہو رہی تھی۔

"ارے مدحیہ آپ۔۔۔؟" مریم عدیل کے کمرے سے نکلتے ہوئے مدحیہ کو دیکھ کر بے ساختہ چہکی تھی اور لپک کے اس کے قریب آئی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیسی ہیں آپ۔" مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے اس کی سمت ہاتھ بڑھایا تھا جبکہ مریم اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی تھی۔

"رشتہ قریب کا ہو تو قریب سے ملنا چاہیے۔۔۔ اس طرح دور سے نہیں۔" مریم نے ذو معنی لہجے میں کہتے ہوئے عدیل اور مدحیہ دونوں کو کن انکھیوں سے دیکھا تھا اور عدیل بال کھجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔ باہر آئیں۔۔۔ دیکھیں کون آیا ہے؟" مریم نے عابدہ خاتون کو آواز دی تھی اور وہ فاروق نیازی کے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں مگر مریم اور عدیل کے ساتھ کھڑی جینز اور لیڈیز کوٹ میں ملبوس انتہائی ماڈرن سی لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

"السلام علیکم۔" مدحیہ نے ہی سب کو سلام کرنے میں پہل کی تھی۔

"امی۔۔۔ یہ دل آور شاہ کی بہن ہیں۔۔۔ مدحیہ حیات' جب ابا جی کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو یہی ہمیں اپنی گاڑی میں اسپتال لے کر گئی تھیں۔" مریم نے اس کا تعارف کروایا تھا اور عابدہ خاتون کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی' انہوں نے مدحیہ سے ملنے سے پہلے اک نظر عدیل کی سمت بھی دیکھا تھا وہ ان کی اک نظر سے ہی خجل سا ہو گیا تھا کیونکہ عابدہ خاتون اسے اک نظر میں ہی "ستائش اور ماشاءاللہ" کا احساس دلا چکی تھیں۔

"آؤ بیٹا۔۔۔ اندر آجاؤ۔۔۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟" وہ اسے اپنے ساتھ لیے فاروق نیازی کے کمرے میں آگئی تھیں دراصل وہ اسے فاروق نیازی سے ملوانا چاہتی تھیں۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا بھائی صاحب؟" مریم نے ان کے اندر جانے کے بعد عدیل کو چھیڑا تھا اور عدیل بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"ارے یار۔۔ میں نے واقعی آفس جانا ہے' میرا کوئی پلان نہیں ہے۔"

"آپ کا نہ ہو' ان کا تو ہے نا؟ اور ویسے بھی اب آپ نے آفس کیا جانا ہے بھلا؟ اب تو وہ متھے لگ چکی ہیں وہ بھی پہلے ہی روز۔" مریم نے آج پورا پورا ارادہ باندھ رکھا تھا اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا جس پہ عدیل بار بار ہنس رہا تھا اور انجوائے کر رہا تھا۔

"ارے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ متھے لگنا میری قسمت ہی سنوار دے؟" عدیل نے اپنے فائدے کا پہلو تلاش کیا تھا جس کو سن کر مریم بھی اس کی چالاکی اور ذہانت پہ ہنس پڑی تھی۔

"صبح صبح دیدار ہو گیا ہے' قسمت تو آپ کی ویسے ہی سنور گئی ہے۔" مریم نے پھر چھیڑنے والے انداز میں دیکھا

تھا۔

"آہاں... اتنے دنوں بعد ہوا ہے یہ دیدار بھی..." عدیل نے جیسے آہ بھری تھی۔

"بھائی...!" مریم نے حیرت سے چلا کے پکارا تھا۔

"چھوڑو یار... اندر جاؤ... وہ امی اور ابا جی کے پاس اکیلی ہوگی۔" عدیل نے اسے اندر بھیجا تھا۔

"اور آپ...؟" مریم نے جاتے جاتے اسے دیکھا۔

"میں بھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ لیکن ابھی اسے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مریم، مدحیہ کو لے کر اس کے پیچھے ہی آگئی تھی۔

"آپ یہاں بیٹھیں... بھائی سے بات کریں... میں تب تک چائے بنا کر لاتی ہوں۔" مریم اسے چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

مدحیہ کمرے کی تنہائی میں نروس سی ہوگئی تھی اور اس کا یہ نروس سا انداز عدیل کی خواہشوں کو کروٹیں بدلنے پہ مجبور کر گیا تھا اس کا دل اس خواہش پہ تو کچھ زیادہ ہی مچلا تھا کہ وہ اسے کندھوں سے تھام کے اپنے بے حد قریب کرلے... مگر خواہش تو آخر خواہش ہی ہوتی ہے نا؟ پوری ہو جائے ضروری تو نہیں... سو مجبوراً" ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنی اس ——— خواہش کو دبا کر خود پہ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔

"بیٹھیے...!" عدیل نے اسے کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر وہ بڑے اہتمام سے کرسی پہ بیٹھنے کی بجائے عدیل کے بستر پہ ہی بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد وہ خود کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ عین اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

"کیا آج بھی آپ میرے ابا جی کی خیریت ہی پوچھنے کے لیے آئی ہیں؟" اس نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے والا سوال کیا تھا۔

"آف کورس... اور کس لیے آنا تھا میں نے؟" لیکن اس بار مدحیہ نے بھی اپنے مزاج کے مطابق جواب دیا تھا کیونکہ جس طرح ڈٹ کے وہ اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے مزید نروس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس ارادے کو ارادہ ہی رہنے دیتی۔

"ریئلی..." عدیل نے اور زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

"اینی ڈاؤٹ...؟" مدحیہ نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی جیسے مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں... ڈاؤٹ تو ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"کیا؟" مدحیہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔" عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب...؟ کیا سمجھ رہے تھے آپ..." مدحیہ ناسمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہی کہ آپ خیریت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ خیریت دیکھنے کے لیے آئی ہیں۔" عدیل نے دیکھنے پہ زور دیا تھا اور مدحیہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اپنی مسکراہٹ روکنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ آخر وہ ٹھیک ہی تو سمجھا تھا وہ اسے دیکھنے ہی تو آئی تھی... کیونکہ اتنے دنوں سے دیکھا جو نہیں تھا۔

"اوہ... تو یعنی میں ٹھیک ہی سمجھا تھا؟" عدیل اس کی مسکراہٹ سے باغ و بہار ہوگیا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ آپ ٹھیک ہی سمجھے تھے؟" مدحیہ اب اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔

"آپ کے چہرے کے اک اک نقش نے... آپ کی آنکھوں نے... آپ کے ہونٹوں نے... آپ کی

مسکراہٹ نے..." عدیل نے وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے دریچے میں بھی جھانکا تھا جہاں آج بھی عدیل کو اپنا آپ ہی بسا ہوا نظر آیا تھا۔

"غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے آپ کی؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"اگر یہ غلط فہمی ہے تو پھر میں اس غلط فہمی میں ہی خوش ہوں... مجھے اسی غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیں۔" وہ دوبارہ سیدھے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"لیجیے...! آپ کے لیے گرما گرم چائے اور ساتھ میں قیمہ اور پراٹھے..." مریم بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر آگئی تھی۔

"قیمہ اور پراٹھے؟" "کل بھائی کے آنے کی خوشی میں امی نے ان کی پسندیدہ ڈش بنائی تھی، امی کو پتا تھا کہ بھائی ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ بھی قیمہ ہی کھائیں گے۔" مریم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

"اوہ...! تو یہ ان کا ناشتا ہے؟ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں مجھے نہ کھانا پڑ جائے۔" مدحیہ قدرے ریلیکس ہوگئی تھی اور اس کی بات پہ وہ دونوں بہن بھائی ہنس پڑے تھے۔

"ارے... کھانا تو آپ کو پڑے گا... کیونکہ یہ صرف ان کا ناشتا نہیں ہے... یہ آپ دونوں کا ناشتا ہے آپ کو شیئر کرنا پڑے گا ان کے ساتھ۔" مریم نے شرارت سے دونوں کو دیکھا تھا۔

"نو... میں پہلے بھی ایک بار ان کو بتا چکی ہوں کہ میں اتنا ہیوی ناشتا نہیں کرتی، مجھے عادت نہیں ہے۔" مدحیہ نے نفی میں سر ہلایا تھا اور مریم نے اس کے انکار پہ عدیل کی سمت دیکھا تھا کہ اب کیا کرے؟

"ڈونٹ وری... یہ آج ناشتا میرے ساتھ ہی کریں گی... کیونکہ یہ ناشتا کسی ہوٹل کا نہیں، بلکہ میری امی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔" عدیل نے مریم کو تسلی دی تھی اور وہ مطمئن ہو کر مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی تھی مریم کو بھی اکیڈمی جانا تھا۔ اس لیے وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔

"مگر میں یہ..." مدحیہ کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی اور عدیل نے ناشتا شروع بھی کر دیا تھا۔

"جب کسی کے ساتھ چلنا ہو تو اس کے ہر کام میں اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ چاہے وہ ناشتا ہی کیوں نہ ہو۔" عدیل بڑے سکون سے کہتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھ چکا تھا انداز بہت لاپروا سا تھا اور مدحیہ مزید کوئی انکار نہیں کرسکی تھی اور اس کے ساتھ ناشتا کرنے میں شریک ہوگئی تھی، جس پہ عدیل ناشتا کرنے کے دوران ہی مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہے اور اس کی خاطر وہ اپنے آپ کو بدل بھی سکتی ہے اور یہ بات عدیل کے لیے ایک خوش آئند بات تھی۔

"تھینک یو..." عدیل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"فار واٹ..." مدحیہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ٹھہر گئی تھی اور حیرانی سے سوال کیا تھا۔

"میرا ساتھ دینے کے لیے..." عدیل کا لہجہ اور جواب دونوں ہی مبہم اور متبسم سے ہو رہے تھے۔

"میں نے یہ ناشتا اس لیے کیا ہے کہ یہ آپ کی امی نے بنایا ہے۔" مدحیہ بھی اتنی آسانی سے اسے خوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اٹس اوکے... جس لیے بھی کیا ہے... مگر ساتھ تو میرا ہی دیا ہے نا؟ اس لیے تھینکس اگین۔" عدیل چائے کے سپ لیتے ہوئے لطف لے رہا تھا اور جواباً" مدحیہ خاموش ہوگئی تھی۔

"اوکے! میں اب چلتی ہوں... کافی ٹائم لے لیا آپ کا۔" مدحیہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی عدیل بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

"ٹائم کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ لے لیا ہے آپ نے۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"کیا کہا۔۔۔؟" مدحیہ ٹھٹکی تھی۔
"کچھ نہیں کہا۔۔۔ بس ریکونسٹ کر رہا ہوں کہ ابا جی کی خیریت پوچھنے کے لیے آتی رہا کریں۔۔۔ دل بہلا رہے گا۔" عدیل نے آج پھر اسے تاکید کی تھی۔
"کس کا۔۔۔" مدحیہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے رکی تھی۔
"آف کورس ابا جی کا۔۔۔ اور کس کا بھلا؟" عدیل کہتے ہوئے شرارت سے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدحیہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بیگ لے کر باہر نکل آئی تھی اور پھر سب سے مل کر وہاں سے رخصت ہوئی تھی جبکہ عدیل گھر سے نکل کر گلی میں اسے گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔
"ویسے ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گیا کہ آپ کو گھر کا پتا کیسے چلا؟" عدیل کو اس سوال کا خیال اب آیا تھا۔
"آپ کے کچھ دوست احباب بھی ہوتے ہیں شاید۔" مدحیہ مسکرائی تھی۔
"اوہ اچھا۔۔۔ تو یہ چھوٹے کا کمال ہے۔" وہ فوراً سمجھ گیا تھا اور مدحیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"جی۔۔۔ بہت اچھا دوست ہے یہ آپ کا۔" مدحیہ بھی آخر دل آور شاہ کی بہن تھی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا' بلکہ کھل کے سراہا تھا۔
"جانتا ہوں۔۔۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے ورکشاپ کی جاب کے عوض ایک مخلص دوست عطا کر دیا ہے۔۔۔ بلکہ مجھے تو سب کچھ اسی ورکشاپ سے ہی ملا ہے۔" عدیل اللہ کا شکر گزار ہو رہا تھا۔
"ہوں۔۔۔ اچھی بات ہے۔" مدحیہ بیگ سے چابی نکال کر لاک کھولنے لگی تھی اور لاک کھول کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پلٹ کر عدیل کو دیکھا تھا۔
"تھینکس۔۔۔ آپ نے اتنا اچھا اور مزے دار سا ناشتا کروایا۔۔۔ بہت اچھا لگا مجھے۔" مدحیہ نے شکریہ ادا کیا تھا اور یہ سچ بھی تھا۔ کیونکہ اسے ناشتا بہت مزے دار لگا تھا۔
"یہ ناشتا میں آپ کو روز بھی کروا سکتا ہوں۔۔۔ اگر آپ چاہیں تو۔۔۔؟" عدیل اسے سرتاپا گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"تھینک یو۔۔۔ میں آجایا کروں گی۔" مدحیہ اس کی بات گول کر گئی تھی اور وہ سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔
"اوکے! گڈ بائے۔" وہ کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور دروازہ بند کرنے کے بعد شیشہ فولڈ کر دیا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بیک کرنے لگی تھی۔
"اور ہاں آپ سے ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گئی۔" وہ گاڑی کو ذرا سا پیچھے سرکاتے ہوئے بولی تھی۔
"کیا بات۔۔۔؟" وہ جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
"یہی کہ آج آپ بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں۔۔۔ آج مجھے لگا کہ میں غلطی پر نہیں تھی۔" وہ کہہ کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر گاڑی اڑا لے گئی تھی اور عدیل وہیں کشادہ سی گلی میں کھڑا مسکراتا رہ گیا تھا اس کے آج کے دن کی صبح واقعی بہت اچھی ثابت ہوئی تھی وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے کافی مسرور سے انداز میں چلتا ہوا واپس گھر آگیا تھا۔ جہاں عابدہ خاتون اور مریم اس کی منتظر تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں بھی تمہارے ساتھ لاہور چلوں گی۔" وہ اگلی صبح سو کر اٹھا تو وہ پہلے سے فیصلہ کیے بیٹھی تھیں اور وہ ڈرائنگ روم میں رکھا ان کا چھوٹا سا اٹیچی کیس دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کی تیاری پکی ہے مگر نہ جانے کیوں دل آور کو ان کا فیصلہ اچھا نہیں لگا تھا وہ سن کر خوش نہیں ہوا تھا۔

"آپ لاہور کیوں جانا چاہتی ہیں؟" دل آور نے نہ چاہتے ہوئے بھی استفسار کر ہی لیا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" بتول شاہ نے خفگی سے دیکھا تھا۔
"کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ فی الحال لاہور جائیں۔" اس نے برملا اظہار کیا تھا۔
"مگر کس لیے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟" وہ جھنجلائی تھیں۔
"اس لیے کہ ابھی میرے بہت سے ادھورے کام نبٹانے والے ہیں' ابھی بہت کچھ باقی ہے ابھی آپ مداخلت مت کریں۔" وہ انہیں روکنا چاہتا تھا۔
"تم فکر مت کرو۔۔۔ تمہارے سارے ادھورے کام نبٹانے میں تمہارا ساتھ دوں گی' مدد کروں گی تمہاری۔" انہوں نے دل آور کو بہلایا تھا۔ مگر وہ الجھ رہا تھا اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ لاہور جائیں۔
"مجھے آپ کی مدد کی نہیں۔۔۔ بلکہ دعا کی ضرورت ہے اور وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں پلیز اماں' آپ ابھی مت جائیں' میں آپ کو بعد میں آکر لے جاؤں گا۔" وہ انہیں مسلسل روک رہا تھا۔
"دیکھو شاہ۔۔۔! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کب ہے اور کب نہیں ہوگی' یہ بھلا کس کو خبر؟ میں نے چند روز پہلے زری سے ملنے کا اور لاہور آنے کا وعدہ کیا تھا مجھے وہ وعدہ تو پورا کرنے دو۔۔۔ کہیں ساتھ لے کر ہی نہ مر جاؤں۔۔۔ اور میری زندگی کی طرح میری قبر پہ بھی کوئی بوجھ پڑا رہے؟" بتول شاہ کی بات پہ دل آور بے ساختہ چپ سا ہو گیا تھا لیکن زری کا خیال آتے ہی اس نے دوبارہ ان کی سمت دیکھا تھا۔
"زری سے کیوں ملنا ہے آپ نے؟" وہ تجسس سے پوچھ رہا تھا البتہ چہرے پہ الجھن تھی۔
"کیونکہ اس کی زندگی بھی بتول شاہ کی زندگی سے مختلف نہیں ہے درد سا نجھا نہ سہی۔۔۔ مگر تنہائی کا سفر سانجھا ہی ہے دونوں کا۔۔۔ پاؤں دیکھو تو آبلے ہی آبلے ہیں۔" کہتے ہوئے لہجہ بھر آگیا تھا ان کا' مگر پھر وہی حقیقت کہ اپنے آپ کو سنبھال گئی تھیں اور دل آور مزید کچھ کہے بغیر لاہور جانے کے لیے تیار ہونے لگا تھا اب کچھ اور کہنے کی تو گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

☆ ☆

رفاقت جاوید

"لی لیومی تم منہ پھلائے آنکھوں میں مظلومیت کی داستان سجائے مرجھائے ہوئے پھول کی مانند لگ رہی ہو۔ جان خوامخواہ اپنی طبیعت خراب کر بیٹھو گی۔ آفس سے بھی چھٹی گھر سے بھی چھٹی حتی کہ میری زندگی سے بھی چھٹی کر جاؤ گی بولو نقصان کس کا ہوا میرا کہ تمہارا۔"

طلال مدھم لہجے میں مگر شرارت سے بولا۔ عنایہ نے خفگی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"یار! ذرا مسکرا تو دو کیوں اداس حسینہ بنی بیٹھی ہو کچھ تو بولو۔" وہ جھکتے ہوئے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

"بس طلی تم سے ہرگز نہیں بولوں گی۔ مسکرانا تو دور کی بات ہے۔" عنایہ نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور چینل بدلنے لگی۔

"بھئی غلطی بتاؤ گی تو تلافی کے بارے میں سوچا جائے گا۔" طلال نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول تقریباً "چھینتے ہوئے کہا۔

"ذرا آج کی ڈیٹ بتاؤ؟ تم نہ جانے کس دنیا کے باسی ہو اپنے ہی دکھوں میں غرقاں، حیراں و پریشاں ڈیپریشن کے مارے لوگ تمہارے جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنا علاج کراؤ میری زندگی عذاب مت بناؤ۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ذرا لفظوں کے چناؤ میں غلطی ہو گئی ہے تم سے میں تو اپنی زندگی میں خاصا شاداں و فرحاں رہنے لگا ہوں جسے تم جیسی شریک سفر ملے بھلا وہ حیراں و پریشان کیونکر ہونے لگا ہاں ایک بات درست کہہ گئی ہو۔ میں تمہاری قربت کے فسوں میں۔۔۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں سمجھ گئی ہوں میں۔ جسے آج کی ڈیٹ بھول گئی۔ اس کی اہمیت کا احساس تک نہ ہوا اس بے حس اور بے پروا شخص کو کیا نام دوں۔" عنایہ نے شوہر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سخت روکھائی اور بے چینی سے کہا۔

"آج چودہ فروری ہے یار اس میں ناراضی کی کیا بات ہے؟ ہماری ویڈنگ اینی ورسری تو نہیں آج۔" وہ بظاہر حیرت و تجسس سے بولا۔

"تم اتنے بھی معصوم نہیں ہو کہ میری خفگی و کلفت کی وجہ کا تمہیں علم نہ ہو انجان بننے کی ایکٹنگ مت کرو۔ تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ شوہر، مجازی خدا تمہاری طرح کے ہی تو ہوتے ہیں ویری ان ریزنیبل اینڈ سیل فش کیا مجال کہ بیوی کی کسی خواہش کا احترام کر جائیں سمجھ نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا اسٹیٹس مجھ سے ایک اسٹیپ ہائی کیوں بنا دیا۔" وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

"مجھ سے پیار ہو تو آج کے دن کی اہمیت کا احساس ہوتا۔ ذرا اپنے دوستوں سے پوچھ کر دیکھو پھر بات آگے چلے گی کہ میں ٹھیک رستے پر ہوں کہ تم۔"

"اس کی اہمیت؟" طلال نے طنز و مزاح سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"پھر وہی بے تکا مذاق غور سے سن لو ایسے نہیں چلے گا آئی ہیٹ اٹ۔"

وہ غصے سے غرائی تو وہ خفیف سی ہنسی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہاری محبت بھی نرالی ہے فقط گلاب کے پھول کی طرح جس کی اپنی زندگی ہی چند گھنٹوں سے بڑھ کر نہیں اس معمولی سے پریذنٹ کی چاہ میں مجھ سے خفا ہو بیٹھی میرے گوشہ دل میں جو ہر دم گلاب کی کلیاں پھول کھلتے ہیں تم تک ان کی مدھری خوشبو کیوں نہیں پہنچتی؟ من کے گلزار میں کھلنے والے پھولوں کی حیات بہت طویل ہوتی ہے اور ابدی ہوتی ہے یہ بات پلے باندھ لو۔" طلال نے اس کے غصے کو نظر انداز کرکے نہایت ملائمت سے کہا۔

ہائے ہائے دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہو۔

اس نے طویل آہ بھر کر کہا۔

دلوں میں ابھرنے والے جذبات سطح تک لانے کے لیے بھی تو کچھ عملی اقدام کی ضرورت ہوتی ہے کہ نہیں تمہارے گوشہ دل سے میں ایک پھول کی بھی حقدار نہ نکلی یہ دن پیار کرنے والوں کے لیے ایک

سال بعد آتا ہے اسے سیلی بریٹ ہی نہ کیا جائے یہ تو بات نہ ہوئی ویری سیڈ۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"ورلڈ ٹور کی فرمائش تو نہیں کی تھی میں نے۔"

"بس اتنی سی بات پر دل ٹوٹ گیا یہ تم لڑکیوں کے دل کانچ سے بھی نازک کیوں ہوتے ہیں دن میں کئی بار ٹوٹتے ہیں اور کئی بار ہلکی سی مسکراہٹ وصول کرنے پر جڑ بھی جاتے ہیں۔ ایکچوئلی یہ تمہارا قصور نہیں عورت ذات ـــــ پیدائشی ہی کمزور ہے ہر لحاظ سے۔" وہ شریر لہجے میں بولا۔

"یہ لڑکوں کے دل چٹان کی مانند سنگین اور بے حس کیوں ہوتے ہیں بولو۔" وہ تنک کر بولی۔

"دماغی خلل کا کوئی علاج نہیں ہمارے پاس۔"

"یعنی تم ایک پھول نہ ملنے پر لڑنے مارنے پر تل گئی ہو روزانہ آفس سے آتے ہی جو تمہارے جیسی شگفتہ و حسین کلی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ وہ کیا ہے؟ ہمارے لیے ہر دن ویلن ٹائن ڈے ہے۔ ان بے تکی اور بچکانہ باتوں میں اپنے وقت کا زیاں سراسر بے انصافی ہے۔ دھنک کی فرمائش کرو ابھی پوری کیے دیتا ہوں۔ ویسے تم ہو اول درجے کی بے فیض اور احسان فراموش' ذرا سی کوتاہی پر ایسے تازیانے برسنے لگتے ہیں کہ الاماں۔" وہ خجالت سے مسکرایا۔

"تمہیں اپنی ذہنی اختراعات بہت مقدم ہیں تو بصد شوق ہوتی رہیں۔ آئی ایم ناٹ انسپائر' اپنی مور پہلے جیسے ہو جاؤ ورنہ گھر کا ماحول بتدریج بگڑے گا سدھرے گا نہیں' اپنے دوستوں کو دیکھو ان کے گھروں میں محبتیں اور خوشیاں در و دیوار سے ٹپکتی ہیں۔ آج کی رپورٹ کے مطابق ان کے گھر خوشبوؤں سے نہائے ہوئے ہیں اسے کہتے ہیں انجوائے منٹ ایک میں ہوں وہی روکھا پھیکا ماحول وہی گھٹن زدہ فضا وہی پرانی روٹین وہی تم اور میں۔" وہ رو پڑی۔

"تم اور میں لورز سچے اور پکے لورز ہمیں ایسی بناوٹ کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہمارا تعلق بہت اعلا و ارفع ہے جنابہ۔ تم ایک ویل ایجوکیٹڈ خاتون ہو اس کی تاریخ کے بارے میں پڑھو اگر پھر بھی تم نے یہ ڈے منانے کی ضد کی تو میں ہارا تم جیتیں' ہم بغیر جانے ایسے دنوں کو اہمیت کیوں دیتے ہیں جب کہ ان کا ہمارے مذہب میں کوئی دخل نہیں مجھے ایک سوال کا جواب دو کیا عیسائیت میں اسلامی تہواروں کو منایا جاتا ہے ویلن ٹائن جذباتی ہیجان انگیزی کا نام ہے۔

جس سے ان گنت مسائل ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں۔ پہلے تم اس کے بارے میں پڑھ لو پھر تفصیلاً بات ہوگی۔ ابھی تو موڈ درست کرو میں نہیں چاہتا کہ خیالات کے اختلاف میں روایتی بیوی کی طرح لڑ جھگڑ کر تم کمرے میں بند اور میں گھر سے باہر اپنے دوستوں میں دل بہلانے نکل جاؤں اٹھو جلدی سے تیار ہو جاؤ ماما سے ملنے چلتے ہیں ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی ڈنر ان کے ساتھ ہی کریں گے۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"تم خود ہی جاؤ اور خبردار جو پھول اور تحفے تحائف لے کر گئے۔ میاں صاحب چلے ہیں ماں کو وش کرنے اور میرے لیے نصیحتوں اور فصیحتوں کے پلندے۔ ایک گھر میں دو قانون لاگو نہیں ہونے دوں گی۔ تمہارے اور میرے راستے ایک ہیں منزلیں بھی ایک ہی ہونی چاہئیں۔" وہ بپھر کر بولی۔

"ارے سویٹ ہارٹ ان سے آج ملنے میں کوئی مضائقہ نہیں کئی مہینوں بعد تو ان سے ملنا ہوتا ہے چلو اٹھو گڈ گرل۔ دونوں چلتے ہیں دیکھ کر کھل جائیں گی۔" وہ پیار سے بولا۔

"چھوڑو ایسی باتیں جو تمہیں زیب ہی نہیں دیتیں۔ میرا موقف سمجھنے کی کوشش کرو خوامخواہ دنیا کے پاگل پن میں شریک ہو کر کچھ گین نہیں کرو گی یہ سب نان سنس ہے جان۔"

"تو بتاؤ شادی سے پہلے تم نے اس نان سنس اور پاگل پن میں حصہ کیوں لیا تھا دیوانگی اور جنون کی جھوٹی ایکٹنگ کیوں کی تھی؟ مجھے اس کی عادت ڈال کر اب چلے ہیں مجھے سدھارنے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ تم نے ریورس گیر لگا لیا ہے اٹ از امپاسیبل میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ ہرگز نہیں دوں گی۔"

"بھئی اس وقت تو تمام جائز تھا تمہیں اپنے پیار کا یقین دلانا مقصود تھا۔ ورنہ تمہیں حاصل کیسے کر پاتا؟ قسم سے کتنی ہی نادان اور معصوم ہوتی ہیں لڑکیاں۔ آج کی ڈیٹ میں نادانستگی میں ہی زندگی بھر کی اسیری ایک پھول کے بدلے میں اپنے مقدر کا حصہ بنا لیتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"خیر میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا مت کریں میری انا و خودداری کی انسلٹ۔ پہلے ہی زندگی میں ٹینشن وافر مقدار میں ہیں انہیں کم کرنے کے بہانے ہیں یہ سب۔ دو پیار کرنے والے دلوں کی کمٹ منٹ کا دن سیلی بریٹ کرنا نہ تو گناہ ہے نہ ہی جرم۔" عنایہ قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔

"تو کیا تمہیں ابھی بھی بجیچر آف لو کی ضرورت ہے؟ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے نام کر دیا ہے اس سے بڑی کمٹ منٹ اور کیا ہو سکتی ہے۔ نجانے ہماری نوجوان نسل کو کیا ہو گیا ہے سچائی اور کھرے پن پر مکر و فریب کا لبادہ چڑھا کر فخر محسوس کیوں کرنے لگی ہے۔" وہ الجھ کر بولا۔

"سپورٹی کی تو قدر و قیمت ہی نہیں رہی میں آج تک تو تمہاری خوشی کی خاطر طوعاً" کرہاً" اس دوڑ میں شامل ہوتا رہا ہوں مگر اب ناممکن ہے۔ یہ دن پیار و انس کا دن نہیں گناہ و عذاب کا دن ہے۔ ہمیں اس کے سلیبریٹ کرنے کی ضرورت نہیں اور بغیر شادی کے تو ہے ہی گناہ عظیم۔"

"اس دنیا میں رہنا ہے نا تو دنیا داری کے تمام اصولوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ تم اپنی منطق اپنے پاس ہی رکھو۔ ذرا اپنی عمر دیکھو اور اپنی سوچ اور باتوں پر غور کرو بوڑھے ہو کر تو میری جان کو آ جاؤ گے۔ مجھے اپنا فیوچر تو بہت تاریک نظر آ رہا ہے۔" اس کا تفکر و خوف آسمان کو چھونے لگا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"عجیب باتیں کرتی ہو' میرے تمام اعمال پر ایک پھول بھاری ہو گیا ہے۔ تم پر پھولوں کی چادریں چڑھا دوں پر بائی گاڈ ویلن ٹائن ڈے پر تو لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ ایک دم سے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

"اگر تم سے جرح کرنے اور بحث مباحثہ کرنے سے میری جیت ہو سکتی ہوتی تو یونیورسٹی میں ہی تمہیں نیچا دکھا چکی ہوتی۔ اس لیے تم سے مغز کھپائی کرنا بالکل ہی ویسٹ آف ٹائم ہے۔ تم گھر کی رکھوالی کو بیٹھو میں جا رہی ہوں بھیا کے گھر جہاں ویلن ٹائن کی تیاریاں عروج پر ہیں ہاں اگر میرے ساتھ جانا پسند کرتے ہو تو تمہارے لیے بہتر ہی ہوگا۔ مے بی اس بند ذہن کے دریچے کھل جائیں یہ وقت بھی کس قدر بے وفا ہے تمہاری طرح پینترا بدلتے دیر نہیں لگاتا۔" وہ آہ بھرتے ہوئے بولی۔

"وقت نہیں بدلتا عنایہ انسان وقت کو بدل دیتا ہے' اسے اپنے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اپنے قانون اور اصول اس پر مسلط کر کے خوامخواہ اسے مجرم قرار دینے لگتا ہے۔ میں اس وقت کو بدل کر اپنی پسند و مرضی کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہوں ہمیں سینٹ ویلن ٹائن کے اس منحوس دن سے ہی نہیں غیر مذہب کے ہر تہوار سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری اپنی رسمیں اور اپنی شرمیلی و پاکباز محبتیں کہاں کھو گئی ہیں؟ لو اور کمٹ منٹ میں کسی زمانے میں فرق نہیں آیا ہمارے طور و اطوار' رسم و رواج میں جو پردہ داری تھی اس میں بے پناہ کشش اور حسن و جمال پوشیدہ تھا۔ تشنگی میں بھی مزا تھا' فراق میں بھی راحت تھی۔ عنایہ ہم کس ڈگر پر چل نکلے ہیں؟ جانتی ہو آج کی رات کتنی جابر و ظالم ہے' ہمارے معاشرے میں پروان چڑھنے والے نوجوانوں اور دوشیزائیوں کے لیے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ جب طلوع سحر ان کی بربادیوں کا سندیسہ لے کر وارد ہوتی ہے تو کچھ پچھتاوے میں گھر جاتے ہیں کچھ اسی ڈگر پر ہمیشہ کے لیے گامزن ہو جاتے ہیں۔"

طلال کے لہجے میں بے پناہ دکھ در کر آیا تھا عنایہ نے نظریں جھکا لیں۔ جن میں ندامت کے سوا کچھ نہ تھا۔ طلال نے فوراً" فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر کہا۔

"کیا سال میں صرف ایک بار جسچر آف لو کی یاد دہانی کرنے پر تم خوش ہوتی ہو تو چلو میں بھی اس بھیڑ چال میں شمولیت اختیار کرلیتا ہوں۔ میرا ہر سانس تم سے کمیٹڈ ہونے کا جو اعلان کرتا ہے۔ اس میں آج کے بعد فرق آجائے گا۔ محض چودہ فروری کو ہی بے دار ہو گی یہ منظور ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ پلکیں جھپکتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

"اگر تم ماضی میں گزر جانے والے سچے اور پاکیزہ عاشقوں پر غور و خوض کرو گی تو مغرب سے چرائے ہوئے اس بیہودہ دن کی اہمیت سے باہر نکل آو گی۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی ماہیوال کے عشق کی داستانیں آج تک کیوں زندہ ہیں؟ بتا سکو گی۔" وہ سنجیدگی سے بولے جا رہا تھا اور وہ جو چند لمحے پیشتر غصے سے لال بھبھوکا ہو گئی تھی۔ سرسوں کے پھول کی مانند زرد پڑ چکی تھی۔

"طلی کل تو تم آنے والے اس بچے کی برتھ ڈے بھی سیلی بریٹ نہیں کرنے دو گے، ہمارا بچہ اس ماحول میں مس فٹ ہو جائے گا۔"

اس کے لہجے میں پریشانی عود کر آئی تھی۔ وہ فہمائشی انداز میں بولی۔

"ہم اپنی خوشی اپنے دین کے اصولوں کے مطابق منائیں گے، غریبوں اور مسکینوں کے لیے گھر پر لنگر کا انتظام کریں گے کیا یہ بہتر نہیں کہ اس رب نے ہمیں اولاد جیسی نعمت سے نواز کر ہم پر احسان عظیم کیا ہے تو کیا شکرانہ ادا کرنے کا فریضہ ہم اس طریقے سے ادا نہیں کر سکتے۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمہارے تعاون کے بغیر میں یہ انقلاب نہیں لا سکتا عنایہ، بیوی اور ماں، شوہر اور اولاد کے رستوں میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو چنتی ہے تو تب وہ حقیقی منزل تک پہنچ پاتے ہیں۔"

"کیا تم اکیلے اپنے معاشرے کو بدل سکتے ہو؟" وہ دکھ کو اپنے اندر سموتے ہوئے بولی۔

"ہر بھلے کام کی شروعات اپنے گھر سے کی جاتی ہے بیج تم بوؤ گی پھر کونپلیں نکلیں گی۔ آہستہ آہستہ پودا پروان چڑھتا جائے گا۔ اور ایک دن اس کے پھولوں کی خوشبو چار سو پھیلتی چلی جائے گی اپنے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ آنے دینا کہ بھلا میں اکیلی اس معاشرے کی علتوں اور خرابیوں کو کیسے دور کر سکتی ہوں۔ جب ایک قدم نیک نیتی، سچے ارادے اور مستحکم فیصلے کو نظر رکھ کر اٹھاؤ گی تو زمانہ تمہارا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گا اور تم وقت پر حاوی ہو جاؤ گی یہ میرا دعوا ہے۔ یہ دنیا تو بے انت ناجائز و بے جا خواہشوں کی گہری دلدل ہے جس پر پاؤں رکھیں تو نیچے دھنستے چلے جاتے ہیں وی آر سو لکی کہ ہمیں بروقت اس کا احساس ہو گیا ہے۔" وہ ممنونیت سے بولا۔

"طلی! تم نارمل نہیں ہو۔ کسی سائیکاٹرس کی کونسلنگ چاہیے تمہیں آئی ایم وریڈ طلی۔" وہ اس کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"ابنارمل تو پہلے تھا نیو ایئر کا دلدادہ، کرسمس ڈے کا شیدائی ویلن ٹائن ڈے کا رسیا اور مدر ڈے اور فادر ڈے کا کس بے قراری سے انتظار کیا کرتا تھا۔ جبکہ اپنے پیرنٹس کے ساتھ گزارا ہوا میرا ہر لمحہ نایاب اور انمول تھا۔ ان کی موجودگی میں ممتا و شفقت کا میٹھا اور ٹھنڈا سائبان میرے لیے ہر دم باعث رحمت تھا یہ سیکورٹی کی حدت میری نس نس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس کے پس پردہ کیا کار فرما تھا۔ وہ اصول و قانون جنہیں ہم آج حقارت سے دیکھتے ہیں۔ بوڑھے والدین سے علیحدہ رہنے میں شادمانی محسوس کرتے ہیں ہم بھی اسی منزل کا تعین کر چکے ہیں۔ مغربی معاشرے میں اس کی ضرورت ہے۔ جہاں اولڈ پیپلز ہومز میں سال میں ایک بار پیرنٹس کو وش کیا جاتا ہے یہاں تو صبح دوپہر شام ہم والدین کو سلامی دینے کو تیار ملتے ہیں فیملی سسٹم برقرار رہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے یہی ہمارے مدر اور فادر ڈیز ہیں۔"

"بہت دقیانوسی ہو گئے ہو۔" وہ بڑبڑائی۔

"خوامخواہ ہیر رانجھا کی مثالیں دینے بیٹھ گیا ہے۔ ان کا عشق و پیار آج سے فرق کیسے ہو سکتا ہے، کیا وہ

انسان نہیں تھے۔ معصوم اور پاکباز فرشتے تھے کیا؟ اگر رانجھا ہیر کو حاصل کرلیتا تو اس کی حیثیت بھی میری جیسی ہی ہوتی۔"

"خوب کوس لو مجھے آئی ایم سوری۔ میں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے سو کالڈ آج کا مبارک دن چنا ہے۔ تم میری ہمسفر ہونے کے ناتے ایگری ضرور کرو گی۔" وہ مسکراہٹ دباتے استفسار سے بولا۔

"ایسے تو زندگی گزارنا مشکل ہے طلی۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"یعنی اس مہم میں تم میرا ساتھ نہیں دو گی۔ ایک پھول پیش نہیں کیا تو تمام وعدے وعید پھول کی عمر کی طرح پل بھر میں مرجھا گئے یہ تو بات نہ ہوئی۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ بات تو سچ تھی مگر اعتراف و اقرار کیسے کرتی۔

"تمہیں میری باتیں بہت انوکھی اور نرالی لگ رہی ہیں ناں۔ جب تمہاری بیٹی سولہویں سال میں قدم رکھے گی تب تمہارے چاروں طبق روشن ہوں گے۔ جب وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ویلن ٹائن ڈنر پر تمہاری اجازت کے بغیر ہی چلی جائے گی۔ پھر پچھتاوے، سمجھوتے اور صبر کے بغیر کچھ نہیں کرپاؤ گی۔ اپنی نسل کو سنوارنا چاہتی ہو تو اپنی معاشرتی قدروں کو سینے سے لگا کر مغربی رسموں کو الوداع کہہ دو آج اور اسی وقت۔ آؤ یہ خوشی سیلی بریٹ کرتے ہیں۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"تم بہت سیریئس ہو گئے ہو بزدلی کی باتیں مت کرو۔ وقت آنے پر دیکھا جائے گا لیٹس انجوائے۔ جوانی کے دن تو گنے چنے ہیں طلال انہیں مت گنواؤ۔"

"انہی دنوں کی عبادت کو اول درجہ دیا گیا ہے عنایہ اس کی بے شمار وجوہات ہیں۔" وہ پیار اور نرمی سے بولا۔

"او کے۔۔۔ تم گھر پر آرام کرو میں تو چلی بھیا کے گھر ان کے گھر جانے پر اعتراض اور انکار تو نہیں کرو گے آخر میرا میکا ہے۔" وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

"کسی فرینڈ کے ہاں جاؤں گی نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کا پروگرام ہے اس لیے بے فکر رہو۔ تسبیح نماز پڑھو خانساماں تمہیں دال چاول کھلا دے گا کھاؤ اور شکرانہ ادا کر کے بے فکری سے لمبی تان کر سو جانا۔"

عنایہ نے ایک طویل انگڑائی لی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی طلال بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

"عنایہ میں تمہارے اس خود سر اور منہ زور باغیانہ روپ سے پہلے واقف نہ تھا۔" وہ شاکڈ سا ہو کر بولا۔

"میں بھی تو ایسے فرسودہ اور جاہلانہ خیالات رکھنے والے طلال کے اس بھیانک روپ سے ناآشنا تھی مجھے گھٹ گھٹ کر جینے کا کوئی شوق نہیں۔ تم اپنے خود ساختہ اصولوں پر قائم و دائم رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور نہ ہی میں تمہیں بدلنے کے لیے کسی قسم کی محنت مشقت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ زندگی بہت چھوٹی اور مختصر ہے، شخصی آزادی ہمارا حق ہے۔ یہ حق نہ تو تم مجھ سے چھین سکتے ہو نہ ہی میں اس کی کوشش کروں گی۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی اور الماری کھول کر نیا سرخ رنگ کا خوب صورت جوڑا نکالا بیگ تیار کیا اور ہینڈ بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ طلال بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اس کے پیچھے باہر کو لپکا عنایہ نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی تکلیف ہی گوارہ نہ کی۔ سرعت سے کوریڈور عبور کرتی ہوئی مین ڈور کھول کر باہر نکل گئی۔ طلال پر ملال نگاہوں سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اف ہماری تہذیب میں مغربی کلچر کی ملاوٹ کے یہ بھیانک اور تاریک پہلو ہمیں تباہی و بربادی کی جانب دھکیل رہے ہیں۔ یا اللہ ہمیں اس ذلت و غلاظت سے بچا لے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا صوفے پر ڈھے گیا۔ بات کی شروعات چھیڑ خانیوں اور طنز و مزاح سے ہوئی تھی معاملہ اتنا گمبھیر ہو جائے گا۔ اسے اس کی توقع نہ تھی۔

وہ صوفے پر لیٹا اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جبکہ عنایہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ آج واپس نہیں آئے گی۔ اس کی باتوں کی تلخی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ

طلال کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ جائے گی بس ایک بار جھڑپ ہونے کی دیر تھی۔ وہ اس کی شورش اور بغاوت پر تلملا اٹھا۔ دکھ سے سوچنے لگا کہ وہ اس کے خیالات کے مطابق اپنی زندگی کیونکر گزارے گی۔ کھاتے پیتے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے خود کفیل ہے۔ جن کی تربیت میں شوہر کی خاطر اپنا پتا مار کر گھر کو آباد رکھنا شامل ہی نہیں ہوتا۔ ہماری قدروں کے تمام ستارے گردش میں ہیں ہم پر آنے والی مصیبتیں بتدریج بڑھیں گی کم ہونے کے تمام مواقع ہم نے کھو دیے ہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں اپنے سکون و چین، عزت و غیرت کا قتل کردیا ہے۔

وہ سوچتا ہوا ایک جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ یہ صرف میری نہیں ہم سب کی بدقسمتی ہے۔ اس کا دفعیہ کیسے ممکن ہے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بڑبڑانے لگا۔

☼ ☼ ☼
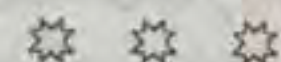
باہر کا ماحول اس کے گھر کی فضا سے کس قدر مختلف تھا۔ یہاں گلیمر تھا زندگی رواں دواں تھی ہر چہرے پر گلاب کی کلیوں سی مسکان تھی مگر وہ طلال کے بدلتے ہوئے خیالات پر نیر بہاتی گاڑی ڈرائیو کررہی تھی۔ اس کی زندگی میں ہلا گلا، گہما گہمی اور تھرل کی خاصی اہمیت تھی دونوں کی پسند کی شادی تھی وہ طلال کی قربت میں ہردم مسرور، تفاخر سے تنی ہوئی رہتی۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہوئی ضوفشانی و سرشاری اس کے اندرونی جذبات کی عکاسی کیا کرتی تھی۔

دونوں ایک ہی کمپنی میں بہترین جاب پر تھے۔ ہمیشہ لنچ بھی اکٹھے ہوتا تھی کہ ہر سانس ہنی مون کے مزے سے ہمکنار رہتا تھا وہ یوں ایک دم سے پٹڑی سے اتر جائے گا لاحول ولا قوۃ وہ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولی میں نے اس سے ناجائز مطالبہ نہیں کیا یہ خاص الخاص دن ہی تو لائف کو انٹرسٹنگ بناتے ہیں۔ میں نے ویلن ٹائن ڈے تمہارے ساتھ منانے کی فرمائش کی تھی کوئی کفر تو نہیں کیا تھا۔ تمہارے اور میرے مزاج میں تو کبھی بھی اختلاف نہ تھا پھر آج میری ہر بات کو اس نے مذاق میں کیوں اڑا دیا؟ یہ معمہ کسی سے شیئر بھی نہیں کرسکتی اپنائی ہوئی چھپانا بھی ناممکن ہوگا۔

عجیب مخمصے میں پھنس گئی ہوں بھابھی تو اڑتی چڑیا کے پر گننے والی خاتون ہیں۔ اگر واپس گھر چلی جاتی ہوں تو طلال آئندہ کے لیے ناقابل برداشت ہوجائے گا اسے کچھ تو سبق سکھانا ہی پڑے گا۔ شوہر کی سرشت اور فطرت بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔ دادی ماں کہا کرتی تھیں کبھی اس ذات پر بھروسہ نہ کرنا۔ آگہی ضروری ہے، جب یہ ضد اور اکڑ میں آجائے تو پھر نہ تو کوئی فلسفہ کام آتا ہے نہ ہی منطق و دلائل اندر کی آنکھ کا کھلے رکھنا ہی فتح مندی اور خوشحالی ہے سب زمانہ جہالت کی باتیں ہیں۔ انہی سوچوں میں مقید وہ جائے مقام پر پہنچ گئی۔

پھولوں کی درجنوں دوکانوں پر اتنا رش تھا کہ جیسے ویلن ٹائن ڈے کی خوشی میں مفت تقسیم ہورہے ہوں۔ گاڑیوں میں پاپ میوزک فل والیوم میں فضا میں منتشر ہورہا تھا چار سوینگ لڑکے اور لڑکیوں کی بھرمار تھی ایک بھی بزرگ مرد یا عورت اس ہنگامے میں شریک نہ تھے۔ یہ بے قابو اولاد تو انہی کی تھی۔ شاید وہ مجبور تھے۔ جو خاموش تھے۔ جو انہیں بے مہار چھوڑ دیا تھا۔ شرم کا مقام تھا۔ عنایہ نے گاڑی پارک کی اور پرستائش نظروں سے پررونق فضا میں لمبا سانس لیا۔ اور گاڑی سے نیچے اتر کر سپرہٹ ہیروئن کی طرح بالوں کو جھٹکا دیتی ہوئی ہجوم کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت طلال کو چھوڑنے کا چہرے پر رتی بھر ملال نہیں تھا۔ دیسی لال گلاب کی بھینی بھینی خوشبو نے گردوپیش کی فضا کو معطر بنا دیا تھا۔ ہوا میں خوشی رچی بسی ہوئی تھی۔ دھکم پیل میں ہر ایک کی حتی المقدور یہی کوشش تھی کہ لال غبارے، لال پھول اور ہر سائز کے خون میں نہائے ہوئے لال ہارٹس حاصل کرکے اگلے مشن کی تیاری کرے۔

پھولوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔ شدت کی سردی اور سرگوشیاں کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کا

کسی پر رتی بھر اثر نہ تھا۔ جوانی کی حدت تھی، جذبوں کی تپش تھی اور محبت و عشق کی تکرار تھی۔ ایک دوسرے کو خوش کرنے اور اپنی اپنی محبت کے اظہار کرنے کی کاوش عروج پر تھی۔ عنایہ بھی بھابھی سے داد آفرین حاصل کرنے کے جذبہ شوق میں کنگ سائز ریڈ گلاب کا بوکے اور جنریشن سے سوٹ، بچوں کے لیے بے حساب، لاتعداد غبارے اور اپنی ماما کے لیے گلاب کی کلیوں کا گلدستہ خریدنے کی آرزومند تھی۔ میاں نے ساتھ نہیں دیا تو نہ سہی وہ خود مختار تھی اپنی خواہش پوری کرسکتی تھی یکدم ہی ہلکی ہلکی پھوار شروع ہوگئی۔ مگر بھیڑ میں کمی نہ آئی۔

عنایہ کو بیتے ہوئے سال کا یہی دن تڑپا گیا طلال کا ساتھ تھا۔ کس بے نیازی سے اس نے اس کی پتلی کمر کے گرد بازو حمائل کررکھا تھا۔ ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ چند دنوں بعد شادی ہونے والی تھی اسے ایسے گمان ہورہا تھا جیسے وہ ہواؤں کے دوش پر آکاش کی رفعتوں کو چھونے لگی ہے زمین اس سے بہت دور رہ گئی ہے۔

ماضی آنکھوں میں آنسو بن کر وارد ہوگیا یکدم ادھورے پن کے احساس نے اسے بے کل کردیا ہجوم اور شور شرابے میں بھی تنہائی اور اکیلا پن نس نس میں سرائیت کرگیا وہاں کی ہر چیز بری لگنے لگی۔

افسردگی اور شکستگی سے اس نے نیر بہاتے آسمان کی طرف نہایت عالم بے بسی سے دیکھا۔ شدت کی سردی کی تھمی تھمی بارش میں چلتی ہوئی کار تک آگئی۔ طلال کی محبت و چاہت میں ڈوبی ہوئی مدہوش آواز اس کے کانوں میں شیریں رس گھولنے لگی۔

"عنایہ! جب تم لال رنگ کا لباس زیب تن کرتی ہو تو ہو بہو سرخ گلاب کی مانند فریش، پریٹی اور خوشبو میں بکھیرتی ہوئی مجھے مدہوش کردیتی ہو۔" اس کی اسی بات پر عنایہ نے رخصتی کا ڈریس سرخ رنگ کا ہی زیب تن کیا تھا اور بے پناہ تعریف جھولی میں بھری تھی۔ وہ یاسیت بھرے لہجے میں بڑبڑائی۔

"آج تمہاری محبوبیت کہاں رخصت ہوگئی جلوت

میں بھی احساس خلوت مارے جا رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ دھاڑیں مار کر اپنے ارد گرد سب کو جمع کر لیتی۔ اپنی بکھری ہوئی ہمت کو یکجا کر کے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اسی اثنا گاڑی سے باہر ایک سرخ گالوں اور چمکتے ہوئے دودھیا رنگ والی دس سالہ بچی نے اس کے سامنے کھانے کا اشارہ کیا۔ سچ مچ اس کی آنکھوں میں بھوک ناچ رہی تھی۔ عنایہ نے اس کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اپنے تمام دکھ، کرب اور غم بھلا کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔

اس قہر کی سردی میں وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر گیلی سڑک پر اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے جو سردی کو کم کرنے کے لیے کافی ہرگز نہیں تھے۔ بارش میں گیلے ہو چکے تھے اور اس کے خوب صورت لال ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ عنایہ حق دق اسے دیکھنے لگی۔ اس نے شیشہ نیچے کیا اور ایک دم سے تڑپ کر گویا ہوئی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نصیبو۔" وہ شرما کر بولی۔

"تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ تمہیں خوب صورت کپڑے مزے دار کھانا اور رہنے کے لیے اچھی جگہ دوں گی پڑھاؤں گی اور تمہیں بہت کچھ سکھاؤں گی۔" عنایہ غیر شعوری طور پر بولے چلی گئی۔ ورنہ ایسے روح فرسا مناظر دن میں بیسیوں بار دیکھ کر بے حسی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا مگر آج دل کی چوٹ کام کر گئی تھی۔ کبھی کبھار انسان اپنے کمزور لمحوں میں بے دار ہو جاتا ہے حیرت و بوکھلاہٹ سے زبان بے اختیار سی ہو اٹھتی ہے بے تکی، بے معنی اور غیر پائیدار باتیں منہ سے نکلنے لگتی ہیں۔ اس وقت عنایہ بھی اسی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اسے اپنا ناز و نعم میں بیتا ہوا بچپن یاد آ گیا تھا اور وہ ہمدردی کا پیکر بن گئی۔

"تو پھر کیا تمہاری طرح بیگم بن جاؤں گی۔" نصیبو نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ یہ گلیوں میں پلنے والے بچے اپنی عمر سے بہت جلد بڑے ہو جاتے ہیں اس کی اس بات پر عنایہ ٹھٹکی اور سنبھل کر سرگوشی میں بولی۔

"میری مانو گی تو میری جیسی ہی بن جاؤ گی۔" یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ عنایہ نے دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں بیگم صاحب میں اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" اس نے اتنا کہا اور یہ جا وہ جا ہو گئی۔ اب ایک جوان لڑکی چند دنوں کے بچے کو بغل میں چھپائے ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی تھی۔ کمزوری و نقاہت سے اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر سفید پپڑی اور گال پر نیل کا بہت گہرا نشان تھا۔ عنایہ نے اب سوچ سمجھ کر اس سے کہا۔

"میرے ساتھ چلو نوکری بھی دوں گی اچھی تنخواہ بھی دوں گی۔ رہنے کے لیے کوارٹر بھی ہے اس بچے کی تمام ذمہ داری بھی اٹھاؤں گی مگر کوارٹر میں اس بچے کا باپ نہیں رہ سکتا کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ پاوڈری ہو گا۔ تمہاری کمائی پر عیش کرتا ہو گا۔"

"بی بی جی تم تو اولیا نکلیں سچ ہے کہ میرا مرد نشہ کرتا ہے۔ پھر مجھے مار پیٹ کر پیسے بھی چھین کر لے جاتا ہے مگر میں اسے اکیلا چھوڑ کر تمہارے پاس کیسے آ سکتی ہوں بے چارا مر جائے گا مجھ سے پیار بھی تو کرتا ہے کوئی گل نہیں اس کے لیے کماتی ہوں وہ میرے سر پر چادر کی طرح جو ہے۔ بی بی جی کسی کی جرات نہیں کہ کوئی مجھے میلی نظر سے دیکھ بھی جائے۔ اسی بھوکے پیاسے ہی ٹھیک آں مل کر رہتے ہیں۔ روتے ہیں تو مل کر ہنستے بھی تو ہیں آٹے کے لیے مدد کر دو بھلا ہو گا جی۔" عنایہ نے پرس کھولا اور دو سو اس کی طرف بڑھا دیے تو اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں بجلی کوند گئی۔ دعائیں دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"عنایہ بیگم تم سے تو وفادار، تابعدار اور خدمت گزار عورت وہ ہے۔ جرسی خاوند کو کھلاتی بھی ہے مار بھی کھاتی ہے اس کے بچے بھی پیدا کرتی ہے مگر پھر بھی اس کی ہمدرد ہے بد بخت عورت تم اپنے طلال کی پروا کے بغیر اپنی جنت میں گستاخ ہو بغاوت کا بیج بو کر وہ کلین ٹائن ڈے منانے چل پڑیں۔"

مارے شرمندگی کے وہ تڑپ اٹھی تھی اتنی شدید سردی میں ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

احساس کم مائیگی اور ندامت میں جھنجھناتی ہوئی اس نے بارش میں بھیگتے ہجوم کی طرف نظر دوڑائی۔ جو پھولوں کے حصول کی خاطر ہر طرف سے بے پروا تھے۔ غریب بھکاری معصوم بچے عورتیں، لڑکیاں اور بوڑھے اس بھیڑ میں گھس کر روٹی کے لیے التجائیں کر رہے تھے۔ مگر کسی پر ان کی کسمپرسی کی فریادیں اور منتیں اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں۔ سب لطف کشیدگی کے موڈ میں تھے۔ اس بے رحمی، نفسا نفسی اور لاپروائی پر وہ تڑپ کر رہ گئی۔ دنیا کے ڈرامے کے دونوں رخ اس نے ایک ساتھ دیکھے تھے۔

پہلے بھی کئی بار ایسا اتفاق ہوا تھا مگر آج وہ اللہ کی پسندیدہ شخصیت بن گئی تھی جس نے اسے نواز ڈالا تھا۔ ذہن و قلب سے اپنے نفس کی بے جا و ناجائز لذتوں اور گناہوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے حقیقی اور سچائی کی جانب مائل ہو چکی تھی۔

"اف مائی گاڈ میں بھی اسی قماش سے تعلق رکھتی ہوں۔ قابل نفرت و قابل حقارت اور ناقابل معافی ہستی ہوں۔" اسے ابکائی سی آ گئی۔ اس نے ذہنی کشمکش سے نکلنے کی کوشش کی جلد ہی اس نے اپنی جبلت پر غلبہ پا لیا۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور خود کلامی کرتی ہوئی پیسے نکالنے لگی۔

"آج کا ویلن ٹائن ڈے ان مسکینوں اور لاچاروں کے نام۔" وہ سرعت سے گاڑی سے باہر نکل آئی اور پل بھر میں اپنے لیے ذہنی و دلی اور روحانی سکون کا سودا کر کے واپس گاڑی میں آ بیٹھی۔

"جن کی تجوریاں بھری ہوئی ہیں ہم انہی کو مزید بھرتے چلے جاتے ہیں پیسہ پیسے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس کشش سے پناہ مانگو گھر کی دیواروں کو مضبوط بنانے کے لیے ان کے کشکول کو بھرا رکھو۔ پھر تم مضبوط اور محفوظ قلعے میں احساس تحفظ میں اپنی زیست بتا لو گی یہ لوگ مانگنے کے شوقین نہیں ہیں اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر اپنی خودداری اور انا کو تہ تیغ کر کے ہمیں نفرت سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ہماری بے حسی ہماری بربادی ہے یہ قصوروار نہیں ہم ان کے گناہ گار ہیں مجرم ہیں، ہم سب ڈاکو اور چور ہیں۔ یہ لوگ اس زمرے میں نہیں انہیں چوری ڈکیتی، جھوٹ و فریب کا رستہ ہم نے دکھایا ہے اپنے گوشہ دل میں انہیں جگہ دے دیں اسلام یہی ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور بھرپور طمانیت، تسکین و مسرت لیے وہاں سے نکل آئی۔ گاڑی کا رخ اپنی جنت کی طرف تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور رحمتوں کے دروازے کھول دیے تھے۔

"تھینکس ٹو طلال۔ آئی ایم ویری گریٹ فل۔" گوشہ دل میں عقیدت و محبت سے بھرپور سرگوشی ابھری۔۔۔ اور اگلے لمحے وہ شرم و حیا سے سرخ گلاب بن چکی تھی۔

☼ ☼

نادیہ امین

مکمل ناول

وہ جب سے یہاں آئی تھی اسی شخص کو سوچے جارہی تھی۔ جانے اس کی شخصیت میں ایسی کیا بات تھی جو اسے اپنی جانب متوجہ کررہی تھی۔ وہ کم گو تو تھا اس کی باتوں سے اندازہ ہورہا تھا پر ایک عجیب سی خاموشی اور گہری چپ نے اس کی شخصیت میں کچھ اور دلکشی بڑھائی تھی۔ اس کی گندمی رنگت اُس کا اونچا لانبا قد اس کے سیاہ گھنے بال اس کی شخصیت بہت ساحرانہ تھی۔

وہ اس سے دوٹوک ضروری بات ہی کرتا تھا۔ کوئی خاص مدارات نہیں بس لیا دیا سا انداز تھا جبکہ باقی سب ملازمین اس کے آگے پیچھے اس کے سامنے مودب کھڑے اس کے ایک حکم کے انتظار میں رہتے تھے۔ آئی تو وہ یہاں کا دورہ کرنے تھی پر اور معاملات میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ ایک گہری سانس کھینچ کر وہ پردے برابر کرتی اپنی خوابگاہ کے اس پرحدت ماحول میں اسے سوچتی بستر پہ دراز ہوگئی تھی۔ کل رات سے شروع ہونے والی بارش نے اس کی منچلی فطرت کو بھی گہری نیند سلا دیا تھا۔ آسمان کی گرج دار دھاڑ نے اسے شب آغوش کے حوالے کردیا تھا۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز نیند کی وادی میں اتر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼
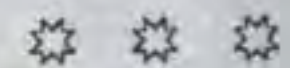
صبح وہ اٹھی تو کافی دیر ہوگئی تھی۔ ناشتے سے فراغت کے بعد وہ تیار ہوئی تو پونے بارہ بج رہے تھے۔ جلدی میں وہ باہر ہونے والی بارش کا جائزہ بھی نہ لے سکی تھی پردے ہٹا کر اس نے باہر دیکھا چمکیلی دھوپ کی کرنیں اب گہری دھوپ کی شکل اختیار کرچکی تھیں۔ ایک طمانیت بھرا سانس لے کر وہ پردہ برابر کرتی کمرے سے نکل گئی تھی۔

اپنے آفس میں آکر اس نے جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ انٹرکام بجا کر ریان کو طلب کیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ آیا۔

"بیٹھو۔" اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو بلاتردد وہ بیٹھ گیا تھا۔

"ہوٹل کی مینجمنٹ سے میں مطمئن نہیں ہوں، میں چاہتی ہوں کہ اس میں کچھ تبدیلی کی جائے اس کے لیے..." وہ اس کی بات کاٹتا فوراً بولا تھا۔

"پر میں یہاں اک معمولی ورکر ہوں یہ کام جنرل مینجر کا ہے آپ ان سے بات کریں۔" اس نے نوٹ کیا تھا اس کے چہرے پر ایک عجیب سی حیرت تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ آیا اس نے جنرل مینجر کے بجائے اسے کیوں بلایا تھا اس کی بات نے اسے کافی شرمندہ کردیا تھا۔ اپنی ندامت مٹانے کو وہ بولی۔

"میں یہاں کے اک عام معمولی ملازم کی رائے لینا زیادہ ضروری سمجھتی ہوں۔ اس لیے تمہیں بلایا ہے تمہاری رائے سے شاید میں کچھ بہتر رزلٹ پاسکوں۔"

"میں زیادہ کچھ تو نہیں جانتا پر یہاں ایسے بہت سے ورکرز ہیں جو تنخواہ تو زیادہ لیتے ہیں پر کام کچھ نہیں کرتے۔ اگر انہیں ہٹا کر اچھے لوگ رکھے جائیں تو شاید ہمارے ہوٹل کا معیار اچھا ہوجائے۔"

"کیا تم ان کے نام بتانا پسند کروگے۔" پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد دوبارہ بول اٹھی۔

"میں اپنی تسلی کروا کر ہی ان کے خلاف کچھ ایکشن لوں گی۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔" گویا وہ اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھی اس لیے اسے مطمئن کررہی تھی۔

پھر اگلے ہفتے ایسا ہی ہوا تھا اس نے تقریباً چھ ورکرز فارغ کرکے نئی اپائنٹمنٹ کی تھیں۔ اس حسین پہاڑی علاقہ کا یہ مشہور معروف ہوٹل تھا۔ یہ یہاں کا واحد بڑا ہوٹل تھا باقی چھوٹے ہوٹل یا ریسٹورنٹ تھے جو اس ہوٹل کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ پہاڑی علاقہ حسن و خوبصورتی میں بے مثال تھا۔ یہاں سرسبز پہاڑ دیکھنے والوں کو اپنے دلفریب حسن میں جکڑ لیتے۔ پہاری ڈھلان، پیچ و خم کھاتی سڑکیں ایک طلسماتی حسن کا سا نظارہ پیش کرتی تھیں۔ بڑے بڑے پہاڑوں کی سحرخیز دلکشی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی وہ جب سے یہاں آئی تھی باہر کا تفصیلی دورہ کرنے کا وقت نہ مل سکا تھا۔

آج شام تھوڑا سا وقت نکال کر وہ ان پیچ و خم کھاتی سڑکوں پر نکل آئی تھی۔ چمکیلی دھوپ رخصت ہو چکی تھی۔ سرمئی بادل ادھر ادھر ہلکورے لے رہے تھے۔ شفق کی گہری سرخیاں آسمان کی وسعتوں میں مدغم ہونے لگیں۔ عمیق کھائیوں سے نمودار ہونے والے بندر جا بجا کھڑے بھاگتے دوڑتے دیکھ کر وہ یکدم سے گھبرا گئی تھی چونکہ کافی بڑی تعداد میں تھے اس لیے ڈر کر اس نے آگے جانے کا ارادہ موقوف کر دیا تھا۔ مڑ کر واپس ہوٹل کی جانب آئی تھی ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی جو برداشت سے باہر تھی۔ اپنے روم میں جا کر ہی اس نے دم لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا باپ ایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔ وہ اس کی اکلوتی اولاد تھی ایم بی اے کے آخری سمسٹر پیپرز دے کر وہ آج کل فارغ تھی اس لیے یہاں ہوٹل کی کارکردگی دیکھنے آئی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی وہ کافی ایکٹو تھی۔ وہ بہت بے باک نڈر تھی۔ یونیورسٹی میں اس نے کئی لڑکوں سے افیئر چلائے تھے جو کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکے تھے۔ وہ کبھی کسی کے لیے سیریس نہیں تھی مگر ان میں سے دو تین اس کے لیے بہت سیریس ہو گئے تھے۔ جبران نے تو یہ تک کہہ دیا تھا۔

"باد صبا تمہاری یہ بے رخی میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ تم نے میرا دل توڑا ہے اللہ تمہارا دل توڑے گا۔" اس نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی تھی۔ اس کے نزدیک زندگی ہنسی مذاق موج مستی کا نام تھا۔ لذت آمیز زندگی سے خوشی کشید کرنے کا فن اسے آتا تھا۔ اور اپنے فن سے وہ خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

وہ لڑکا گویا اس کی ضد بن رہا تھا۔ وہ اس سے اتنا ہی لاتعلق رہتا جتنا وہ اس کو سوچتی۔ آج جب اس نے اسے تنخواہ سمیت کچھ دیگر الاؤنسز دینے کی نوید سنائی تو بجائے خوش ہونے کے وہ کچھ تحیر زدہ سا تھا۔

"مگر... کیا سب کی بڑھی ہے۔" اس کے سوالیہ جملے نے اسے کچھ خفت زدہ سا کر دیا تھا۔

"نہیں صرف تمہاری۔" اس نے اختصار سے کام لیا تھا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ صرف میری کیوں؟" اب کے اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ وہ سراپا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ خفیف سی خاموشی کو چیرتی اس کی آواز ابھری تھی۔

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے پھر تمہارا اس قدر متفکرانہ انداز سمجھ میں آنے والا نہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اتنے ورکرز کے درمیان صرف تمہاری سیلری بڑھی ہے۔"

"یہ عنایت ہے یا میرا حق۔ میں نہیں جانتا پر اس سے باقی سب کے احساسات و جذبات دونوں بہت مجروح ہوں گے، میں ایسا نہیں چاہتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم میری دی ہوئی عنایت کو ٹھوکر مار رہے ہو۔ یہ تمہارا فیصلہ سہی۔" وہ تمہارا پر زور دیتی کہہ رہی تھی۔ اسے جاتا دیکھ کر وہ اک بار پھر بولی تھی۔

"لیکن یہ موقع بار بار نہیں ملے گا ایک بار پھر سوچ لو۔" اس نے رخ موڑ کر اس کا ادھورا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں صرف لمحہ میں سوچتا ہوں اور ایک لمحہ میں، میں نے سوچ لیا اور آپ کو جواب دے دیا۔" اس کا ضدی اور اکھڑ انداز اسے سخت طیش دلانے لگا۔

"ٹھیک ہے جا سکتے ہو۔" قطعی انداز میں کہتی وہ فائلز پر جھکی تھی۔ اس کی یہ دیدہ دلیری اسے سخت اشتعال دلا رہی تھی۔ وہ اس قدر اکھڑ ہو گا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اپنے روم میں بھی وہ اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جانے کیوں اس کی سوچ کی طنابیں ادھر ہی جاتیں جہاں سے وہ فرار چاہتی۔ اس کی خوابیدہ امنگیں جاگنا شروع ہوئیں۔ آشفتہ سر جذبے کچھ ایسے ابھرے کہ اس کی ہستی کو ہی ملیامیٹ کرتے چلے گئے۔ اس کی شخصیت کا جامع پن، اس کے دل و دماغ پر اس طرح سوار ہوا کہ وہ ہر چیز کو بھلا بیٹھی۔

"آخر میں کیوں سوچ رہی ہوں اسے۔" اسے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ اس جاں کنی کی کیفیت سے چھٹکارا پانے کی اک ہی صورت تھی، اس نے سیل اٹھایا اور ماں کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دھیان بٹا تو وہ کچھ پرسکون سی ہوئی، پر یہ سکون عارضی تھا۔ دن بہ دن اس کے سکون کو غارت کرتا وہ اس کے دل و دماغ پر قابض ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اب اس سے چڑنے لگا تھا جب وہ اس بلاتی تو پہلے تو بہانے بناتا، پھر کوئی راہ فرار نہ دیکھ کر چلا آتا، پھر چہرے پر ہزار بے زاری سمیت دل شکن تاثرات دیکھ کر اسے خود پر بھی غصہ آتا۔ آخر وہ سمجھتا کیا تھا خود کو۔ وہ جس قدر مروت دکھاتی وہ اتنے ہی نخرے، دوبارہ بات نہ کرنے کا کہہ کر وہ اگلے دن پھر کسی نہ کسی بہانے جا پہنچتی۔ اب تو وہ خود اس کے پاس جانے لگی تھی۔ وہ دو ٹوک بات کر کے ادھر ادھر ہو جاتا۔

اس کے زلف گرہ گیر کے اسیر بہت تھے۔ مگر اس شخص پر کچھ اثر ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس کے صبیح چہرے پر مردنی سی چھانے لگی۔ اب یہ حال تھا کہ وہ بہت بے تکے پن سے بات کا جواب دیتا۔ لیکن اس لڑکی کے آہنی عزائم اسے پیچھے ہٹانے پر تیار نہ تھے۔ خیالات کی یورش اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ چونک کر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

ابر آلود موسم میں نکلنا تو گویا خود کو جمانا تھا۔ گلوز اور مفلر پہنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس علاقے کے ایک چھوٹے سے بازار کی جانب روانہ ہوئی۔ ہلکی ہلکی برف باری شروع ہونے لگی۔ وہ اک شاپ میں داخل ہوئی۔ اپنے لیے ایک گرم شال اور ایک گرم ٹوپی خریدی، پھر ایک اور شاپ کی جانب بڑھی۔ ویلنٹائن کارڈز دیکھ کر یک دم سے وہ کچھ چونک سی گئی۔ ویلنٹائن ڈے میں تین دن ہی تو تھے یہاں آ کر وہ اس دن کو بھی بھول گئی تھی، جسے وہ ہمیشہ بہت جوش و خروش سے سیلیبریٹ کرتی تھی۔ ایک خوب صورت کارڈ اور ایک نفیس سی گھڑی لے کر اس نے رقم ادا کی۔ گاڑی تک آئی تو بے ساختہ نگاہ ریان پر پڑی وہ کسی کے ساتھ تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی ایک سیاہ چادر میں مکمل طور پر چھپی ہوئی تھی۔ وہ دونوں گفٹس شاپ سے کچھ خرید رہے تھے اک نگاہ رنج ڈال کر وہ لاک کھولنے لگی کہ اسی اثنا میں ریان کی برق پاش نظر نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پھر یک دم سے نظروں کا زاویہ بدل کر وہ پھر سے اسی لڑکی سے محو کلام ہوا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ چلی گئی۔

وہ سارا دن اک عجیب گھٹن میں گزرا تھا۔ ایک سمجھ نہ آنے والی مایوسی اور ناامیدی تن بدن پر حاوی تھی۔ تلملاہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ لڑکی جو بھی تھی بڑے استحقاق سے اس کی ہم قدم تھی۔

"کیا وہ شادی شدہ ہے؟" اک نئے تفکر نے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ اپنے اس تفکر سے چھٹکارا پانے کے لیے ہی اگلے دن وہ اس کے سر پر جا پہنچی تھی۔ سادہ شلوار سوٹ میں ملبوس وہ ہوٹل سے ملحقہ لان میں بیٹھا کسی کے ساتھ ہم کلام تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں چونک کر کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرا بندہ غالباً ڈیوٹی آورز میں تھا جو رکا نہیں، بھاگتا چلا گیا اور چونکہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اس لیے عام سے سوٹ میں ملبوس تھا۔

"کل تم کس کے ساتھ تھے۔ آئی مین بازار میں کس کے ساتھ شاپنگ کر رہے تھے۔" وہ جو بڑے غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ یک دم سے حیرت بھرے تاثرات لیے بولا۔

"کون؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟" اس کے لاعلمی والے لہجہ پر اندر ہی اندر تلملاتے وہ اپنی بے تابی چھپاتے ہوئے بولی۔

"تم اپنی مسز کے ساتھ آئے تھے۔"

"نہیں چچا کی بیٹی تھی میری۔" اچانک ایک محبت بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر در آئی تھی۔

"اوہ... میں سمجھی کہ تمہاری مسز ہے۔" اگلے ہی

پل بولی۔

"کیا تم نے شادی نہیں کی۔" اس کے سوال نے اسے ساکت کردیا۔ وہ لڑکی اس کی ذاتیات پر اتر آئی' اک ہتک آمیز خیال نے جیسے اعصاب جکڑ لیے۔ اس کے سوال کو اپنی اہانت محسوس کرتے وہ کافی رکھائی سے بولا۔

"آپ کو اس قسم کے ذاتی سوالات کے جوابات دینے کا میں پابند نہیں ہوں۔" غصہ اس ـــــ پر نچ رہا تھا۔ وہ محسوس کررہی تھی۔

"اس کا جواب کچھ اس قدر غیر اخلاقی بھی نہیں۔" پھر کچھ توقف کرکے بولی۔

"تم نے مائنڈ کیا سوری۔" اس نے معذرت کی تو وہ کچھ دھیما پڑا۔

"میں شادی شدہ نہیں ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ چل پڑا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ جانے اس میں کیا بات تھی جتنا وہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی' وہ اس سے دور بھاگتا۔ وہ کمزور پڑتی جارہی تھی۔ اسے بخوبی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتا۔

چلبلی اور مستانی ہوا نے اس کے بالوں کو بکھیر کر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹتے' وہ اک طرب آمیز مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے' بڑے دلبرانہ انداز سے قدم اٹھاتی ہوٹل کے اندرونی حصہ کی جانب بڑھی۔ وہ دن بڑا دلفریب اور رات بڑی سہانی تھی۔ اس دن اس نے اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کی تھی۔ اک ایسی زندگی جو اس مرد سے شروع ہوکر اس مرد پر ختم ہونے والی تھی۔ اس سرور نے اسے مسرور کردیا تھا۔ وہ خود سے غافل ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼
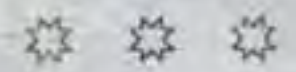
ویلنٹائن ڈے پر وہ خاص موقع کے انتظار میں تھی کہ جب وہ اسے تنہائی میں ملتا اور وہ اسے وش کرتی' جوں ہی یہ موقع ملا وہ اسے وش کرنے آئی' اس وقت وہ ریڈ پاجامہ پر ریڈ نفیس ہلکی کڑھائی والے فراک میں ملبوس تھی۔ ہلکے میک اپ نے اس کے حسن نوخیز کو ہوش ربا بنادیا تھا۔ اک کھلتے گلاب کی صورت وہ اس کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"یہ لو' یہ میں تمہارے لیے لائی تھی۔ مجھے پسند آیا تو۔۔۔" باقی الفاظ اس کے لبوں پر دم توڑ گئے تھے۔ اس اک لمحہ نے اسے مسحور کردیا تھا۔ اس مرد نے اسے بغور دیکھا تھا' صرف اک ساعت کے لیے اور وہ اک ساعت اسے اک صدی کے برابر لگ رہی تھی۔ اک عجیب سی سنسنی اس کے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

"دیکھیے میں اس قسم کے تحفے افورڈ نہیں کرسکتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری اوقات ہے نہیں کہ میں کسی کے ساتھ ان تحائف کا تبادلہ کرسکوں۔" اس کے سیدھے سچے الفاظ نے اسے بے جان سا کردیا' پھر بمشکل بولی۔

"میں تم سے تبادلہ نہیں چاہتی۔"

"اسی بات سے تو اختلاف ہے مجھے۔ میری اوقات نہیں ہے اور میں یہ بے عزتی سمجھتا ہوں کہ کوئی مجھے نوازتا رہے بعد میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے غریبی کا ناٹک کرکے سمیٹتا رہوں۔ سوری پر میں یہ سب افورڈ نہیں کرسکتا۔" بڑی بے رخی سے سب واپس کرتا وہ بڑی تلخ حقیقت بتارہا تھا۔

"اور اگر میں کہوں کہ پھر کبھی نہیں دوں گی' صرف اب کی بار۔"

"تو بھی نہیں۔" اس کی ادھوری بات مکمل کرکے وہ قطعی لہجہ میں بولا۔ اس کے لہجے کا تیکھا پن وہ محسوس کررہی تھی۔ اک واجبی سی نظر اپنے ہاتھوں میں پکڑے پھولوں اور کارڈ و گفٹ پر ڈالے وہ پر ملال قدموں سے مڑی تھی۔

کرچی کرچی دل کے ساتھ وہ اپنے روم میں آئی تھی۔ تحمل کا لبادہ اوڑھتے اوڑھتے وہ تھکنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ تہس نہس کردے' اک رنج بھری کپکپاہٹ سارے جسم پر حاوی ہونے لگی۔ وحشت کے مارے ہر چیز سے دل اچاٹ ہورہا تھا۔ منتشر ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہ رہا تو وہ باہر نکل آئی۔ اوپن ایر ریسٹورنٹ میں بھی بھاری تعداد میں لوگ آئے بیٹھے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی عروج پر تھی۔ اس کی ذات کے اندر اتنی ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسی علاقے کے چھوٹے سے پارک میں کافی وقت گزرنے کے بعد وہ واپسی کے لیے مڑی' پیچ و خم کھاتی سڑک عبور کرکے جب وہ کافی تھک گئی تو قریب کے اک ریسٹورنٹ میں کین کی چیئر پر بیٹھ کر وہ قدرے گہرے سانس لینے لگی' گھر والوں سے دوری تھی یا پھر شدید بے بسی کا احساس اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور جل تھل کی شکل اختیار کرگئیں۔ جل تھل آنکھیں مجروح دل اس کا احساس شدت بنتا جارہا تھا۔ اس مرد کے مبہم خدوخال ذہن کے کینوس سے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ دل مضطرب کسی پل قرار میں نہ تھا۔

"جی آپ کا کیا آرڈر ہے۔" ویٹر اس سے مخاطب ہوا تو چونک کر اس نے سر اٹھایا تھا۔

"ایک کپ کافی۔" ـــــ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دے کر دور پہاڑ پر پڑی سرد سفید برف کو دیکھتے ہوئے وہ جذباتی فیز سے خود کو نکالنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

وہ مرد اس کی زندگی میں آنے والا ایسا پہلا مرد تھا جس نے اس کے دیے گئے تحفے کو قبول نہیں کیا تھا۔ جب جب اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بڑی سختی سے جھٹکا تھا۔ عجیب طبیعت تھی اس عورت کی ہمیشہ اوروں کے دل دکھانے والی' آج کسی کے ہاتھوں سوختہ دل ہوئی تھی۔ کافی آچکی تھی۔ بھاپ اڑاتے مگ کو بغور دیکھتی وہ آنے والے دنوں کو سوچے جارہی تھی۔ کافی ختم کرکے اٹھی تو گویا وہ باد صبا تھی ہی نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں تصورات کا جہان۔

☼ ☼ ☼
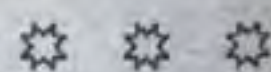
اگلا دن بالکل نارمل تھا۔ وہ اپنے معمولات نبٹا رہی تھی۔ اوقات کار میں تھوڑی بہت تبدیلی کرنی تھی جو اس نے کردی تھی۔ کچھ دنوں سے شدت کی چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سیاحوں کی آمد آمد تھی۔ بچے' بوڑھے' جوان ہر عمر کے لوگ برف باری کے شوقین چلے آرہے تھے۔ کیمرہ اٹھائے وہ بھی برف سے ڈھکے پہاڑوں کی تصویریں کھینچ رہی تھی۔ دو لڑکے بار بار اس کا پیچھا کرتے ہوئے گنگنا رہے تھے بدمزگی نہ ہونے کے ڈر سے وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی پر ان ڈھیٹوں سے گلوخلاصی نہ ہوتے دیکھ کر اس سے مزید رہا نہ گیا اور زور کا تھپڑ اک کے منہ پر دے مارا۔ لڑکے حق ودق کھڑے رہ گئے گویا ان میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ وہ مغلظات بکنے لگے۔ شور شرابے کی آواز سن کر باقی سب سمیت وہ بھی باہر آیا۔ وہ شدید طیش میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں آگ اگل رہی تھیں۔ ریان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ یہاں سے۔ عورت سے بدتمیزی کرتے ہو اور پھر رعب بھی دکھاتے ہو۔ معافی مانگو اور چلتے بنو یہاں سے۔" اس نے لمبے قد کے سوکھے بانس جیسے لڑکے سے دوٹوک سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"معافی تو یہ مانگے گی۔" دوسرا بدتمیزی سے بولا۔

"تھپڑ مارا ہے اس نے۔"

"اور اگر اک تھپڑ میں بھی ماروں تو پھر۔۔۔" دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ بڑے عام سے لہجہ میں بولا تو لڑکا کچھ گھبرا سا گیا۔

"معافی مانگو' ورنہ ابھی پولیس کو بلواتا ہوں۔" لڑکے گھبرائے اور پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر دھیرے سے بولے تھے۔

"معاف کردو بہن۔" ان کی بات پر ساتھ کھڑے لوگ ہنسے تھے۔ لڑکے تیز تیز قدموں سے چلے گئے تو وہ بھی ہوٹل کی اندرونی جانب بڑھی۔ وہ اس کے پاس سے گزرتا جانے لگا تو وہ یک دم سے اسے روکتے ہوئے بولی۔

"شکریہ۔۔۔ میری مدد کرنے کا۔" اگرچہ وہ مدد نہ بھی کرتا تو گارڈز اس مسئلے کو لمحوں میں سلجھا سکتے تھے۔ پھر جانے وہ کیوں اس کا شکریہ ادا کررہی تھی' وہ کہنے لگا۔

"یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا جو میں نے حل کیا اور آپ شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھ رہی ہیں۔ میں نے آپ کی عورت ذات ہونے کے ناتے سپورٹ کی۔ میں عورت کو قابل احترام سمجھتا ہوں۔ جب کوئی بے غیرتی دکھاتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔" وہ خفیف انداز میں مسکرائی۔

"چلیں کسی بھی حوالے سے آپ نے ہمیں قابل احترام تو سمجھا۔" اس نے مذاق کیا۔

"میں ہر عورت کو قابل احترام سمجھتا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"اور مجھے یہی بات اچھی لگتی ہے۔" اس نے بھی گویا تائید کی۔

وہ ہر روز اپنا نیا روپ اس پر اجاگر کرتا' اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ اسے کبھی کبھار ایک آسیب دکھائی دیتا جو اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا۔ جتنا وہ اس سے بھاگنا چاہتی' اتنا وہ اس کے پاس آکر اسے جکڑنے کی کوشش کرتا۔

رات بابا جان کی کال آئی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے ہوٹل سے متعلق باتیں کیں۔

"بابا جان آپ کا ایک ملازم تو بہت ایمان دار ہے۔ میں نے اسے جنرل مینیجر رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" رات کو ہی اپنے فیصلے سے بابا جان کو وہ مطلع کررہی تھی۔

"کیا نام ہے اس کا؟" بابا جان بڑے عام سے لہجہ میں بولے۔

"ریان۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ جیسے میری بیٹی کی مرضی۔ اوہ میں تو یہ بھول ہی گیا۔ یہ بتاؤ کہ تم واپس کب آرہی ہو۔ کچھ دنوں کے لیے تو آجاؤ نا بیٹا۔"

"بابا جان میں جلد ہی آؤں گی' تھوڑا مطمئن ہوجاؤں تب۔"

"اوکے بیٹا اپنا خیال رکھنا۔" بابا جان ہمیشہ کی طرح خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہیں بھولے تھے۔ جب اس نے اسے نئے عہدے کی پیش کش کی تو وہ کچھ پل کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔

"میں... مگر میں کیسے۔" وہ بے ربطگی سے بولا۔

"آج سے تم ہی یہاں کے جنرل مینیجر ہو۔ سارے ہوٹل کی ذمہ داری اب تمہارے ذمہ۔" وہ اپنی فائلز ڈھونڈ رہی تھی' جب اس کی آواز سنائی دی تھی۔

"مگر میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ میرا تو تجربہ بھی نہیں۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری کیسے سنبھال سکوں گا۔" وہ تذبذب میں تھا۔ اک گہری نظر اس پر ڈال کر وہ اپنی کرسی سے اٹھی۔ اس کے قریب جاکر چند لمحوں تک اسے خاموش دیکھتی رہی' پھر گویا ہوئی۔

"تجربہ کروگے تو قابل بنوگے۔ اگر تم اس تجربہ میں فیل بھی ہوگئے تو رزلٹ تو میرے پاس آئے گا نا۔ بس تم اپنے نئے عہدے کو جوائن کرو۔" وہ متامل رہا' پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مان گیا تھا کہ اس کی روزی اسی ہوٹل سے تھی۔ وہ اس نوکری کو لات مارنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ ایک بہترین سیلری پیکج کے ساتھ نوکری کوئی عقل سے پیدل ہی گنوا سکتا تھا۔ پہلے چند گھنٹوں کا کام تھا' اب تو کام بڑھ گیا تھا۔ سارا دن وہ چکراتا پھرتا۔ کبھی کبھار تو تنگ آکر جی چاہتا کہ جاکر اسے بے نقط سنائے اور سارا کام چھوڑ چھاڑ کر نوکری کو چولہے میں جھونک دے۔ لیکن وہ ایسا سوچ سکتا تھا' عمل کرنا مشکل تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس کی بے پناہ مصروفیت پر لطف اندوز ہورہی تھی۔ اب بھی جھنجلایا سا بیٹھا وہ اسی وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے یہ ذمہ داری لینے کی ہامی بھری تھی۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ یک دم سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا تھا۔ دل ہی دل میں مسکراتی وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ وہ کچے راستے پر اترتا دور جاتا نظر آیا۔ اگلے دن تندہی سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ دن بہ دن وہ کچھ ریلیکس ہوتا نظر آرہا تھا۔ وہ بڑی مستعدی سے سب کچھ ہینڈل کررہا تھا۔ اسے اپنے فیصلے پر کچھ ناز سا ہونے لگا۔ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے یہ ذمہ داری دی جاتی جسے وہ بخوبی نبھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے والد اس کی پیدائش سے تین ماہ قبل ہی دار فانی سے کوچ کرگئے تھے۔ وہ اک ٹرک ڈرائیور تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے ان کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔ یہ صدمہ اس کی ماں کے لیے بہت ہولناک تھا۔ لیکن وقت نے جیسے اسے سنبھالا دے ہی دیا تھا۔ وہ سب مشترکہ گھر میں رہتے تھے۔ ریان کا ایک چچا تھا جو انہیں سپورٹ کررہا تھا۔ دادی جوان بیٹے کی موت پر جیسے بکھر کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت کی چپ نے اسے بھی ہمیشہ کے لیے چپ کردیا تھا۔ ریان کی ماں پر بہت دباؤ ڈالا گیا کہ وہ دوسری شادی کرلے' لیکن وہ نہ مانی' لیکن جب خود اس کے دیور اور نندوں نے اسے راضی کرلیا تو وہ رضامند ہوگئی تھی۔ ریان کو اپنے پاس رکھ کر انہوں نے اس کی شادی کردی تھی۔

ریان اپنے چچا کے ہاں رہنے لگا۔ چچا اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چچا فیروز کے تین بچے تھے۔ بڑی بیٹی جو ریان سے چھ ماہ چھوٹی تھی اور دو بیٹے جو بہن سے چھوٹے تھے۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ وہ جوان ہوگئے۔ لڑکپن ہی سے اس نے ماہین کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کیا تھا۔

وہ بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ شاید اس لیے بھی وہ اسے بہت عزیز تھی۔ وقت کے ساتھ یہ پسندیدگی محبت میں ڈھلتی گئی۔ ماہین کی ایک ایک بات' ایک ایک حرکت سے محبت جھلکتی نظر آتی تھی۔ اس محبت نے ریان کی محرومی کے تمام زخم بھر دیے تھے۔ وہ جو باپ کے بچھڑنے اور ماں کو کھونے کے بعد مضمحل سا دکھائی دیتا تھا اب اس کے لبوں پر ماہین کی محبت مسکان کی صورت ابھرتی تھی۔

وہ دن رات ماہین کے خیالوں میں کھویا اس کی محبت کو خود میں فنا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کی محبت پاکر دن بہ دن حسین تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کے لبوں پر ہر وقت ایک نرم مسکان مچلتی جو اس کی اندرونی کیفیات کی غمازی کرتی تھی۔ گھر آکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا۔ ان کا گھر کافی بڑا تھا۔ جس میں جاپانی پھل' آلوچے' لوکاٹ کے بڑے بڑے درخت تھے۔ چار بڑے کمرے اور ان کے آگے برآمدہ' ایک بڑا صحن' ایک جانب سبزیاں لگائی گئی تھیں۔ اپنے بستر پر دراز ہوکر وہ باد صبا کو سوچ رہا تھا۔ اس لڑکی نے تو اسے بالکل پاگل کردیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی تھی۔ اسے باد صبا پر شدید غصہ آرہا تھا۔ لیکن اس کے حکم کی تعمیل مجبوری تھی۔ ایک اچھی تنخواہ کی حامل نوکری کو وہ لات نہیں مار سکتا تھا جو اسے حال ہی میں ملی تھی۔ وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر آنے کا کہہ کر وہ متوجہ ہوا۔

ماہین تھی اسے دیکھ کر خود بخود طبیعت میں بشاشت در آئی تھی۔

"آؤ۔" وہ فوراً اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ جھجک کر کھڑی رہی تھی۔

"کھانا کھاؤ گے۔"

"نہیں۔" وہ فراز کے ساتھ کھانا کھا چکا تھا۔ اس لیے نفی میں جواب دیا۔ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"کیا وہاں کھالیا ہے؟" اس کے سوال پر وہ بولا۔

"ہاں آج ادھر ہی کھا آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مڑ کر چلی گئی۔ وہ ہر وقت ہر لباس میں' ہر حلیہ میں دل کو بھاتی تھی۔ اس وقت وہ ایک سادہ گرین کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھی' لیکن اس پل وہ اسے دنیا کی حسین ترین عورت لگ رہی تھی۔ ایک دلکش مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھلی اور وہ مسکراتا ہوا بستر پر دراز ہوگیا۔

ماہین نے میٹرک تک پڑھا تھا۔ آگے پڑھنے کے لیے یہاں کالج نہیں تھا اور چچا نے اسے آگے پڑھنے کی اجازت نہ دی۔

اس لیے وہ میٹرک کے بعد سے گھر پر ہی ہوتی تھی۔ وہ دوپہر میں ایک بھرپور نیند لے کر اٹھا تو تیار ہوکر ہوٹل جانے کا قصد کیا۔ آج اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ اس لیے اس نے صبح جانے سے معذرت کی تھی۔ اب جب خود کو ذرا بشاش سا محسوس کیا تو تیار ہوکر جانے کا ارادہ کر بیٹھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا تو اس نے ماہین کو

چادر میں اپنا منتظر پایا۔

"بیٹا اس کو رضیہ کے گھر چھوڑ آؤ۔ آج اس کی منگنی ہے۔ اس نے اسے بلایا تھا۔" اثبات میں سر ہلاتا وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا چل پڑا۔ راستے میں کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی ، جسے ریان نے توڑا۔

"تم آج کل کچھ زیادہ چپ نہیں ہو۔ کیا میرے ساتھ بولنا اچھا نہیں لگتا۔ یا مجھے۔۔۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"کیا ناراض ہو مجھ سے؟" اس نے یک دم سے سر نفی میں ہلا دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"کیا بولنا زیادہ ضروری ہے۔"

"ہاں۔۔۔ تاکہ پتا چلے کہ یہ بندہ زندہ ہے۔" اس نے سنجیدگی سے مذاق کیا تھا۔ وہ چند ثانیے اس کی پشت دیکھتی رہی ، پھر بولی۔

"خاموشی کی بھی تو کوئی زبان ہوتی ہے نا۔"

"ہاں۔۔۔ بشرطیکہ زبان ہو۔" ایک بار پھر سنجیدہ مذاق۔

"سیدھا سیدھا کہو کہ چاہتے کیا ہو۔" وہ کچھ خفگی سے بولی۔

"محبت۔۔۔" رک کر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا سنجیدہ لب لہجہ بہت خاص لگا۔

"میری محبت سے تم بخوبی آگاہ ہو۔ پھر بھی پوچھ رہے ہو۔" وہ تحیر زدہ لہجہ میں بولی۔

"مجھے اظہار چاہیے۔" وہ بڑے عام سے لہجہ میں کہتا ادھر ادھر دیکھتا پھر چل پڑا۔

"اظہار ضروری نہیں ہوتا۔"

"پر میرے لیے ہے۔" وہ ڈٹا رہا۔

وہ خاموش رہی۔ چند ثانیے بعد اس نے اسے کہتے سنا۔

"میں اپنا سب کچھ ہار سکتا ہوں ، پر اپنی محبت نہیں۔ کبھی بھی نہیں اور شاید اسی ڈر کے باعث میں تم سے ہمیشہ اظہار کی طلب میں رہتا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کھویا ، لیکن میں تمہیں نہیں کھو سکتا۔ کسی صورت میں۔ میرے زخموں پر پھایا صرف تمہاری محبت رکھ سکتی ہے۔" وہ بڑے مغموم انداز میں بولا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے مردہ پتوں کی چرمراہٹ کی آواز اس نے بخوبی سن لی تھی۔ وہ جیسے چونک اٹھی تھی۔ وہ اگر ڈرتا تھا تو خوف زدہ وہ بھی تھی۔ باقی راستہ وہ خاموش رہے۔ کچے راستے سے وہ بڑی پکی سڑک پر آئے تو وہ گویا ہوا۔

"میری باتوں نے شاید تمہیں کچھ زیادہ ہی رنجیدہ کر دیا ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ دراصل میری محبت کہتی ہے۔ اس لیے میری باتوں کا۔۔۔"

"پلیز سمجھ نہ آنے والی باتیں مت کیا کرو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں تم سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"تم بے یقین کیوں ہو ، میں نہیں جانتی پر یہ انداز مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ حقیقی معنوں میں خفا ہوئی تھی۔

"زخم خوردگی کا احساس مجھے بے یقین کرتا ہے۔" وہ بولا تو اس کا شکستہ لہجہ ماہین کو تڑپا گیا۔ نادم سا تبسم ہونٹوں پر لاتے وہ بے اختیار بولا۔

"ناراض نہیں ہونا۔ میں آج کل کچھ زیادہ ہی قنوطی ہوتا جا رہا ہوں۔ اس ٹاپک کو چینج کر لیتے ہیں۔" اس نے باتوں کا رخ موڑا۔ اسی اثناء میں اسے دور سے بادِ صبا رکتی دکھائی دی۔ ریان کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ لان کے نزدیک آ رہی تھی۔ ریان کے ساتھ لڑکی دیکھ کر وہ متحیر سی رہ گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے آتے ہی خوش دلی سے پوچھا۔

"کہیں جانا ہے؟" اس نے ــــــ جواب دیا۔

"کون ہے یہ۔" اس نے ماہین کو سر تا پا دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کزن ہے میری۔" وہ ان دونوں کی گفتگو سنتی اس لڑکی سے ریان کی واقفیت کا سوچ ہی رہی تھی کہ ریان نے کہا۔

"یہ ہمارے مالک کی بیٹی بادِ صبا آج کل یہاں آئی ہوئی ہیں۔" وہ چپ ہوا تو بولی۔

"اسے کبھی لے کر آؤ نا ہمارے ہوٹل۔" بادِ صبا کی بات پر ریان کے ماتھے پر ناگوار تاثرات ابھرے تھے۔

"اس کا ہوٹل میں کیا کام۔" اس کا بھڑکنا اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

"تم نے تو مائنڈ کیا ، چلو ہم ہی کبھی مل لیا کریں گے ان سے۔" وہ چہرے پر زبردستی کی خوش اخلاقی سجاتی بولی۔

وہ حیرت سے ان دونوں کے درمیان تلخ و سرد گفتگو ملاحظہ کر رہی تھی ، لیکن اس سے زیادہ اسے اس لڑکی کا حلیہ اور بے تکلفانہ انداز بہت کھل رہا تھا۔

اس وقت وہ سیلولیس شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس تھی۔ آنکھوں پر گلاسز چڑھائے وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ اس وقت وہ عورت ہوتے ہوئے اس کے وجود سے نظریں نہ ہٹا پا رہی تھی ، تو مرد۔۔۔ وہ سوچتی رہ گئی تھی۔ اس کا بے دھڑک انداز ، اس کا بے تکلفانہ لہجہ اسے بہت کچھ کہہ رہا تھا۔

"چلو دیر ہو رہی ہے۔" ماہین نے ریان کو وقت کا احساس دلایا۔

"میں چل سکتی ہوں آپ کے ساتھ۔" جانے کیوں وہ ریان کے پیچھے پڑی تھی۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی۔

"ہاں آ جاؤ۔" ماہین نے بھی اتنی ہی خوش دلی سے کہا۔ وہ چپ چاپ ان سے آگے چل پڑا تھا ، جبکہ وہ دونوں اس کے پیچھے باتیں کرتے ہوئے آ رہی تھیں۔

ماہین ، بادِ صبا کو اس علاقے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ادھر وہ خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ بادِ صبا اس وقت کباب میں ہڈی بن رہی تھی۔ ریان کو اس بات پر شدید طیش آ رہا تھا۔ لیکن ماہین کی وجہ سے وہ ناچار خاموش تھا۔ رضیہ کے گھر پہنچ کر ماہین ، صبا کو بھی ساتھ اندر آنے کا کہہ رہی تھی۔ دل تو اس کا چاہ رہا تھا ، لیکن ریان کے ساتھ تنہائی کا موقع بھی وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بولی۔

"نہیں ، میں کافی دیر کی نکلی ہوں پھر کبھی سہی۔ اس وقت تھک چکی ہوں۔ میں واپس جاؤں گی۔" ماہین اندر گئی تو وہ ریان کے پلٹتے ہی اس کے ساتھ ہو لی۔

"غصہ آ رہا ہے نا مجھ پر۔ تمہارا ایک ایک انداز کہہ رہا ہے۔ لیکن تم یہ بھول رہے ہو کہ میں پھر بھی تمہارا پیچھا۔۔۔ چلو جانے دو ، اتنا بتا دو کہ اس وقت جا کہاں رہے ہو ، اگر ہوٹل تو گولی مارو ہوٹل کو۔ میرے ساتھ آؤ۔" اس کا ہاتھ تھام کر جوں ہی وہ ایک کچے راستے کی طرف اترنے لگی تو فوراً اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تم ایک عورت ہو ، کیوں گرا رہی ہو خود کو اتنا۔" وہ تحیر بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"تم نے مجھے گری ہوئی عورت کہا ، میں تمہیں۔۔۔"

"میں خود یہ نوکری چھوڑ دیتا ہوں۔" اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے وہ بول پڑا تھا۔

"بھاڑ میں گئی یہ نوکری۔" وہ تیز تیز چلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیوں نمی آئی تھی۔ اس نے پہلی بار خود کو کمزور پایا تھا۔ اگر وہ نوکری چھوڑ گیا تو۔۔۔ یہ احساس ہی روح فرسا تھا کہ۔۔۔ وہ فوراً اس کے پیچھے دوڑی۔

"جیسا تم چاہتے ہو میں ویسا کروں گی ، پلیز ناراض مت ہو اور پلیز تم یہ نوکری نہیں چھوڑو گے۔" اس کے ملتجی لہجہ نے اسے بالکل گم سم کر دیا تھا۔ وہ کیوں اس کی منت کر رہی تھی۔ وہ حیران و پریشان تھا۔ ایک پل کو اس کی حسین موٹی آنکھوں میں دیکھتا وہ رک سا گیا۔

"سوری ، میں کچھ زیادہ کہہ گیا۔" وہ بھی اب پچھتا رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار اس کے حسین سفید بازوؤں پر پھسل رہی تھیں۔ اس لیے تو وہ ہمیشہ اس سے بھاگتا تھا۔ اس کا پورا وجود اس کے لیے آزمائش بن گیا تھا۔

"آئندہ تم ایسے کپڑوں میں میرے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔" جانے کیوں اس کے لبوں سے یہ الفاظ پھسلے تھے۔ وہ بہکنے سے ڈرتا تھا۔ بادِ صبا ایک آزمائش بن گئی تھی ریان کے لیے۔

"ٹھیک ہے میں آئندہ وہ کپڑے پہنوں گی جو

تمہیں پسند ہوں۔" اس کی بات پر بے اختیار اس نے رخ موڑ کر اسے دیکھا، پھر چل پڑا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم میری پسند کے کپڑے پہنو۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ اس قسم کے کپڑے نہ پہنا کرو۔" اس نے وضاحت کی تو وہ گویا مرجھا سی گئی۔

ریان کی ہلکی شیو کو بغور دیکھتی، بادصبا اس مرد کی محبت میں فنا ہونے لگی تھی۔ وہ ڈوب رہی تھی۔ اس پل اسے اپنا آپ بہت بکھرتا، ڈوبتا، ٹوٹتا اور دھنستا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ بے نیازی سے اس کے دل کی کیفیت سے بے خبر اس کے ہمراہ چل رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کے قدم اس کے دل پر پڑ رہے ہوں۔ اس وقت ماحول میں سناٹے کا احساس شدید تر ہو رہا تھا۔ وہ اپنی کیفیات کو خود سمجھنے سے قاصر تھی اسی ناسمجھی میں کب اس کی آنکھیں اشکبار ہوئیں اسے پتا نہ چلا نامعلوم احساس کے تحت ریان نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو سرخ آنکھوں سے بہتے اشکوں کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

"اگر تمہیں میری بات ہرٹ کر گئی ہے تو آئم رئیلی سوری۔ میں تم سے ایک بار پھر معذرت کرتا ہوں، اگین پلیز فور گیومی۔" وہ کھلے دل سے معافی کا طلب گار تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے بولی۔

"تم نے میرا دل دکھایا ہے۔" جانے کیوں وہ ایسا بولی۔ حالانکہ اس وقت رونا اسے اپنی بے بسی پر آرہا تھا۔ وہ دل کھول کر رونے لگی اور وہ حیران و پریشان سا کھڑا اسے کچھ پل تو دیکھتا رہا، پھر بے اختیارانہ اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"اب نہیں روؤ گی۔" اس کا تحکمانہ لہجہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ تب ہی جلدی سے آنسو صاف کرتی بولی۔

"اب نہیں روؤں گی۔" اس کے بدن سے اٹھتی پرفیوم کی مہک کچھ پل کے لیے اس مرد کو ارد گرد سے غافل کر گئی تھی، پھر یک دم حواسوں میں لوٹتے ہی بولا تھا۔

"ہوٹل چلتے ہیں، دیر ہو رہی ہے۔" وہ اس کے ہمراہ چلنے لگی۔ اس وقت اس کی نظریں رستے کے بجائے اس مرد کے چہرے پر تھیں۔ جو بالکل خاموش چل رہا تھا۔ گہری سوچ سے نکل کر جب اس نے ساتھ چلتی بادصبا پر نگاہ ڈالی تو متحیر سا ہو گیا، پھر فوراً" اپنے تاثرات پر قابو پا کر بولا۔

"تم کب جا رہی ہو؟" اس غیر متوقع سوال پر وہ کچھ گڑبڑا گئی۔

"ابھی نہیں۔"

"کیوں؟ یہاں کیا خاص ہے، ان پہاڑوں میں زندگی بہت بوجھل ہوتی ہے جبکہ شہروں کی زندگی۔ وہاں زندگی میں زیادہ رعنائی و دلکشی ہے۔ یہاں تو......" کچھ پل چپ ہو کر اسے دیکھتا بولا۔

"کچھ دنوں میں ہی اکتا جاؤ گی۔" وہ جیسے اسے انفارم کرنے لگا۔

"اگر میں کہوں کہ یہاں میرے لیے بہت کچھ ہے۔ اگر......" چند ثانیے چپ رہنے کے بعد وہ پھر سے بولی۔

"اگر میں کہوں کہ میری زندگی ہی ادھر ہے تو کیا کہو گے۔"

"یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے۔" اس نے مختصر جواب دے کر گویا بات ہی ختم کر دی۔

"یہ لڑکی صرف تمہاری کزن ہے یا......" اس نے دل میں کلبلاتا سوال آخر کر ہی دیا تھا۔

"میری محبت۔" اس نے بادصبا کے منہ پر گویا طمانچہ مارا۔ وہ کچھ پل کے لیے رک سی گئی۔ اس کے دل میں ایسا کیا تھا اس مرد کے لیے، جو یہ بات سن کر وہ سن سی رہ گئی تھی۔ اپنی ہستی کو مٹاتی بولی تھی۔

"کیا بہت محبت کرتے ہو اس سے؟" اسے اپنا لہجہ خود ٹوٹا بکھرا لگا۔

"ہاں...... وہ میرے لیے کیا ہے، یہ شاید کوئی بھی نہ جان سکے حتی کہ وہ بھی نہیں۔"

"کیا اسے پتا ہے تمہاری محبت کا۔ آئی مین کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔" جانے کیوں ایک بڑے پتھر پر وہ بیٹھ گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ آگے چلنے کی سکت اس میں بالکل نہ تھی۔ وہ رک کر بولا۔

"وہ جانتی ہے۔" پھر اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"اتنی جلدی تھک گئی ہو۔" شدید آزردگی کے باعث منہ پھیر کر وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اپنی کیفیت وہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس لیے کچھ جھنجلاہٹ کی شکار ہونے لگی۔ اس کے حسین سراپے کو بغور دیکھتا وہ ایک بار پھر بولا۔

"میری محبت میں ڈوبنے سے پہلے اتنا یاد رکھنا کہ میں کسی اور کو چاہتا ہوں، بہت زیادہ۔ خود سے بھی زیادہ اور جہاں تک تمہارے ساتھ مل بیٹھنے کی بات ہے تو اس سے مجھے گریز اس لیے ہے کہ میں کوئی نیک پارسا نہیں ہوں۔ مجھے یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ تم بہت حسین ہو اور تمہیں دیکھ کر کوئی بھی مرد ڈگمگا سکتا ہے۔ میں تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے میں نے تمہیں سچ بتا دیا ہے۔ میں کمزور انسان ہوں۔ میں بہک سکتا ہوں اس لیے میں تم سے یہی کہوں گا کہ مجھ سے دور رہو۔ مجھ سے یا کسی بھی مرد سے کبھی دوستی مت کرنا وہ تمہاری قربت سے لطف تو لے لے گا، پر تمہیں محبت کی معراج نہیں بخشے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ مکمل خاموشی سے اسے سنتی رہی تھی، پر اس کی آنکھوں سے بہتے اشک اس کی اندر کی کیفیت کی غمازی کر رہے تھے۔

"یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ مجھے کسی سے ایسی محبت ہوگی، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اور پھر وہ مجھے اس قدر دھتکارے گا، محبت کے ہاتھوں میں اتنی ذلیل ہوں گی یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔" وہ سوچ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"میری باتوں سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ پر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم مرد ہوتے ہی ایسے ہیں کہ چاہیں بھی تو اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتے۔ جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ بتا رہا ہوں اور یہ سچ ہے۔" یہ کڑوی حقیقت اسے زہر سے بھی زیادہ بری محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے لٹھ مار انداز میں بولی۔

"تم ہو گے کمزور، پر میں نہیں ہوں۔ ذرا سی بے تکلفی دکھائی تو تمہارا منہ بھی توڑ سکتی ہوں۔" اس کی بات پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔ کچھ دیر تک مسکراتا وہ یک دم سے بولا تھا۔

"جب بے تکلف ہوں گا، تب دیکھی جائے گی۔" جانے کیوں وہ اس کے غصے کو انجوائے کرنے لگا تھا۔ ایک ناراض نظر اس پر ڈال کر وہ اٹھ کر چل پڑی۔ وہ ہنوز مسکراتا اٹھ کر اس کے پیچھے ہولیا۔

☼ ☼ ☼

سردیوں میں لوگ برف باری دیکھنے کافی تعداد میں آئے تھے۔ سارے رومز بک تھے، خوب گہما گہمی تھی، لوگ برف باری کو انجوائے کر رہے تھے۔ ان دنوں میں سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ ڈیوٹی آورز بڑھ گئے تھے۔ اضافی پیکج کے ساتھ۔ وہ بھی کسٹمرز کو انجوائے کر رہا تھا۔

کافی حسین طرح دار قسم کی لڑکیاں، ان کے بے باک قہقہے اور انداز سب کو لبھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو گویا اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ہر وقت اس کے پاس کھڑے ہو کر ہنسنا، باتیں کرنا اور ذومعنی قسم کی گفتگو۔ اگرچہ وہ پسند تو نہیں کرتا تھا پر چونکہ ہوٹل کی ریپوٹیشن اور اپنی عزت کا سوال تھا تو برداشت کر رہا تھا۔ اس نے نوٹ کیا تھا کہ بادصبا جب بھی اس لڑکی کو اس کے قریب کھڑا دیکھتی تو اس کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھر آتے۔ اس وقت بھی وہ ناگوار تاثرات لیے ان کے قریب آ کر بولی۔

"تم کچھ دیر کے لیے آؤ میرے ساتھ۔" ایک سخت نگاہ اس لڑکی پر ڈال کر وہ باہر چلی گئی۔ وہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اپنے آتا ساتھ دیکھ کر وہ جیسے یک دم سے پھٹ پڑی تھی۔

"تم اس لڑکی کے ساتھ کچھ زیادہ بے تکلف نہیں ہو رہے۔" اس کی بات پر وہ ہلکا سا مسکراتا بولا۔

"یہ میری ڈیوٹی ہے۔" اس کے جواب نے اسے تپا دیا تھا۔

"اگر یہ تمہاری ڈیوٹی ہے تو تم اس وقت میرے

ساتھ جارہے ہو۔" اس کے حتمی لہجہ پر وہ مسکراتا بولا۔
"اور میری ڈیوٹی کون کرے گا۔"
"وہ اجمل صاحب کرلیں گے۔ اب آؤ میرے ساتھ۔" وہ اجمل کو فون پر ہدایات دے کر اس کے ہمراہ سرسبز پہاڑ کے نشیب میں اتری تھی۔
اس کے اندر ایک کمینی سی خوشی پھوٹتی تھی، جب وہ اسے جلتا کڑھتا دیکھتا تھا تو جانے کیوں اسے اچھا لگتا تھا۔ ایک بڑے درخت کے سائے میں بیٹھ کر وہ اسے بھی بیٹھنے کو کہہ رہی تھی۔
"ماہین تمہاری محبت ہے وہ ٹھیک ہے پر میں تمہاری اور کسی کے ساتھ بے تکلفی برداشت نہیں کروں گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا، جس پر وہ مزا لیتا بولا۔
"لیکن ماہین تو مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔"
"تم میری بات کو مذاق میں لے رہے ہو۔" اس نے ملامت بھرے انداز سے کہا تو وہ بولا۔
"وہ لڑکی کچھ دنوں کے لیے آئی ہے اور پھر اگر میں کچھ غصے سے کہہ دوں تو چھوٹی بات بڑھ سکتی ہے۔ اس لیے میں اسے برداشت کررہا ہوں۔"
"جس طرح اسے برداشت کررہے ہو ویسے ہی میری محبت کو بھی برداشت کرلو۔" اس نے کچھ اس آزردگی سے کہا کہ وہ کچھ پل کے لیے بالکل خاموش رہا تھا۔
"میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ماہین سے محبت کرتا ہوں۔ اور یہ بات اٹل ہے۔" اس کے سخت اور دوٹوک لہجہ پر وہ شکستہ انداز میں بولی۔
"اور میں کیا ہوں تمہارے لیے۔"
"یہ میں نے نہیں تم نے ڈی سائیڈ کرنا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی اس فرینڈلی ریلیشن شپ کو ختم کرتا ہوں۔" اس نے جس سفاکی سے کہا اس پر وہ گویا لرز گئی۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اب ایک لمحہ اس کے بغیر رہنے کا تصور نہیں کرسکتی تھی۔
"تم ایکدم سے کیوں لڑنے مرنے پر آجاتے ہو۔"
اسے شدید غصہ آیا تھا اس کی بات پر۔
دونوں ہاتھ اپنے بالوں میں پھیر کر وہ نظریں زمین پر گاڑے کچھ گم سم سا ہوگیا۔
صبا نے اپنا ہاتھ ریان کے کندھے پر رکھا تو اس نے سر اٹھا کر صبا کی روشن بڑی آنکھوں میں براہ راست دیکھا۔ اس وقت صبا نے وائٹ پینٹ پر فل سلیوز والی لانگ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ہیئر بینڈ میں جکڑے ریشمی بال ہوا کے سنگ لہرا کر گھوم سے جاتے تو اسے اپنی جان ان بالوں میں مقید ہوتی دکھائی دیتی۔ وہ اس سے غافل ہونا چاہتا تھا پھر بھی وہ غالب آجاتی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور نہایت دھیمے لہجے میں بولا تھا۔
"دور رہو۔ کہا تھا نا میں نے۔" خجل سی ہوتی وہ برف کو ہاتھ میں لے کر بولی۔
"دور جاؤں گی تو بھول نہیں پاؤ گے مجھے۔" اس کی بات پر چند ثانیے اسے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔
"پہلے پہل تم مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ پر ہر گزرتے دن کے ساتھ تمہارے بارے میں میرے جذبات میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی صرف دوستی کی حد تک ہے۔ اسے کوئی بھی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ میں مرد عورت کی دوستی کے خلاف ہوں پر اب میں اس کا حمایتی بھی بن گیا ہوں۔" اس کے سراپے میں اس کی آنکھیں الجھ گئی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کا اسیر بن جاتا تھا۔
"کیا ہمارے بیچ دوستی کے سوا کوئی رشتہ نہیں بن سکتا؟" دل میں دبا سوال آخر لبوں پر آہی گیا۔ وہ اس کی محبت کی متمنی تھی جو وہ اسے دان کرنے پر راضی نہ تھا۔
"نہیں۔" اس کا حتمی لہجہ اسے ناگوار گزرا تھا۔ لیکن وہ خاموش رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر آیا تو اسے خلاف معمول خاموشی کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر پر صرف ماہین تھی جو صحن میں بیٹھی پالک کاٹ

رہی تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر کندھوں پر پڑا دوپٹہ اس نے سر پر اوڑھا تھا۔
"کہاں ہیں سب؟" اس کی حرکت پر سوال کرتا وہ اس کی خفت مٹاتا بولا تھا۔
"چچا نعیم کے بیٹے کی شادی پر گئے ہیں۔" مختصر جواب دے کر وہ پھر سے گویا ہوئی۔
"چائے بناؤں آپ کے لیے۔" نفی میں سر ہلاتا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے یک ٹک اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا۔
"کبھی تو میرے اور اپنے متعلق بھی کچھ کہہ دیا کرو۔ کم از کم آج تو موقع ہے وہ چار لفظ محبت کے ہی کہہ دو۔" ایک محبت بھری مسکان ہونٹوں پر سجاتی وہ سبزی کی ٹوکری ایک جانب رکھ کر اٹھی اور بے ساختہ بولی۔
"آپ کو معلوم ہے پھر وہ چار لفظ کیوں ضائع کروں۔" اس کی بات پر کھل کر مسکراتا وہ بولا۔
"اگر میں بھی ایسی کنجوسی کروں تو۔"
"تو اپنے مقدر کی بات ہوگی۔" وہ ایک مسکان ہونٹوں پر لاتے کہہ گئی۔ اس کی بات پر سنجیدہ ہوتا وہ کچھ پل اسے دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔
"مقدر سے ہی تو ڈرتا ہوں میں۔ میں تمہیں کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ کچن سے نکلتے بولی۔
"خود تو ڈرتے ہیں ساتھ میں مجھے بھی ہولا دیتے ہیں۔" ماہین کے پیچھے آتے یکدم سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے سامنے کھینچ کر کھڑا کرکے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولا۔
"اگر تم نہ ملیں نا تو میں مرجاؤں گا۔" اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس نے نمناک لہجہ میں کہا تھا۔
"یہ آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں۔" ماہین کی آنکھیں اشکبار ہوئیں تو اس کا ہاتھ ہونٹوں سے چھوتے وہ گھر سے نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن ریان سارا دن ہی بے چین مضطرب رہا تھا۔ بادِ صبا بھی اس کی بے چینی محسوس کرچکی تھی اس لیے باتوں کے دوران اس نے پوچھا جس پر وہ بولا تھا۔
"پتا نہیں کیوں مجھے کبھی کبھار لگتا ہے کہ ماہین اور میں جدا نہ ہوجائیں۔ جانے کیوں ہر وقت اس سے بچھڑنے کا خوف مجھے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تو مجھے اپنی زندگی سے ہی نفرت ہونے لگتی ہے یہ کیسی آگ ہے جس میں دن رات جل رہا ہوں۔ نہ مر رہا ہوں نہ جی رہا ہوں۔" اس کی باتیں بہت خاموشی سے وہ سن رہی تھی۔ ادھر دل کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی جس سے باخبر ہوکر بھی وہ انجان تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی تسلی کے دو بول نہ کہہ پائی تھی۔
آج گھر جاکر اسے بے پناہ خوشی ملی اپنی ماں کو کافی عرصہ بعد دیکھ کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ ریان نے ہاتھ بڑھایا جس کو نظر انداز کرکے ماں نے نمناک آنکھوں سے اسے گلے لگایا۔ کچھ پل کے بعد ماں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اسے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا کر بولی۔
"یہ کیا ہر وقت کام میں لگے رہتے ہو اپنی شکل دیکھو کتنے کمزور ہوتے جارہے ہو دن بہ دن۔" وہ ممتا سے مجبور تھی اس کی اچھی بھلی صحت اسے بہتر نظر نہیں آرہی تھی۔
"آج کل سیزن ہے نا تو اوور ٹائم کررہا ہوں اور تو کوئی مسئلہ نہیں۔" اس نے ماں کو مطمئن کرنا چاہا۔
چچا چاچی اٹھ کر باہر گئے تو اس کی ماں بولی۔
"بیٹا۔ آج تمہارے چچا اور چاچی نے مجھے ضروری کام سے بلایا تھا۔ دراصل وہ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ چونکہ تم اب شادی کے قابل ہو نوکری بھی اچھی ہے بیوی رکھ سکتے ہو تو تمہارے کیا ارادے ہیں کوئی پسند ہے تو بتادو ہم۔۔۔ بخوشی تمہاری خواہش کا احترام کریں گے۔
میں چاہتی ہوں تم اپنے چچا کا خیال رکھو ان کا حق ہے تم پر۔ اب بتاؤ کیا چاہتا ہے۔" ماں کی اتنی لمبی بات کا جواب دوٹوک ہوسکتا تھا۔
"چچا کی بیٹی۔" ماں کا چہرہ کھل گیا تھا۔ اسے بے

ساختہ چوم کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں جا کر ان سب کو بتا آؤں۔ تاکہ شادی کی تیاری شروع کریں۔" وہ دن ان سب کے لیے خوشیوں اور مسرتوں بھرا دن تھا۔ وہ سب اس دن بہت خوش تھے وہ خود بہت مسرور سا تھا ماہین کے چہرے پر الگ قوس و قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

اپنی اس خوشی کو اس نے بادصبا کے ساتھ شیئر کرنا چاہا تو اس کے پاس آیا۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے قدرے خاموش سی پر سکون جگہ پر لے آیا تھا۔ برف سے ڈھکا پہاڑ، سفید برف سے ڈھکے درخت ہر چیز اس دن اس کے لیے بہت دلفریب تھی۔

"کیا بات ہے؟ اس طرح کدھر لے کر جا رہے ہو۔" وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش میں تقریباً" بھاگتی چلی آ رہی تھی۔

"بتاتا ہوں پہلے سانس تو لینے دو۔" ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ سراپا سوال تھی۔

"میری اور ماہین کی شادی طے ہو چکی ہے۔" وہ ایک بم تھا جو اس نے اس کے اعصاب پر پھوڑا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے تو گویا بت بن گئی تھی۔

"مبارک ہو۔" جانے کس طرح منہ سے یہ الفاظ پھسلے تھے۔

"آج میں بہت خوش ہوں تم نہیں جانتیں اس دن کے تو میں نے خواب دیکھے تھے بے شمار خواب۔ میری ماں نے میرے تمام زخموں پر مرہم رکھ دیا یہ رشتہ مضبوط کر کے۔ میں شاید ہی کبھی اتنا خوش ہوا ہوں جتنا کہ آج۔" وہ آنکھوں میں نمی لیے دور نظر آتے درختوں کو دیکھ رہی تھی اس پل اس کا دل چلانے کو چاہ رہا تھا پر وہ خاموش تھی۔

"اچھا ہے کوئی تو محبت پا گیا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ کچھ چونک کر وہ اسے بغور دیکھتا ہوا بولا۔

"تم ہرٹ ہوئی ہو۔"

"نہیں۔" اس نے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں۔ تم دونوں اپنی محبت پا گئے اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی کیا بات ہوگی۔" پھر بے ساختہ اس نے گلے لگ کر کہا۔

"محبت کی یہ معراج تو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔" جانے کیوں آنکھوں سے آنسو گر کر اس کی شرٹ میں جذب ہو گئے تھے۔ بادصبا کے قرب کی تپش نے ریان کے اندر جیسے آگ سی بھڑکائی تھی وہ چند لمحوں کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ اس لڑکی اور اس میں کیا تعلق کیا رشتہ ہے۔ اگر اسے کچھ یاد تھا تو اتنا کہ وہ لڑکی زخم خوردہ ہے اور وہ پچھتایا۔ اس وقت وہ مرد اپنے آپ کو بھول کر اس عورت میں فنا ہونے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن کے بعد سے وہ اس سے کترایا کترایا سا پھر رہا تھا۔ وجہ اس دن کی اپنی بے خود کیفیت تھی کہ جس نے اسے اس لڑکی کے سامنے شرمسار کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ تعلق چند لمحوں کا ہی سہی پر وہ اس کے لیے باعث شرمندگی تھا۔ ایک دن وہ خود اس کے پاس آئی تھی۔

"ہوٹل میں روم نمبر بارہ کے بچے کی برتھ ڈے پارٹی ہے دو دن بعد۔ اس کے سارے انتظامات اپنی نگرانی میں کروانا۔" جاتے جاتے پلٹ کر ایک بار پھر گویا ہوئی۔

"میں چار دن بعد جاؤں گی۔ تم مجھے ابھی سے بھول گئے۔" یہ کہتے ہی پلٹ کر وہ چلی گئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا وہ گویا گم سم رہ گیا۔ جس دن اسے جانا تھا وہ خود اس کے روم گیا۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اجازت کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول دیا۔ اس کے سراپے پر ایک نگاہ ڈالتا وہ اندر آیا۔ وہ کچھ جھجک رہا تھا۔ وجہ اس وقت اس کا حلیہ تھا وہ شاید ابھی ابھی جاگی تھی پنک نائٹی میں ملبوس اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو اس کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ وہ عام سے انداز میں بولی۔

"بیٹھو۔" وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا جبکہ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے

بولی۔

"آج تو تم خوش ہوگے نا کہ میں جا رہی ہوں۔ بہت تنگ کیا نا میں نے تمہیں۔" اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیر کر وہ اس کے خاموش سراپے پر نظر ڈالتی بولی۔

"تم خاموش رہو گے یا کچھ کہو گے بھی۔"

"میں کیا کہوں۔" کچھ ثانیے بعد وہ بولا تھا۔

"اگر میری کسی بات سے تمہیں تکلیف ہوئی ہو یا میری کسی حرکت۔۔۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوا تو وہ بولی۔

"تم نے دوست کہا ہے نا تو پھر دوستوں میں یہ فارملٹی نہیں چلتی تمہیں مجھ سے یا مجھے تم سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب اچھے بچوں کی طرح اٹھو اور میرے ساتھ پیکنگ میں مدد کرو۔" وہ اٹھی تو اس کی تقلید میں وہ بھی اٹھا۔ وارڈ روب کھول کر اس نے اپنے کپڑے بیڈ پر ڈالے اور کہنے لگی۔

"چلو اب یہ بیگ میں ڈالو۔" بادِ صبا کی بات پر ہنستا وہ کپڑے بیگ میں ڈالنے لگا۔ اس کی تھوڑی بہت مدد کر کے وہ نیچے آیا تھا۔ تقریباً" دو گھنٹے بعد وہ بھی نیچے آئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھی تو وہ اس کے پاس آیا۔ اس کے ساتھ ہاتھ ملا کر وہ صرف اتنا بولا تھا۔

"اللہ حافظ۔" گاڑی روانہ ہوئی تو چند منٹوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ وہ دل میں نامعلوم سا دکھ لیے واپس اپنی جگہ پر آگیا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دنوں سے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ماہین اس سے کترائی کترائی پھر رہی ہے۔ وہ اگر بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بنا جواب دیے پلٹ جاتی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو جاتا۔ ایسا اب اکثر و بیشتر ہونے لگا تھا۔ جب برداشت کی حد ختم ہونے لگی تو وہ اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے پاس آیا تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھی سلائی میں مصروف تھی جب وہ اس کے پاس آیا۔ اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا تھا جسے نظر انداز کر کے وہ بولا۔

"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ تمہارا یہ عجیب و غریب رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ تم کیوں ناراض ہو مجھ سے کچھ کہو تو۔ بنا قصور کے اس طرح کا رویہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو مت کرو برداشت۔ کیا ضرورت ہے برداشت کرنے کی۔" اس کا جملہ اسے ششدر کر گیا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی اس کے ساتھ اس قسم کے انداز میں بات کی ہو۔ وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سلائی سے روک چکا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"پلیز مجھے بتاؤ تم کس بات پر ناراض ہو میں تمہیں۔۔۔"

"میں کسی بات پر ناراض نہیں ہوں اب خدا کے لیے مجھے کام کرنے دو۔" وہ سختی سے کہتی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ پھر دن بہ دن ماہین کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر ہونے لگا۔ پھر قیامت تو اس وقت نازل ہوئی جب ماہین نے ریان کے ساتھ شادی سے انکار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ سب گھر والے اس کے اس فیصلے پر حیران پریشان تھے۔ ہر ایک اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پر اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگ رہی تھی۔ جب اس نے خود اس سے بات کرنا چاہی تو اس نے تو اسے گویا لرزا کر رکھ دیا تھا۔

"میری مرضی میں جہاں شادی کروں تمہیں اس فکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ میں ماموں کے بیٹے ثاقب سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ثاقب بھی راضی ہے۔ اب اللہ کے واسطے مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے خوش ہونے دو۔ زبردستی کے سودے اچھے نہیں ہوتے۔" وہ کرخت انداز میں بولی تو وہ شاک کی کیفیت سے یکدم باہر آیا۔

"تمہیں تو مجھ سے محبت تھی نا۔ اب کیا تم اپنے وعدوں سے پھر گئی ہو۔ یا ماموں کی دولت سے تمہاری آنکھیں چندھیانے لگی ہیں۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھو۔ اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" حالات اس قسم کے ہوں گے اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ مر رہا تھا نہ جی رہا تھا۔ وہ اب حقیقی معنوں میں خود کو پاگل ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ اضطراب اور دکھ کی شدت نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس کا غمگسار کوئی نہ تھا جو تھا وہ اب نہ رہا تھا۔ وہ مرقع اضطراب بنا زندگی کے اس مذاق پر شدید مضمحل تھا۔

☼ ☼ ☼

سب اپنی سی کوششیں کر کے تھک گئے پر اس کی نہ ہاں میں نہ بدلی۔ چچا اسے شرمندگی و ملامت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"بیٹا جانے کیا ہوا اچھا بھلا خوش تھی کہ اچانک۔۔۔ میں۔۔۔ اس نے تو میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہا۔" وہ آزردہ تھے۔ اس نے تسلی دی۔

"چچا قسمت کی بات ہے۔ شاید ہماری تقدیر کے ستارے ہی نہ ملتے ہوں۔ اسے وہی کرنے دیں جو وہ چاہتی ہے ہمیں اس کی خوشی میں خوش ہونا ہے۔" پھر ایسا ہی ہوا۔ اس کی مرضی سے اس کی شادی ماموں کے بیٹے سے کر دی گئی۔ جس دن اس کی بارات تھی وہ چھت پر لیٹا رو رہا تھا۔ شاید ہی وہ کبھی اتنا رویا ہو شادی کے سارے کاموں میں اس نے خود حصہ لیا تھا۔ لیکن رخصتی کے وقت وہ اسے کسی اور کے ہمراہ جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ چھت پر لیٹا اپنی محبت کے جنازے پر ماتم کناں تھا۔ اسی چیز سے ہی تو وہ ڈرتا تھا۔ اس کا ڈر حقیقت میں بدلے گا اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ جب پہلی دفعہ میکے آئی تو بہت نکھری اور خوش لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ گماں ہی نہ ہوتا تھا کہ اس نے کسی کی محبت کی سیج اجاڑ کر اپنی سیج سجائی ہے۔ اس کے ساتھ بھی اس کا رویہ عام سا تھا جیسے ان کے بیچ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھا تھا گھر سے باہر چلا گیا۔ پھر ایسا ہی ہوتا تھا جب بھی وہ گھر آتی وہ گھر سے باہر چلا جاتا۔ اسے دیکھ کر محبت کے زخم سے رستے خون کا احساس شدید ہو جاتا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش تھی۔

ان خزاں رسیدہ دنوں میں بادِ صبا بہار کا جھونکا بن کر اس کی زندگی میں آئی۔ اسے دیکھ کر اسے اپنا حال دل سنا کر اسے حقیقتاً" خوشی ہوئی تھی کوئی تو تھا جسے وہ اپنے دل کا حال سنا سکتا تھا۔ اس کی باتیں سن کر وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گئی چند لمحے خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئی۔

"زندگی محبت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ جینا تو پڑتا ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے دلاسا دے رہی تھی۔

"تم دوبارہ کیسے آئیں؟ تم نے دوبارہ آنے کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"بس یہاں کے پہاڑ بھلا کسی کو اپنے سحر سے نکلنے دیتے ہیں ان کا سحر مجھے کھینچ کر لے آیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اتنے دنوں بعد وہ دونوں ملے تھے۔ کرنے کے لیے ان کے پاس ڈھیروں باتیں تھیں۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا وہ جب بھی بادِ صبا سے ملتا تو ایک سکون سارگوں میں سرائیت کر جاتا۔ شاید یہ فطرت انسانی ہے کہ اسے ہمیشہ ایک ہمدم کی ضرورت رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ زندگی کے رعنائیوں کی طرف واپس آنے لگا اسے زندگی اچھی لگنے لگی تھی انہیں پرفسوں دنوں میں ایک دن بادِ صبا نے اس سے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم۔۔۔ ہم شادی کر لیں۔" اس کی بات پر وہ کچھ پل کے لیے سن رہ گیا۔ اس نہج پر اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کے درمیان زمین و

آسمان کا فرق تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔" اس کا لہجہ دھیما تھا۔

"ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اگر تم چاہو۔" اس کی بات پر وہ بولا تھا۔

"میں اور تم۔ بہت فرق ہے ہم میں۔ تمہارے گھر والے نہیں مانیں گے۔" اسے یقین تھا تبھی اتنے یقین سے کہہ رہا تھا۔

"مانیں گے۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس بات کا مکمل اختیار دیا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کسی کو بھی لائف پارٹنر بناؤں۔"

"نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔ پھر ہر دن وہ اسے منانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگی۔ وہ اسے اپنے اور اس کے بیچ کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف محبت کے واسطے دینے لگی۔

"اور اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو۔" ایک دن ریان نے تنگ آکر پوچھ ہی لیا۔

"یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔ بس تم ہاں کرو۔" پھر ایسا ہی ہوا۔ گھر والے تو اس کی پسند کے انتظار میں تھے یہ چھوٹ بھی باپ کی طرف سے ملی تھی۔ اعتراض کا کوئی پہلو نہ نکلتا تھا۔ سو وہ شادی کی تیاریاں کرنے لگے۔ ریان نے ایک شرط بادِ صبا کے سامنے رکھی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس کے آبائی گھر میں رہے گی جسے بلا چون و چرا بادِ صبا نے مان لیا تھا۔ وہ چچا کے گھر سے اپنے گھر میں شفٹ ہوا تھا۔ سب اس کی شادی پر خوش تھے۔ ماہین کی حرکت نے سب کو شرمندہ کر دیا تھا۔ جس کی بنا پر سب اس کی شادی میں جی جان سے شرکت کر رہے تھے۔ اس کی ماں بھی بہت خوش تھی۔ ماہین نے سنا تو ایک مطمئن و آسودہ تبسم اس کے لبوں پر بکھرا تھا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ وہ رخصت ہو کر اس کے گھر آئی۔ گھر میں سوائے ان دونوں کے کوئی نہیں تھا۔ رشتے دار رخصتی کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ لہٰذا وہ دونوں رات کے اس خواب آگیں ماحول میں کمرے میں تنہا گہری چپ میں آنے والی زندگی کو خوش آمدید کہنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کا رویہ اس کے ساتھ نارمل ہی تھا جبکہ بادِ صبا دن بہ دن اس کی محبت میں مبتلا ہوئی جا رہی تھی۔ اسے اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کبھی اپنے شوہر کی اس طرح باندی بن جائے گی۔ اس کی ایک آواز پر وہ دوڑتی اس کے پاس جا پہنچتی۔ اس کے سارے کام وہ خود کرتی کیونکہ ان کے گھر میں ملازم نہیں تھا۔ وہ اس کی خواہش کے مطابق وہی کرتی جو وہ کہتا۔ اپنی مرضی خواہشات ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کے سحر میں دن بہ دن جکڑتی جا رہی تھی زندگی میں وہ کیا آیا کہ باقی ہر رشتہ اور ناتا وہ گویا بھول ہی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم تو ہمیں ایسے بھول گئیں جیسے تم کبھی اس گھر میں پلی بڑھی ہی نہیں۔ بھلا ایسے بھی ماں باپ کو کوئی بھولتا ہے۔ کتنا عرصہ ہوا تمہیں ہمارے ہاں چکر لگائے۔ کیا تمہیں میری یاد نہیں آتی۔" اس کی امی اس کے آنے سے ناامید ہو کر خود ہی ملنے چلی آئی تھیں۔ اب اس کے سامنے بیٹھی گلے شکوے کر رہی تھیں۔

"امی پلیز خفا نہ ہوں۔ یقین کریں کچھ دنوں سے میں آنے کا سوچ رہی تھی پر ریان چونکہ دیر سے آتے ہیں اس لیے پروگرام نہ بن سکا آنے کا۔ میں ان شاء اللہ کچھ ہی دنوں میں آؤں گی۔ بابا خفا تو نہیں تھے نا۔" کچھ لمحے بعد جب باپ کا خیال آیا تو وہ پوچھ بیٹھی تھی۔

"نہیں۔ بھلا اپنی اولاد سے بھی ناراض رہ سکتے ہیں۔ تم خوش تو ہم خوش۔ اللہ تمہیں دکھ تکلیف سے بچائے۔" وہ ماں کی محبت پر مسکراتی بے ساختہ ان کے کندھے پر سر رکھ گئی۔

"امی میں یہاں بہت خوش ہوں آپ سب میرے لیے بہت دعا کریں۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھار دل گھبرا سا جاتا ہے۔" اس کی آواز بہت دلگیر سی ہوئی تو وہ اسے تسلی دینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ہوٹل کا سارا بار ملک صاحب نے اس کے سر ڈال دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ ذمہ داری نبھانے لگا۔ بادِ صبا کو ماں باپ نے بارہا سمجھایا کہ وہ دونوں ان کے ساتھ رہیں کہ ان کا سب کچھ ان کی بیٹی کا ہی ہے۔ لیکن ریان وہاں رہنے پر رضامند نہ تھا۔ وہ جس ماحول میں پلا بڑھا تھا وہاں ایسے شخص کے لیے گھر داماد والا لفظ ایک طعنہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ سارے خاندان میں وہ ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس لیے باقی عنایت کو قبول کرنے کے باوجود وہ اس احسان سے مستفید نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے بادِ صبا نے چپ ہونے میں ہی عافیت جانی۔

شام کو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی تو وہ جلدی گھر چلا آیا۔ خلافِ معمول وہ کچھ الجھا اور بہت خاموش تھا وہ اس کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"کچھ نہیں ہوا۔" کہتے ہی وہ دوسرا تکیہ اٹھا کر کمر کے پیچھے رکھ کر بیٹھا پھر اسے بغور دیکھتا بولا۔

"آج کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ مزید بولا۔

"مجھے لگا شاید کوئی آیا ہو۔" جانے وہ کیوں الجھا تھا وہ سوچ رہی تھی۔ وہ جوں ہی اٹھنے لگی تو اس نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تھا۔

"تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے کیوں بن گئے ہیں۔" اچانک اس کی نظر اس کے حلقوں پر پڑی تو وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا تھا۔

"ویسے ہی۔" اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت کافی بدل گئی تھی۔ شادی کے بعد وہ اسے یکسر بدلی بدلی سی لگنے لگی تھی۔ ایک عجیب سی بردباری اس کی شخصیت کا خاصہ بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو کھوجتا پڑھتا وہ اسے اپنے قریب کرتا بولا تھا۔

"میں نے بہت حسن دیکھا ہے لیکن یہ حسن میرے لیے ہے اس لیے اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ کیا سوچتی ہو جو یہ حلقے سے پڑ گئے۔ کیا مسئلہ ہے بتاؤ مجھے۔" وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا گمبھیر لہجے میں بولا تھا۔ اس کی ذرا سی توجہ پا کر وہ بے خود سی ہو جایا کرتی تھی اس وقت بھی اس کا دل اس بات کا متمنی تھا کہ وہ یونہی اس کی فکر میں مبتلا اپنی محبت کا اظہار کرتا رہے اسے ساری دنیا سے لاتعلق کر دے۔

"بتاؤ نا کیا سوچتی رہتی ہو۔" استفسار طلب لہجہ اسے مزید بے خودی سے روک گیا۔

"میں پتا نہیں ہر وقت کیا سوچتی ہوں۔ میں خود کبھی کبھار تنگ آجاتی ہوں اپنی سوچوں سے۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے تنگ نہ آجاؤ۔ کہیں تم مجھے چھوڑ نہ دو۔ یا پھر ہم جدا نہ ہوں۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ میں ایسی غلط باتیں نہ سوچوں پر باوجود خواہش کے میں ایسا کر نہیں پاتی۔" اس کا متفکر لہجہ اس کے اندر کی کشمکش کا غماز تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"تم سارا دن گھر پر اکیلی ہوتی ہو اس طرح کی فضول سوچیں تو آئیں گی۔ سب سوچوں پر لاحول پڑھ کر اس وقت صرف اور صرف مجھ پر اور خود پر توجہ دو۔ آئندہ میں تمہارے یہ حلقے نہ دیکھوں مجھے فریش اور حسین بیوی چاہیے۔ سمجھیں نا تم۔" اس وقت تو وہ مسکرا دی تھی لیکن یہ تفکرات اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

چچا فیروز کی فیملی نے ان کی دعوت کی تھی۔ آج شام وہ دونوں تیار ہو کر ان کے گھر چلے آئے تھے چونکہ وہ اس انتظار میں تھے کہ داماد بھی اس دعوت میں شرکت کرے اس لیے انہوں نے کچھ عرصہ تک دعوت ملتوی کر دی تھی۔

شام کو تیار ہو کر وہ دونوں چل دیے تھے۔ راستے بھر وہ خاموش ہی رہا تھا چپ چاپ اس کے ہمراہ جاتے ہوئے وہ مسلسل اسی کو سوچ رہی تھی۔ اس کی خاموشی کی وجہ وہ جانتی تھی اس لیے مزید کرید نہیں سکی۔ چچا

کے گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی ماہین بھی شوہر کے ہمراہ آئی تھی۔ سب بڑی خوشی سے ملے۔ وہ کمرے میں ثاقب کے ساتھ باتیں کر رہا تھا جب ماہین نے اندر آکر اسے سلام کیا۔ چونک کر اس نے مڑ کر اسے دیکھا تھا پھر اتنی ہی تیزی سے نظریں ہٹا کر سلام کا جواب دیا تھا اس وقت ریان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا وہ شوہر کے برابر والی کرسی پر بیٹھی اور بادصبا کے ساتھ باتیں کرنے لگی تھی وہ دونوں سرگوشیوں میں مصروف جانے کیا رازونیاز کر رہی تھیں۔ ریان کو بادصبا کا اس سے اتنا فری ہونا پسند نہ آیا۔ جانے کیوں اسے غصہ آرہا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے بالکل بات نہ کرے۔ اس کے اندر عجیب سی بے چینی اور جھنجلاہٹ در آئی۔ ثاقب کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ سمجھ ہی نہ آرہی تھی' اسے اس قدر مطمئن وشادمان دیکھ کر جانے کیوں جلن کا احساس ہوا تھا۔ ماہین نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ریان تم بادصبا کو خوش تو رکھتے ہو نا۔" اس کا غیر متوقع اور قدرے ذاتی سوال اس کے لیے کچھ پل کے لیے پریشانی کا باعث بنا تھا۔ وہ کوئی مناسب اور تیکھا جواب دینا چاہتا تھا کچھ پل کے لیے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے یہ خوش نہیں ہے۔" جانے کیوں اس کا لہجہ خود بخود تلخ ہوا تھا۔

"لگنے سے اصل بات کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔" وہ بھی دوبدو بولی تو وہ بے ساختہ بول پڑا۔

"ہاں بالکل اصل میں چھپے نقل سے کوئی باخبر نہیں ہوتا۔" اس کی بات پر وہ چپ ہوئی تھی دوسری جانب بادصبا کا رنگ بھی کچھ بدل سا گیا تھا۔

"چلو بیٹا آؤ کھانا لگ گیا ہے۔" چچا کی بروقت آمد نے کچھ تلخی ختم کردی تھی وہ کھانے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور ہوا۔ چائے کے دوران وہ مکمل بے نیاز بنا چائے پیتا رہا۔ البتہ وہ دونوں ایک بار پھر کھسر پھسر میں مصروف ہوگئی تھیں۔

"تمہیں تو بعد میں دیکھوں گا۔" بادصبا کو دیکھ کر دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ چائے ختم کرتے ہی وہ سرعت سے اٹھا۔

"چلو دیر ہو رہی ہے۔" بادصبا پر آئے غصہ کو دباتے وہ سنجیدگی سے بولا۔ وہ اٹھی تو ماہین نے بے ساختہ کہا۔

"اتنی جلدی کچھ دیر تو رک جاتے۔" اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے اس نے براہ راست چچا کو مخاطب کرکے کہا۔

"چچا صبح ہوٹل بھی جانا ہے اس لیے اب چلیں گے۔" اجازت لے کر وہ چچا کے ہمراہ گھر سے نکلا جبکہ بادصبا سب سے مل کر نکل آئی۔

"ماہین اتنا اصرار کر رہی تھی کچھ دیر تو رک جاتے۔" اس کی بات پر تپتا دماغ بھلتی آگ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

"اگر تمہیں اتنا شوق ہے تو جاؤ رات ان کے گھر ہی بتاؤ۔" پھر کچھ پل بعد دوبارہ جھلتے انداز میں بولا۔

"یہ تم کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں اس کے ساتھ۔ مجھے اس سے نفرت ہے اگر آئندہ تم نے اس سے اس طرح بات کرنے یا فری ہونے کی کوشش کی تو میں تمہیں بھی اس کے گھر چھوڑ آؤں گا۔" اس کا غضبناک لب ولہجہ اسے عرق ندامت میں ڈبو گیا۔ گھر آکر بھی اس کا موڈ ہنوز خراب ہی رہا تھا۔ اس نے کئی بار معذرت کی پر ادھر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔

"اگر وہ میرے ساتھ بات کر رہی تھی تو مجھے بھی اس کے ساتھ بات کرنی پڑی۔ اب اگر میں نہ کرتی تو۔۔۔"

"نکلو یہاں سے۔" زخم خوردگی کا احساس اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنی کیفیت خود نہ سمجھ پا رہا تھا۔

"آئندہ وہی کروں گی جو تم کہو گے پلیز اب تو ناراضی ختم کرو۔" وہ رو پڑی۔ اس وقت اس کی حیثیت ایک ادنیٰ باندی کی سی تھی جو شہنشاہ کے قدموں میں پڑی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو۔ بادصبا جیسی عورت کے لیے عشق کا یہ انجام مقام حیرت تھا۔

"کہا نا تم چلی جاؤ یہاں سے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اپنے سینے پر دھرے اس کے ہاتھ کو پرے ہٹاتا وہ قہر آلود

لہجہ میں بولا۔ اتنی اہانت پر بھی اس کے ارادے کی پختگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی وہ ہنوز قریب بیٹھی اس بے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی پھر بے ساختہ اس کے گلے لگ کر بے تحاشا رونے لگی۔

"آئندہ میں اس سے بات نہیں کروں گی۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ پلیز مجھے معاف کردو۔" وہ منتیں کر رہی تھی۔

بادصبا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا عشق اسے اس مقام تک لائے گا کہ وہ اپنے شوہر کے سامنے گڑگڑائے گی۔ فریاد کرے گی اس کی ذرا سی ناراضی اس کی جان لینے کے درپے ہو جائے گی۔ وہ اپنی انا اپنی خودی کو ملیامیٹ کرتی اس کی دلجوئی میں لگ گئی۔

☼ ☼ ☼
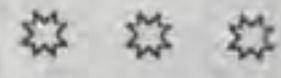
صبح بے دار ہوا تو بھی سر بوجھل بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ رات جس کرب کی کیفیت سے سارا وجود دوچار رہا تھا اس نے پورے وجود کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ رات کی باتیں جب ذہن کے کینوس پر بکھریں تو سب کچھ یاد آیا۔ وہ ہنوز لیٹا رہا کافی دیر بعد اٹھ کر واش روم گیا نہا کر نکلا تو سیدھا کچن میں آیا تھا۔ وہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی اسے دیکھ نہ پائی تھی اس کا پورا دھیان آملیٹ کی تیاری پر تھا۔ اس کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے اب بھی گر رہے تھے۔ وہ جو بے ساختہ مڑی تو اپنے پیچھے کھڑے ریان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی پھر خاموشی سے چائے کپوں میں ڈال کر ٹرے میں رکھنے لگی۔

"میں ہوٹل نہیں جا رہا۔" وہ اب بھی جھنجلایا ہوا تھا اس کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا۔ اسے کوئی جواب نہ دیتے دیکھ کر وہ مزید بولا۔

"میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں جو سب کچھ میرے حوالے کرکے بڑے آرام سے وہاں بیٹھا مزے لے رہا ہے۔"

"میں چلی جاتی ہوں۔" اس نے اس کے موڈ کو دیکھتے ہوئے خود جانے کا قصد کیا۔

"تم اب اس کی بیٹی نہیں میری بیوی ہو۔ اب باپ کے کاروبار کی فکر چھوڑ دو۔" ____ وہ کل سے جس کیفیت کا شکار تھا اس سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔ لہٰذا بڑی خاموشی اور صبر سے اس کی باتیں برداشت کر رہی تھی۔

"اپنے باپ سے کہو وہ خود آئے اپنے کاروبار کو سنبھالے۔"

"یہ سب کچھ ہمارا ہی تو ہے۔ اگر ہم نہیں دیکھیں گے تو۔۔۔"

"میرا نہیں ہے۔ جس کا ہے وہ جانے۔ اور مجھے لالچ مت دو۔ میں لالچی نہیں ہوں سمجھیں تم۔ میں نے شادی کی ہے تو تم سے تمہارے باپ کی دولت سے نہیں۔ اس کا رعب مجھ پر مت ڈالو۔" ریان نے آج تک اس طرح کی باتیں نہیں کی تھیں پر آج وہ غصہ اور جھنجلاہٹ میں جانے کیا کیا کہہ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے دولت کے لالچ میں شادی نہیں کی تھی۔ اس کے مجبور کرنے پر کی تھی۔

"ناشتا نہیں کرو گے۔" اس نے باتوں کا سلسلہ توڑا۔

"نہیں۔" اس نے درشتی سے کہا۔

"میں بابا سے کہہ دوں گی وہ آجائیں گے اپنا کاروبار سنبھالنے اب تو ناشتا کرلو۔" اس نے رندھے لہجے میں کہا۔ ناشتا کرکے ریان اس نے اس پر گویا احسان کیا تھا۔ وہ دیر تک ٹی وی کے سامنے بیٹھا مختلف پروگرامز دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ لیکن دھیان اسی کی طرف تھا وہ ریان کی بدتمیزی کو سہہ رہی تھی یہ اس کی مجبوری تھی وہ اس کی کوئی ناراضی نہیں مول لے سکتی تھی۔ کام ختم کرکے وہ اس کے پاس آئی۔ وہ اس سے بے نیاز چینل سرچنگ میں مصروف تھا۔ ریان کا اسے نظر انداز کرنا اسے برا تو لگا پر وہ کچھ نہ کہہ پائی۔ بس خاموش اسے دیکھتی رہی رات کا ملال اب تک اس کے چہرے پر موجود تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن میں اس کے رویے میں کافی فرق آیا تھا وہ

خود سے ہی ہوٹل بھی چلا گیا جس پر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا ورنہ ان دنوں میں تو اس کی جان ہی نکل گئی تھی۔ بابا جان نے کچھ عرصہ بعد خود چکر لگایا تھا۔ دو دن زبردستی اس نے انہیں اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔ وہ دن بڑے مصروف گزرے تھے ہوٹل سے واپسی پر وہ بھی انہیں کمپنی دیتا تھا۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے وہ آپس میں باتوں میں مصروف تھے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر وہ سونے چلے گئے وہ بھی چونکہ تھکا ہوا تھا اس لیے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا تھا۔ کچن سمیٹ کر وہ بھی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ بستر پر دراز وہ اپنی طبیعت میں ہونے والی تبدیلی پر سوچے جا رہی تھی۔ کچھ دنوں سے اسے اپنی طبیعت میں عجیب تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی کیفیت جب اس نے ریان کے سامنے بیان کی تو وہ بادصبا کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ان کے ہاں نیا مہمان آنے والا تھا اس خبر نے جہاں بادصبا کو خوش کر دیا تھا وہاں ریان بھی مسرور تھا۔

شب و روز اپنے معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔ وہ اس کا خیال رکھتا تھا وہ بھی خود سے لاپروا نہ تھی اپنی صحت کا خیال رکھ رہی تھی۔ ہوٹل کی ساری ذمہ داری اس کے سپرد تھی جبکہ بقیہ کاروبار فتح خان خود ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی بیٹی کے گھر آنے والی پہلی خوشی پر مسرور تھے۔ وہ دن بھی آن پہنچا جب اسے بیٹی کی نوید سنائی گئی۔ زندگی اس طرح تبدیل ہو کر رہ جائے گی اسے خبر نہ تھی۔

ژالے اس کی زندگی کی ایک نئی دلچسپی تھی وہ اس کا ہر کام خود کرتی۔ خود اپنے ہاتھوں سے اسے سنبھالنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کا ڈائپر چینج کر کے وہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلی تو ریان کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بابا چلے گئے۔" وہ اس کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ بابا جان آج کچھ نئے ارینجمنٹ کے حوالے سے بریف کرنے آئے تھے وہ اسی کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

"ہاں چلے گئے۔ کچھ دن بعد ہو سکتا ہے کہ دوبارہ ایک چکر لگا لیں۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" اس نے سیدھا لیٹتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"تم نے گھر آنے کا نہیں کہا۔" اس کی بات پر ہلکا سا مسکرایا۔

"نہیں۔ ہماری پرائیویسی خراب ہوتی۔" اس کی شرارت سمجھ کر وہ بھی مسکرائی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم شہر میں رہیں۔" اس نے دلی خواہش بیان کی تو وہ بولا۔

"تم چلی جاؤ۔ پر میں نہیں جاؤں گا۔" دوٹوک فیصلہ سن کر وہ بھی خاموش رہی۔ پھر کچھ توقف بعد بولی۔

"میں کچھ دنوں کے لیے امی کے ہاں جاؤں۔" آج اتنے عرصے بعد اسے کسی خواہش کا اظہار کرتا دیکھا تھا اس نے۔

"ہاں چلی جاؤ۔" اس نے بھی بلاتردد اجازت دے دی تھی۔ پھر کچھ دنوں کے لیے وہ چلی گئی۔ گھر کچھ ویران سا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ معمول کے مطابق ہوٹل جاتا اور پھر رات دیر سے گھر آکر سو جاتا۔ گھر کی خاموشی وحشت زدہ سی کر رہی تھی۔ اسی وحشت سے گھبرا کر ریان نے بادصبا کا سیل نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر تک اس سے باتیں کر کے دل و دماغ تروتازہ ہو گیا۔ اگرچہ بچی ڈھائی مہینہ کی تھی، پر وہ بھی شدت سے یاد آرہی تھی کہ جیسے وہ اس کا ہمیشہ سے عادی رہا ہو۔

اگلے دن سنڈے تھا۔ وہ صبح دیر تک سوتا رہا تھا۔ جب اٹھا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اپنے لیے چائے بنا کر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ پرانا اخبار اٹھا کر باہر صحن میں چلا آیا۔ کرسی پر بیٹھ کر وہ ورق گردانی کرنے لگا کہ گیٹ سے کوئی اندر آیا تھا۔ کھٹکے کی آواز پر ریان نے سر اٹھا کر دیکھا تو یک دم سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے کافی عرصہ بعد دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ قریب آکر اس نے سلام کیا تو وہ چونک اٹھا۔ اس کے سلام کا جواب دے کر اس نے اسے سامنے پڑی کین کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تھا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟" اس کی محویت کو ماہین کی آواز نے توڑا تھا۔

"نہیں بادصبا ماں کے گھر گئی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی الفاظ اس کے منہ سے پھسلے تھے۔

"اوہ پھر تو میں غلط وقت پر آئی ہوں۔" وہ کچھ متاسف انداز میں بولی۔ وہ اسے بغور دیکھنے لگا تھا۔ وہ پہلے سے صحت مند اور کچھ نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ ریڈ ویلوٹ پر بلیک شال اوڑھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دل میں درد کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ درد زہر بن گیا۔

"تم کیسے آئیں یہاں۔" وہ اچھا میزبان نہیں ثابت ہو سکتا، وہ خود سے کہہ رہا تھا۔

"سنا ہے کہ اس گھر میں ایک ننھی پری آئی ہے، اس کی مبارک باد کے لیے چلی آئی۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ اس کی مسکراہٹ اب اسے زہر لگا کرتی تھی۔

"کیوں تکلیف کی آنے کی۔ تم خوش ہو ہماری اس خوشی میں، ہمیں اس کی آگاہی ہو جاتی۔" اس نے کچھ مشتعل سے لہجہ میں کہا تھا۔

"تم اب بھی ناراض ہو مجھ سے۔" اس کے لہجے کی حلاوت نے اسے کچھ حیران سا کر دیا ایک لمحہ کو، جسے دوسرے ہی لمحے نظر انداز کر کے وہ زہرخند انداز میں بولا۔

"تم نے جو میرے ساتھ کیا، کیا وہ اس قابل ہے کہ میں اپنی ناراضی ختم کروں۔ تم نے تو مجھے جیتے جی مار دیا تھا۔ تم نے جو دھوکہ کیا میرے ساتھ وہ تو قیامت تک میرے دامن سے لپٹا مجھے تمہاری دغاباز فطرت کی یاد دلاتا رہے گا۔ زندگی برباد ہو جاتی میری اگر اس لڑکی کا ساتھ نہ ہوتا میرے ساتھ۔" اب کی بار وہ کچھ چلانے کے انداز میں بولا تھا۔

وہ پہلے تو مسکرائی، پھر پُرسکون سے انداز میں بولنا شروع ہوئی۔

"دھوکہ میں نے کیا تمہارے ساتھ یا تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا۔" اس کی بات کاٹتا وہ بولا۔

"جھوٹ مت بولو۔ کم از کم آج تو مت بولو۔ اتنی ڈھٹائی سے تم اپنے گناہ پر پردہ مت ڈالو۔" اس کی بات نے جیسے ڈنک مارا ہو۔ وہ اچھل پڑی تھی۔

"میں نے گناہ پر پردہ ڈالا؟ یا تم گناہ گار ہو۔ تم جیسا دوغلا تو میں نے اپنی زندگی میں کوئی نہیں دیکھا۔ میری محبت کا دم بھرتے تھے اور رنگ رلیاں اوروں کے ساتھ مناتے تھے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے تھی ایسی آلودہ زندگی پر۔ اگر آج میں یہاں آئی ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ مجھے اس لڑکی سے ہمدردی تھی، جس کی زندگی تو تم نے برباد کر ہی دی تھی۔ میں تو یہ دیکھ کر خوش تھی کہ چلو تم نے اپنے رشتے کو جائز حق دیا، ورنہ میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔" اس کے الفاظ نے اس کی گویائی سلب کر لی تھی۔

"میں نے اس لڑکی کی زندگی برباد کی تھی۔" وہ بے یقینی سے دیکھتا سوالیہ انداز میں چلایا تھا۔

"میں نے اس کی زندگی بنائی ہے محترمہ۔ غلط الزام مت دو ۔۔۔۔۔ تم۔"

"ایک کنواری لڑکی کے ساتھ غلط تعلق قائم کرنا ہمارے ہاں کی نہیں یورپ و مغرب کی ریت ہے۔ تم ایک غلط تعلق کو جائز ثابت مت کرو۔" وہ بھی اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔ وہ غصے سے لال بگولا ہوتے ہوئے اٹھا اور چلاتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس لڑکی کے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا، تم اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے جھوٹ مت بولو۔"

"میں نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری تصویر تک دیکھ چکی ہوں میں، جب تم بادصبا کے ساتھ عشق کی انتہا پر تھے۔ تم کس حد تک گئے اس عشق میں، مجھے سب معلوم ہے۔" وہ بے یقین نگاہوں سے تکتا دھیمے لہجے میں بولا۔

"کس نے کہا ہے تم سے۔ یہ سب کس نے کہا ہے۔"

"بادصبا نے۔ اس نے مجھے تمہاری اور اپنی تصویر دکھائی تھی جو اس کے موبائل میں تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم کس حد تک جا چکے ہو اس پیار میں۔"

"یہ سب اس نے کہا تھا۔" اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ بادصبا اس کے ساتھ یہ سب کر سکتی ہے۔

"ہاں اور اسی وجہ سے میں نے شادی سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ میں اس لڑکی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تمہاری غلطی کی سزا اسے کیوں ملتی اور تمہیں اسے اپنا تا دیکھ کر میں بہت مطمئن ہو گئی تھی پر تم۔" وہ چند ثانیے توقف کرکے پھر سے بولی۔

"پلیز اس کی قدر کرو۔ وہ بھی کسی کی بیٹی ہے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھی اور اسے حیران پریشان چھوڑ کر چلی گئی۔ جبکہ وہ زلزلوں کی جھٹکوں میں تھا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ یہ سب کر سکتی ہے۔ اس نے سوچا تک نہ تھا۔ اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگی تھیں۔ وہ شدت غم سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی اپنے ساتھ بہت زیادتی کر گئی تھی۔ اب اس کی زندگی ویران ہونے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شدت غم نے کچھ پل کے لیے اسے بے حس کر دیا تھا۔ اس کا مخدوش ذہن قسمت کے اس مذاق پر مرقع اضطراب بنا ناقابل یقین حقیقت کو جھٹلانے کی سعی کر رہا تھا۔ خیالات کا تلاطم' ذلت آمیز احساسات اس کی ہذیانی کیفیت کو بڑھا رہے تھے۔ وہ لڑکی اس کی زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کر سکتی ہے' اس کا خون کھول رہا تھا۔ ماؤف دماغ جیسے پھٹنے کو تیار تھا۔ اس حالت میں وہ چکراتا پھر رہا تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلتی گزری تھی۔ قرار کسی پل نہ آ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا کیے وہ پیٹ کے بل لیٹا اپنی محبت کے اس احمقانہ انجام پر ماتم کناں تھا کہ کمرے میں وہ اسی کے قریب آ رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسرے میں ژالے کو تھامے وہ اس کے پاس آئی تھی۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ۔" اس کی آواز اسے زہر لگ رہی تھی۔ اسے اس وقت وہ لڑکی دنیا کی سب سے زیادہ قابل نفرت شخصیت لگ رہی تھی۔ اس کے وجود میں کوئی حرکت نہ پا کر وہ ژالے کو بیڈ پر لٹا کر اور بیگ فرش پر رکھ کر اس کے پاس آئی۔ اس کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

"رات کو سوئے نہیں۔" کوئی رد عمل نہ پا کر اسے کندھے سے ہلا کر مزید بولی۔

"ناراض ہو گیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تین دن رہوں گی۔ اب اتنی ناراضی کیوں۔" یکلخت اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر سے دور ہٹاتا وہ اٹھ بیٹھا تھا اور متورم آنکھوں سے قہرمانہ انداز میں چیختا بولا۔

"ماہین کو تم نے اپنے اور میرے تعلق کا بتا کر شادی سے روکا تھا۔ ہاں یا نا۔" وہ صرف ہاں یا نا میں جواب طلبی کر رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کی بات سن کر شاکڈ رہ گئی تھی۔

"بولو جواب دو مجھے۔" وہ چلایا تھا۔ اس پر جنون کا عالم طاری تھا۔ ریان کی غیر متوازن سانس باد صبا کے خوف کو مزید بڑھا رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے عمیق کھائیاں نظر آ رہی تھیں' جس میں وہ منہ کے بل گرتی اور اسے تھامنے والا کوئی نہیں تھا۔ یادوں کا جھکڑ ذہن کو شکنجے میں جکڑ رہا تھا۔ اس مرد کی گرجتی آواز اسے برف سی ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا خونخوار لہجہ اسے ہولا رہا تھا۔ فرار کی کوئی صورت نہ رہی تو وہ خفیف آواز میں بولی تھی۔

"ہاں۔" یک لفظی جواب اس کے دماغ پر کسی کاری ضرب کی طرح لگا تھا۔ اس کے لہجے کا تیکھا و ترش پن اسے عرق ندامت میں ڈبو گیا تھا۔

"تو پھر یہ جان لو کہ تمہاری خوشیوں کے اتنے ہی دن تھے۔ تم نے میری خوشیوں کی سیج پر سیج سجائی تھی' اب اس سیج کی ویرانی کا مزا بھی چکھو۔" اس کا لہجہ باد صبا کو بت بنا گیا۔ یک دم سے جیسے وہ حواس میں لوٹی۔

"پلیز ریان' تم میرے ساتھ کچھ برا نہیں کرو گے۔ میں نے جو بھی کیا تھا وہ صرف تمہاری محبت میں۔"

"میری محبت کو نیست و نابود کر کے' میرے کردار کو داغ دار کر کے تم اپنی محبت کی جیت پر سرشار ہوتی رہی ہو۔" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر کے آنکھوں میں دنیا جہان کی خشونت لیے بولا۔

"میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ میں بھی تمہاری زندگی میں آگ لگا دوں گا۔ نہ مرو گی' نہ زندہ

رہو گی۔ ساری عمر تڑپتی رہو گی۔ کیونکہ جو اوروں کی زندگی ویران کرتے ہیں وہ خود بھی مٹ جاتے ہیں۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ میں تمہیں تنہا چھوڑوں' تاکہ ساری زندگی تم روز مرتی رہو اور جیتی رہو تو اپنے اعمال کا گناہ تمہیں روز مارتا رہے گا۔" وہ اسے دھتکارتا چلا گیا۔ وہ چیختی رہی' چلاتی رہی۔ پر تہی دامن رہ گئی۔ ریان اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی کروٹ لے کر اس طرح بدلی کہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی۔ وہ کیا گیا جیسے سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا۔ سوختہ دل لیے جان کنی کی کیفیت میں مبتلا وہ اس سیلن زدہ عمارت میں ٹھہر نہ سکی۔ اپنی اس دگرگوں حالت کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ اضمحلال بھرے دن اس نے خود اپنے نصیب میں لکھے تھے۔ اگر وہ دو دلوں کی جدائی کا باعث نہ بنتی' تو آج وہ اس قدر مغموم نہ ہوتی۔ ژالے کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی۔ وہ ریان کو بھلا نہ پا رہی تھی۔ گھر والے پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے۔ ہونٹوں پر چپ کا قفل لگائے اس نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ بابا جان اس کا دل بہلاتے اشاروں میں وہ بھی پوچھنے کا جتن کر چکے تھے۔ سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ زندگی کے بے کیف دن اور وحشت بھری راتیں گزر رہی تھیں۔

کچھ عرصہ تک تو وہ گھر میں ہی مقید رہی تھی۔ پھر بابا جان کے پرزور اصرار پر فیکٹری جوائن کر لی۔ ژالے کی نگہداشت کا سارا فریضہ وہ خود ہی انجام دیتی تھی۔ دن بھر فیکٹری اور ورکرز کے درمیان رہ کر جو تھکاوٹ جسم و دماغ پر حاوی ہوتی تھی۔ وہ گھر آ کر ژالے کو دیکھ کر جیسے رفع ہو جاتی تھی۔

صبح سے بادلوں کے بگولے آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش برسنے لگی' گلاس ونڈو سے بارش کے قطرے دیکھ کر وہ کچھ کھو سی گئی۔ اچانک اٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آئی تھی۔ دکھ کی دبیز تہ اس کے چاروں اور پھیل گئی ــــ نڈھال سی کیفیت' زنگ آلود خیالات اسے کہاں سے کہاں لے گئے تھے۔

"اس برستی بارش میں دل کرتا ہے کہ تم گھر پر ہی رہو۔ ہوٹل نہ جاؤ پلیز۔" ریان کو تیار ہوتا دیکھ کر باد صبا نے روکنا چاہا۔ کڑکتے بادل اور رم جھم برستی بارش اس کی کمزوری تھے۔

"تمہارے باپ کو پتا چلا تا کہ میں تمہارے آئے دن کے بہانوں سے گھر پر ہی پایا جاتا ہوں تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔"

"ان کی فکر نہ کرو' تم آج چھٹی کر لو نا۔" وہ بار بار منت سماجت کر رہی تھی۔ لیکن اسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر ایک مکا اس کی کمر پر مار کے خاموش ہو گئی۔

"میم مے آئی کم ان۔" غفار کی اجازت طلبی نے اسے سوچوں کی دنیا سے نکالا تھا۔

"ہاں آ جاؤ۔" وہ واپس سیٹ کی طرف آئی۔

☆ ☆ ☆

رات کو بستر پر دراز وہ ریان کے جانے' اس سے جدائی اور اپنے اکیلے پن کا حساب و کتاب کر رہی تھی۔ اس سے ایک دن جدا رہنا اس کے لیے سوہان روح تھا اور وہ پورے ڈیڑھ برس سے اس سے دور تھی۔ باد صبا کی دنیا بہت محدود تھی۔ جو کہ ختم ہو کر اپنی بیٹی تک رہ گئی تھی۔ آس و نراس کی کیفیت میں مبتلا وہ ریان کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے پاس چلا آئے گا۔ کیونکہ وہ اس سے محبت نہیں عشق کرتی تھی۔ اس کا عشق چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے پاس آئے گا۔ اس آس پر وہ جی رہی تھی۔ ملنے ملانے والوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ سب اس کی بے اعتنائی پر شکوہ کناں تھے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ بابا جان ایک نئی فیکٹری لگا رہے تھے۔ جو غالباً کسی دوسرے شہر میں تھی۔ فیکٹری کا سارا کام مکمل کر کے بابا جان اس کے حوالے کر گئے تھے۔

بابا جان کے ایما پر وہ رضامند ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی رہائش بھی اسی شہر میں اختیار کر لی تھی۔ ژالے

اب سوا تین سال کی تھی۔ ایک اچھے اسکول میں اس کا ایڈمیشن کروادیا۔ فیکٹری سے واپسی پر وہ ژالے کو لینے خود جاتی تھی۔

اتنے بڑے گھر میں آپا کے ساتھ وہ دونوں خاموش زندگی جی رہی تھیں۔ اکثر ژالے کو لے کر وہ شام کسی قریبی پارک میں چلی جاتی۔ ژالے بچوں کے ساتھ کھیل کر خوش اور بادصبا اسے دیکھ کر خوش ہوجاتی۔

اس شام بھی وہ پارک کے بینچ پر بیٹھی ژالے کو کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ خزاں رسیدہ پتے ایک ایک کرکے گرتے جارہے تھے۔ وہ سوچوں میں گم اپنی زندگی کے نشیب و فراز سوچے جارہی تھی۔ اس نے جو ماہین اور ریان کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی معافی تو اس کے لیے تھی ہی نہیں، پر ریان نے جو سزا اسے دی تھی وہ اسے جیتے جی مارنے کے لیے کافی تھی۔ کوئی موسم، کوئی چیز اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ لاتی۔ اسے اپنا آپ ایک جیتا جاگتا پتھر لگتا۔ پتوں کی چرمراہٹ نے اسے متوجہ کیا۔ اس کی نگاہ ژالے پر پڑی۔ زمین پر بیٹھی وہ مٹی کے گھر بنارہی تھی۔ ایک ایسا ہی گھر تو اس نے بھی بنایا تھا، مگر آبلہ پائی مقدر ٹھہری۔ وہ سوچ رہی تھی اس کے درد کا درماں کوئی ہے بھی یا نہیں۔ یادوں کی بھنبھناہٹ ایک شور سا برپا کرنے لگی تو خفیف سی گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ جس سے گھبرا کر وہ ژالے کو پکارنے لگی۔

”ژالے کم آن۔“ ژالے سوالیہ نگاہ سے تکتی اٹھی اور اس کی جانب بھاگتی آئی تھی۔

”ما اتنی جلدی کیوں؟“

”کم آن اٹس ٹو لیٹ۔“ وہ منہ بسورتی چل پڑی تھی۔ خزاں رسیدہ پتے ان کے قدموں تلے چرچرا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ماہین شاکڈ تھی۔ جو کچھ وہ اسے بتاگئی تھی، اسے سن کر کوئی بھی ایساری ایکٹ کرسکتا تھا۔ شدت حیرت سے وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

”بادصبا تم نے ہمارے ساتھ یہ کیوں کیا تھا؟“ اس کے سوال نے یا شاید گلے نے اسے لاجواب کردیا تھا۔

”میں نے ریان پر دھوکہ دہی و دغابازی کا الزام لگایا۔ اسے قصوروار سمجھا۔ جبکہ وہ بے گناہ تھا۔ تم نے تو مجھے بھی گناہ گار کردیا۔ تم نے ہم دونوں کی زندگی اجاڑ دی۔ کیوں کیا ایسا تم نے۔“ وہ رونے لگی۔

”ہم دونوں نے تمہارے ساتھ کچھ برا تو نہیں کیا تھا۔ اتنا بڑا الزام لگایا تم نے اس پر۔ بنا گناہ کیے وہ میری نظر میں قصوروار ٹھہرا۔“ وہ جس جذباتی فیز سے گزر رہی تھی۔ اسے اس سے آگاہی تھی۔

”میرا ضمیر مجھے کسی پل قرار لینے نہیں دیتا، تب ہی آج ساڑھے تین سال بعد میں تمہارے پاس معافی مانگنے آئی ہوں۔ پلیز تم مجھے معاف کردو۔“ وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ بادصبا رو رہی تھی۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھیں رندھا لہجہ اضمحلالی کیفیت، مغموم انداز اس سے منتجی تھا۔

”میں کون ہوتی ہوں تمہیں معاف کرنے والی۔ معافی تو ریان سے مانگو کہ جس کے کردار پہ تم نے الزام لگایا تھا۔ میرا تو اتنا بگڑا یا نہیں تم نے تو اسے جیتے جی مار دیا۔ مار دیا اسے جیتے جی۔“ وہ رو رہی تھی اور کہے جارہی تھی۔

اس سوگوار ماحول نے سکوت سا بھر دیا تھا اس پل میں۔ آج جو وہ ہمت کرکے آئی تھی کہ اپنے گناہ کو ماہین کے سامنے تسلیم کرے گی تو یہ سامنا بھی کرلیا۔ اب اس کے ضمیر پر اتنا بڑا بوجھ نہ رہا جو پچھلے ساڑھے تین سالوں سے تھا۔ اگرچہ وہ ریان کی بڑی گناہ گار تھی، لیکن اپنے گناہ کو قبول کرکے وہ قدرے ریلیکس بھی ہوگئی تھی۔ وہ خود کو شدید نفرت کے قابل سمجھتی تھی۔

”ریان اب کہاں ہے؟“ ماہین کے سوال نے اسے مضطرب کردیا تھا۔

”وہ تو یہ حقیقت جان کر ہی چلا گیا تھا۔ جانے کبھی آئے گا بھی یا نہیں۔“ اس کے ہاتھوں میں کپ لرز گیا تھا۔

”مجھے پتا ہے کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔“ کپ

ٹیبل پر رکھ کر وہ شدت سے رونے لگی تھی۔ ماہین کے لہجے کی تھکن نے احساس زیاں بڑھادیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اعتراف جرم اگرچہ بڑا جان لیوا تھا، پر روح کو ہلکا پھلکا کرگیا تھا۔ واپسی پر وہ کچھ بوجھ لیے بنا خالی الذہن سی اپنے معمولات نبٹا رہی تھی۔ دن بہ دن کام بڑھ رہا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی تندہی سے مصروف تھی۔ پر اپنے آپ اپنے لباس و آرائش سے وہ خلاف فطرت بالکل لاپرواسی ہوگئی تھی۔

آج وہ جلدی دفتر پہنچی تھی کہ بہت ضروری کام تھے۔ ان میں سے ایک تو اپائنٹمنٹ تھی۔ آفس کا دروازہ کھول کر وہ سیدھی اپنی کرسی کی طرف آئی۔ آفس بوائے کو بلوایا تھا۔

”سر غفار کو بھیجو۔“ کچھ فائلز اٹھا کر اس نے دیکھنی شروع ہی کی تھیں کہ غفار صاحب آگئے۔

”یس میم۔“ وہ اندر آیا تو سر اٹھا کر اس نے کہا تھا۔

”آج کی کوئی اپائنٹمنٹ۔“

”یس میم میں بھیجتا ہوں۔“ کچھ ہی دیر بعد کوئی اندر آیا تھا۔ بلا ارادہ فائلز پر سے اپنا سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر یکبارگی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی آنے والا بھی تحیر زدہ سا رہ گیا پھر اچانک سے مڑا تھا اس سے پہلے کہ وہ نکلتا بادصبا بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی اس کی راہ مسدود کرکے سامنے کھڑی ہوئی۔

”جانے دو مجھے۔“ وہ غرایا تھا۔

”میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔ پلیز اک دفعہ میری بات سن لو۔“

”جانے دو مجھے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ فیکٹری تمہاری ہے تو میں کبھی ادھر نہ آتا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہاری اس فیکٹری پر۔“ اس کا خونخوار لہجہ اسے آگ برساتا محسوس ہورہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتا وہ یکدم سے دروازہ بند کرگئی۔

”خدا کے لیے صرف ایک بار میری بات سن لو۔ صرف اک بار میں۔“ وہ ملتجیانہ لہجہ میں کہتی رو پڑی تھی جبکہ وہ اسے سامنے سے ہٹاتا دروازہ کھولتا باہر نکلا تھا۔ وہ بھی بنا سوچے سمجھے پیچھے چلی آئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے عمارت سے نکلتا چلا گیا۔ غفار کو انٹرکام پر بلوا کر اس نے اسے پیچھا کرنے کو کہا تھا اگلے دن وہ تمام معلومات سمیت موجود تھا۔

”میڈم وہ اس بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہے۔“ پورا پتا ایک چھوٹے سے کاغذ پر درج تھا۔

اگلے دن وہ اس کے فلیٹ پر موجود تھی۔ بیل بجا کر وہ انتظار میں کھڑی تھی کہ دروازہ کھلا۔ بادصبا کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ پھر اپنے تاثرات چھپاتا قدرے کرخت انداز میں بولا تھا۔

”چلی جاؤ میرا پیچھا مت کرنا، میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔“ اس نے بنا کوئی بات سنے دروازہ بند کردیا۔ پھر ایسا کئی دن تک ہوتا رہا۔ وہ جاتی اور پھر خالی ہاتھ واپس آتی۔ ریان اس کی کوئی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ اس شام بھی جب وہ نکلا تو وہ کھڑی تھی۔ وہ اسے کھڑا چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور جب رات گئے واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ وہ اسی طرح اس کے فلیٹ کے دروازے کے ساتھ بیٹھی اس کا انتظار کررہی تھی۔ اسے نظر انداز کرتا وہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی بولا۔

”اندر آؤ۔“ اس کی بات پر شکر بجالاتی وہ اندر آئی تھی اتنے عرصہ بعد بھی وہ نہیں بدلا تھا۔ لاؤنج میں کھڑی اسے جوتے اتارتے دیکھ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس کی آواز ابھری تو وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”میں تمہاری کوئی صفائی نہیں سنوں گا بس اتنا بتادو کہ تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔ اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو میں یہ شہر بھی چھوڑ دوں گا۔ سمجھیں تم۔“ اسے جوتے اتارتے دیکھ کر وہ یکلخت اٹھی اور اس کے جوتے اتارنے لگی۔ اپنے پاؤں پیچھے کرتا وہ ذرا تیز آواز میں بولا جس میں کرختگی بھی تھی۔

”دور رہو اور جان چھوڑو میری۔“

”میں تمہاری جان نہیں چھوڑ سکتی جب تک تم

مجھے معاف نہیں کرتے میں نے غلط کیا۔ بہت غلط کیا پر کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔ میں بہت پشیمان ہوں پلیز مجھے اس ذہنی اذیت سے نجات دلا دو۔" وہ رونے لگی اس کے آنسو ریان پر کوئی اثر نہ دکھا سکے۔

"اپنے یہ آنسو مجھ پر لٹانے کے بجائے اپنی بخشش کی طلب پر بہاؤ۔ کیا سوچ کر تم نے غلط کیا ہمارے ساتھ۔ اتنا بڑا جھوٹ میرے کردار پر کیچڑ اچھالا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کر پاؤں گا۔ کبھی بھی تمہیں اب چلی جاؤ یہاں سے۔" وہ چلایا تو وہ دوڑتی ہوئی اس کے سینے سے لگی اور شدت سے رونے لگی۔ بادصبا کے جسم کی خوشبو نے ریان کی قوت گویائی سلب کرلی تھی۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ ساڑھے تین سال بعد وہ اس کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی بہت کچھ کہنے کی خواہش خاک میں ملتی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اسے خود سے الگ نہ کرپایا تھا کچھ سمے بعد وہ اسے خود سے الگ کرتا بولا تھا۔

"آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔" وہ اپنے آنسو خشک کرتی اس کے پیچھے چل پڑی۔ فلیٹ بند کرکے وہ اس کے ہمراہ اس کی گاڑی تک آیا تھا۔

"دو چابی۔" چابی اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس کے برابر بیٹھی وہ اسے بغور دیکھتی سامنے ونڈ اسکرین دیکھنے لگی تھی۔ اسے گھر تک پہنچا کر وہ گاڑی سے اترا تھا۔

"تم واپس جاؤ گے۔" اس کے سوالیہ لہجہ پر وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"ہاں۔"

"کیا ژالے سے نہیں ملو گے۔" اس کی بات پر وہ بت بنا کچھ پل کھڑا رہ گیا۔

پھر اس کے قدم خود بخود اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اپنی تذلیل سے اہم خون کی کشش تھی جو اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ شوق بےتابی عروج پر تھی وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ جانے کیوں اک جانفزا تصور نرم گداز احساسات میں بدل گیا تھا۔ وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں اس کے پیچھے چلتا جا رہا تھا۔ میڈ کے ساتھ

الجھی وہ لڑکی اس کا اپنا خون تھا چند ثانیے تک تو وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہا کیا وہ اتنا خود غرض ہو گیا تھا کہ اپنے خون کو بھول گیا تھا۔ اس سے دل اس پر ملامت کر رہا تھا۔ بچی کی آنکھوں میں در آئی حیرت دیکھ کر وہ خود آگے بڑھا تھا۔ میڈ چلی گئی۔ گلابی فراک میں وہ ایک کھلتا گلاب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرح حسین تھی وہ سحر زدہ سا اسے گود میں اٹھاتا بولا۔

"اپنے پاپا سے نہیں ملو گی۔" اس کی پشت پر کھڑی لڑکی کی آنکھوں سے اشکوں کا ہار ٹوٹ گیا تھا۔ اسے سینے سے لگائے وہ ہر چیز سے بے گانہ ہوا تھا۔

"آپ اتنے عرصہ بعد کیوں آئے۔ جلدی جلدی آیا کریں نا۔" ژالے کے جملے نے اسے نادم کردیا تھا۔ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ کر اسے گود میں ہی لیے وہ کہنے لگا۔

"اب جلدی جلدی آؤں گا پرامس۔" اسے لگ رہا تھا کہ وہ صدیوں سے اس سے دور بھٹکتا پھرا ہو اور اب اچانک اس سے ملنے کے بعد چھوڑنے کا تصور ہی جان لیوا تھا۔ وہ اس کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ اپنے سچے پیار کی مہر اس کے گالوں پر چھوڑے وہ اسے بیڈ پر لٹا کر چند پل کے لیے گویا ساکت ہوا تھا۔ پھر اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرکے مڑتے ہوئے بولا تھا۔

"میں اب جاؤں گا۔" بادصبا کی سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ مزید بولا تھا۔

"میں اپنی بیٹی سے ملنے آؤں گا پر یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے لیے ہمدردی کا کوئی جذبہ رکھتا ہوں۔ تم نے جو میرے ساتھ کیا وہ کوئی اپنے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔" اپنے مسلسل بہتے آنسوؤں کو صاف کرکے وہ خاموش کھڑی ریان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ چلا گیا تھا اس کی یہ بے التفاتی بادصبا کی جان نکال رہی تھی۔ ریان سمجھ ہی نہیں رہا تھا یہ نا سمجھی اسے بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔

☼ ☼ ☼
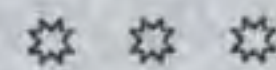
اگلی بار جب وہ آیا تو پورے دس دن بعد آیا تھا۔ لیکن خالی ہاتھ نہیں۔ وہ اس کے لیے بہت سے

کھلونے چاکلیٹ لایا تھا اگرچہ کپڑوں کی کچھ خاص سمجھ نہ تھی پھر بھی اپنی پسند سے وہ لے آیا تھا۔ ژالے یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ خاموش تھی اپنے جھوٹ کے اس انجام کا تصور تو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ اس وقت جھوٹ سچ کچھ بھی بول کر وہ اسے حاصل کرنا چاہتی تھی بعد کے انجام پر اس نے نگاہ کی ہی نہیں تھی۔

جس دن ریان، بادصبا کو اپنی اور ماہین کی شادی کی خبر دینے آیا تھا اور اس وقت جس جذباتی لمحہ کا شکار وہ ہوئے تھے اسی وقت اس نے اپنے سیل پر اپنی اور ریان کی پچھلی تصویر اگلے ہی دن بمع تصویر کے وہ ماہین سے جھوٹ کہہ آئی تھی اس نے ریان کے ساتھ اپنے "تعلق" کی من گھڑت کہانی سنائی تھی۔ ماہین نے بنا جانچے اس کی گھڑی کہانی پر بھروسہ کرکے اس سے ہمدردی دکھا کر ریان کے ساتھ اپنا رشتہ ختم کرلیا تھا۔ وہ ماہین کے سامنے روئی تھی گڑگڑائی تھی تبھی اسی کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"اس نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے۔ اس کا ازالہ میں کروں گی۔ اس نے نا صرف تمہیں بلکہ میرے جذبات کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے۔ وہ ہم دونوں کی زندگی سے نہیں کھیل پائے گا بے فکر رہو۔ اب وہ صرف اور صرف تمہارا ہی ہو گا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد تو اسے تمہیں قبول کرنا پڑے گا۔" وہ غضبناک ہو رہی تھی جبکہ وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی کہنے لگی۔

"تم وعدہ کرو کہ تم اس سے کچھ نہیں کہو گی۔ ورنہ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا وہ کہہ رہا تھا کہ کسی کو ہمارے تعلق کا پتا نہ چلے۔ تم وعدہ کرو مجھ سے پلیز۔" وہ جھوٹے آنسو بہا کر اس سے التجائیں کر رہی تھی اور اس نے اسے وعدہ کرکے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے راز کو راز ہی رکھے گی۔

یادوں کا جھکڑ کچھ اس طرح سے لپیٹ میں لے گیا کہ وہ اپنے حال تک کو بھول بیٹھی۔ ژالے ریان کی گود میں بیٹھی ایک ایک کھلونا اٹھائے کھیل رہی تھی۔ بیٹی کو دیکھتا وہ بھی خوش باش لگ رہا تھا۔ اس کے

ہونٹوں پر آئی دلکش مسکراہٹ دیکھ کر وہ کچھ پل کے لیے مبہوت سی ہو گئی تھی پھر اسے ہوش اس وقت آیا جب وہ اس کے پاس کھڑا تھا۔

"میں کچھ دنوں بعد آؤں گا اور ژالے کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اب وہ میرے ساتھ رہے گی۔" اپنی طرف سے اک بم پھوڑا تھا اس نے جس کا اس لڑکی پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اتنی جلدی ہتھیار ڈالنے پر وہ کچھ پل کے لیے حیرت کا شکار ہو گیا تھا پھر اپنی حیرت چھپاتے بولا۔

"ہمیشہ کے لیے۔"

"میں نے کہا نا ٹھیک ہے۔" اس کی آواز سے تھکاوٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ گھر آیا تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی بادصبا کے بارے میں سوچنے لگا وہ بہت بدل گئی تھی حد سے زیادہ خاموش اور گم صم سی ہو گئی تھی۔ بہت زیادہ محنت شاقہ نے اس کی حسین آنکھوں کے گرد حلقے ڈال دیے تھے، پہلے کی نسبت کچھ کمزور سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ حیران اس بات پر تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی بیٹی اس کے حوالے کرنے پر آمادہ کیسے ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی اس سے نفرت کرتا تھا اسی کی وجہ سے وہ دربدر پھرتا رہا۔

گھر چھوڑنے کے بعد وہ کس طرح اس شہر میں مارا مارا پھرتا رہا کس کس جگہ کی اسے خاک چھاننی پڑی۔ اسے یہاں سیٹل ہونے میں بہت وقت لگا تھا۔ اب جاکے وہ اس قابل ہوا تھا کہ خود ایک پر تعیش زندگی گزار سکے۔ اس کا دل ژالے کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا۔ وہ اب اپنی زندگی اس کے بنا ادھوری سمجھتا تھا۔ اس نے ایک کمرہ ژالے کے لیے ڈیکوریٹ کیا اب وہ اسے جلد از جلد اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

آج صبح ہی سے سرمئی بادلوں کا بسیرا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار برسنا شروع ہوئی تو شدت اختیار کر گئی تھی۔ اپنی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو کافی کے گھونٹ سے نگلتے وہ ژالے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج شام کو وہ اسے لانے کا ارادہ کرچکا تھا پر اتنی برستی بارش میں اس نے

اپنا ارادہ موقوف کردیا تھا۔ اگرچہ اب وہ اپنے اور اس کے بیچ مزید جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا اس لیے اپنے بے تاب دل اور مجروح شفقت کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے انتظار کر رہا تھا۔

وہ اتنی برستی بارش میں کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اس لیے ژالے کے ساتھ مل کر کچن میں میکرونی بنارہی تھی۔

"ژالے قیمہ ڈالوں یا چکن؟" فریج کھولے وہ ژالے سے پوچھنے لگی۔

"مما چکن۔" مختصر جواب دے کر وہ ٹیبل پر دھری سبزیوں کے ساتھ کھیلنے لگی جب وہ اس کے لیے کچھ بناتی تو وہ یوں ہی چھیڑ خانی کیا کرتی تھی۔

"مما سبزی کاٹوں۔" چھری ہاتھ میں لیے ژالے اس سے مخاطب ہوئی تو وہ تقریباً چیختی ہوئی بولی۔

"رکھ دو نائف کتنی دفعہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ مت کھیلا کرو۔" لپک کر اس نے چھری لے لی تھی۔ پھر بڑی تندہی سے وہ میکرونی بنانے لگی۔ کچھ سوچ کر وہ دہی لے کر چٹنی بھی بنانے لگی۔ سب کچھ تیار کرکے اس نے ٹیبل پر کھانا لگایا تھا۔ آج آیا گھر پر نہیں تھی کسی عزیز کے ہاں فوتگی ہوئی تھی اس لیے اسے سب کام خود کرنا پڑ رہا تھا۔ آیا ہوتی تو ساری مدد وہی کرتی۔ کھانا کھا کر وہ نماز عشاء پڑھنے لگی۔ ژالے کارٹون دیکھ رہی تھی نماز سے فارغ ہوئی تو وہ بھی ژالے کے ساتھ کارٹون دیکھنے بیٹھ گئی۔ اس کا سیل بجنے لگا تو وہ اٹھ کر سننے لگی۔ دوسری جانب مما تھیں۔

"بیٹا تم تو ہمیں بھول ہی گئیں کب چکر لگاؤ گی گھر کا۔ دوسرے شہر جاکر تو بالکل غائب ہوگئی ہو۔ ترس گئی ہوں تمہاری شکل دیکھنے کو۔" ماں کی مغموم آواز پر وہ ایک گہرا سانس لیتی بولی۔

"میں آجاؤں گی آپ تسلی رکھیں، میں جلد آپ سے ملنے آؤں گی بس کچھ کام نبٹانے ہیں۔" بادصبا کا اکتاہٹ بھرا لہجہ اور تھکی ہوئی آواز اس کی ماں کو مزید تشویش زدہ کرگئی تھی۔

"کیا ہوتا جارہا ہے تمہیں۔ تم ایسی تو نہیں تھیں۔"

ماں کچھ سہم سی گئی تھی جانے کیوں وہ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید فکر و غم میں مبتلا ہورہی تھی۔ ریان کے جانے کے بعد تو وہ بالکل بکھر کر رہ گئی تھی۔ جہاں دیدہ ماں نے تو اسے بیش قیمت مشوروں و تسلیوں سے نوازا تھا مگر وہ اپنے دل اپنے وجود کا کیا کرتی جو اس کے اپنے بس میں نہیں رہے تھے۔ وہ ریان کی محبت میں گرفتار تھی اب اس کا وجود بھی اس کے لیے اس قدر اہم نہیں رہا تھا۔ وہ تو ہر پل ہر لمحہ اس کے ساتھ تھا۔

اگر اہم کوئی بات تھی تو وہ یہ تھی کہ وہ اسے معاف کردے۔ جانے وہ یہ کرتا بھی یا نہیں۔ وہ اب بھی دیوانی تھی اس کی اسی طرح جس طرح آج سے ساڑھے چار سال پہلے تھی مگر اب اس کی محبت میں ترجیحات بھی آئی تھیں۔ ریان کی محبت تو اس کی نس نس میں تھی لیکن یہ محبت اس کے وجود کو گھن کی طرح کھانے لگی تھی۔ فون بند کرکے وہ ایک بار پھر ژالے کے پاس آئی تھی مگر اب اس کی سوچوں کا تسلسل کہیں اور تھا۔

☆ ☆ ☆

تین دن مسلسل برستی بارش آخر رک گئی تھی چمکیلی دھوپ کے نکلتے ہی وہ ژالے کو لے کر باہر نکل گئی تھی۔ دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب وہ واپس آئی تو اسے ریان کے آنے کی اطلاع ملی تھی۔ تیز تیز قدموں سے وہ ڈرائنگ روم آئی تھی۔

"میں ژالے کو لینے آیا ہوں۔" اس کے اعصاب پر بجلی گراتے وہ بولا تو بظاہر خود کو پرسکون رکھتے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"کیا آج کے دن تم اسے رہنے دوگے؟" اس کے ملتجیانہ انداز پر وہ بڑی رکھائی سے بولا تھا۔

"نہیں۔" پھر کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

"میں آج سے تین دن پہلے آتا مگر بارش کی وجہ سے انتظار کرنا پڑا۔ اب میں مزید تاخیر نہیں کرسکتا۔" اس کے دوٹوک انداز پر وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس آئی تھی۔

"تم آج ہمارے ساتھ رک سکتے ہو۔" اس کی بے تکی فرمائش پر وہ تلملاتا صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ اپنی بیٹی کو لینے آیا ہوں۔"

"کیا صرف آج کی رات نہیں رک سکتے۔ صرف آج۔ پھر آئندہ کبھی تنگ نہیں کروں گی میں پرامس کرتی ہوں۔ صرف آج۔" وہ رونے لگی اور اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے تھے۔

"صرف آج تاکہ آج میری بیٹی ایک بھرپور زندگی کا لطف لے سکے۔ صرف آج۔ پھر تو تم اس کو لے ہی جاؤ گے آج اسے ایک مکمل زندگی بھر لمحہ جینے دو۔" وہ منت سماجت پر آگئی تھی کچھ پل کے لیے وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا تھا۔

"صرف آج کی بات ہے۔ اور یہ بھی میں اپنی بیٹی کے لیے مان رہا ہوں۔" جانے کیوں وہ اس کی ہر بات مانتا جارہا تھا۔ اک طرب آمیز حیرت اس کے چہرے پر ابھری تھی۔ مایوسی و ناامیدی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ اک سنجیدہ خاموشی اور ملگجا سا اجالا ابھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اک برق پاش نظر بادصبا کے چہرے پر ڈالے وہ اس صوفے پر دراز ہوگیا تھا۔ تبھی وہ اس جامد خاموشی کے سکوت کو توڑتے ہوئے بولی تھی۔

"اگر آج میں تم سے کچھ مانگوں تو تم دوگے۔ میں بہت گناہ گار سہی پر یہ بھی تو سوچو کہ میں تمہاری بیٹی کی ماں ہوں کیا اس ناتے بھی میرا اتنا حق نہیں بنتا کہ میں تم سے کچھ کہہ سکوں جسے تم سن لو۔" وہ ہنوز روئے جارہی تھی۔ "میں نے سزا جھیلی ہے اور جھیل رہی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں نے بڑا گناہ کیا ہے۔ میں تم سے ریکوسٹ کرتی ہوں کہ تم ژالے کو کبھی نظر انداز مت کرنا۔ تم بے شک شادی کرلینا پر میری بیٹی کے ساتھ ناانصافی مت کرنا۔ میں اسے تمہارے سہارے چھوڑ رہی ہوں۔ تم کبھی بھی اس کی بابت غفلت یا کوتاہی نہیں کروگے۔" وہ شدت سے آئے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے مسلسل کہے جارہی تھی۔ وہ جانے کیوں کچھ عجیب سا فیل کرنے لگا تھا۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں میں نے اچھا نہیں کیا پر تم میری بیٹی کے ساتھ کبھی برا نہ کرنا۔ میں تم سے کچھ نہیں چاہتی بس میری بیٹی۔۔۔" کچھ پل کے توقف کے بعد وہ دوبارہ روتی ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم ڈرو مت، میں تمہیں بور نہیں کروں گی بس صرف اپنی تسلی۔۔۔" اس کی ناسمجھ آنے والی باتیں اس شخص کو عجیب سراسیمگی میں ڈال رہی تھیں۔ وہ جس کرب سے رو رہی تھی وہ اس شخص کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اب اس کا رونا ہچکیوں کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ غیر اختیاری طور پر وہ اٹھا اور اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"اگر میں اسے لے جارہا ہوں تو میں اس کا خیال بھی رکھوں گا۔ اس بات کے لیے تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ میرا خون ہے اور میں اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔۔۔" اس کی ہچکیاں تیز ہورہی تھیں جانے کیا ہوا کہ وہ اپنے پر قابو نہ پاسکا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے کے گرد پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا گیا۔ اس کی ہچکیاں بجائے کم ہونے کے اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ اس کے سینے میں منہ چھپائے وہ پچھلے ساڑھے تین سالوں کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ وہ بھی اسے روتے دیکھتا رہا۔ اچھی طرح رونے کے بعد وہ چپ ہوگئی تھی۔ وہ غیر محسوس انداز سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا کسی غیر مرئی نقطہ کو دیکھے جارہا تھا۔ کچھ ہی پل بعد وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے آنسو صاف کرتی اس کے پاس سے اٹھی تھی۔

"میں ژالے کو دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھ کر جاچکی تھی۔ وہ رات اس نے وہیں بسر کی تھی۔ اس رات ریان کو پتا نہیں تھا کہ وہ اک قیامت کی رات تھی۔

☆ ☆ ☆

اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس رات کے بعد زندگی ہمیشہ کے لیے روٹھ جائے گی تو وہ اس رات کو ہی اپنی پوری زندگی بنالیتا۔ اک گمبھیر اداسی نے پورے گھر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا نڈھال قدم اٹھائے وہ ڈرائنگ روم آیا بوجھل بھاری آواز میں سلام کرکے وہ سامنے والے صوفے پر براجمان ہوچکا تھا۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟" سامنے بیٹھے شخص سے

نہایت دکھ بھری آواز میں بولا۔

"کچھ تفصیلات سے آگاہ کرنا تھا آپ کو۔ یہ ساری پراپرٹی وہ آپ کے نام کر چکی ہیں۔ یہ فیکٹری گھر باقی جتنی زمینیں ہیں وہ سب لیکن یاد رہے یہ وہ پراپرٹی ہے جو ان کے نام تھی باقی ملک فتح خان کی ہی ہے۔" وکیل چپ ہوا تو لڑکھڑاتے اور بے ربط لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ بیٹھیں چائے پی کر جانا۔" وہ اٹھا اور غیر متوازن چال چلتا اپنے کمرے میں آیا۔ دروازہ بند کر کے وہ قدرے تیز آواز میں رونے لگا۔ کچھ بھی تو صحیح نہیں ہوا تھا اس کے ساتھ۔ ہمیشہ ہی وہ بد قسمت ٹھہرا رہا ہمیشہ بدنصیبی اس کا مقدر ٹھہری۔ بادِ صبا نے ایسا کیوں کیا تھا اس کے ساتھ۔ وہ تو لعنت کے قابل تھا وہ اس قدر مر مٹی تھی اس پر کہ۔۔۔

اور اس نے صلہ کیا دیا اسے۔ اس نے تو اسے نفرت کرنے بھی نہیں دی۔ وہ اب ہچکیوں سے رونے لگا تھا۔

وہ ہمیشہ اس کا امتحان لیتی رہی تھی اب بھی اس نے اسے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ ژالے کی ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال کر وہ اس کا امتحان ہی تو لے رہی تھی۔ دو گھنٹوں تک خوب رونے کے بعد جب وہ تھک کر نڈھال ہوا تو دروازے پر ہونے والی دستک سن کر اٹھا تھا۔ دروازے پر ژالے تھی۔

اپنی سرخ آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے اس نے ژالے کو گود میں اٹھایا۔

"پاپا نانا جان کہاں ہیں؟" ژالے اس کے سینے سے لگے بولی۔

"وہ آپ کے چاکلیٹس لینے گئے ہیں۔" بمشکل جواب دیتا وہ اسے بہلانے لگا۔

"صاحب جی ڈاکٹر صاحبہ آئی ہیں۔" کچھ دیر میں رشیدہ آگئی تو ژالے کو اس کے حوالے کر کے ایک بار پھر وہ ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ سلام دعا کے بعد وہ کہنے لگی۔

"ملک صاحب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔

ان کے درمیان کچھ بوجھل بات چیت جاری تھی کہ ماہین آگئی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ وہ دبیز کارپٹ کو تکے جا رہا تھا۔ وہ خود سے بھی بے گانہ نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں ملک فتح خان آئے تو وہ ان کے درمیان سے اٹھ آیا۔ چابی اٹھا کر وہ گھر سے نکل آیا تھا۔

شام کے دھندلکے اندھیرے چار سو پھیلنے کو پر تول رہے تھے۔ قبرستان پر ہو کا عالم طاری تھا۔ گاڑی لاک کر کے وہ ایک قبر کی جانب بڑھا تھا اس کا ایک ایک قدم ایک ایک من وزنی ہو رہا تھا۔ قبر کے نزدیک جا کر وہ خاموشی سے کھڑا فاتحہ پڑھتا رہا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب آنسو پلکوں کی باڑ توڑ آئے تھے۔

"وہ اپنی بیماری کا کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنی اس بیماری سے سب کو بے خبر رکھا۔ اسے بلڈ کینسر تھا وہ جانتی تھی کہ اس کا بچنا ناممکن ہے کیونکہ جب اسے اپنی بیماری سے آگاہی ہوئی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔" ڈاکٹر ثوبیہ کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ شدت گریہ سے حلق تک خشک ہوا تھا۔ قبر کے سرہانے بیٹھا وہ ماتم کناں تھا۔ ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"جانے کیوں لگتا ہے کہ ہم بچھڑ نہ جائیں۔ اگر ایسا کوئی دن ہماری زندگی میں آیا تو میں مر جاؤں گی۔" اس کی کہی بات یاد آ رہی تھی۔

"مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے پر میں تو تم سے عشق کرتی ہوں نا۔ قیامت تک کروں گی۔" اس کی آواز میں سوز تھا جواب سمجھ میں آ رہا تھا۔

بادِ صبا خاک میں پڑی سو رہی تھی ریان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ اس نے اس سے کبھی دلی محبت محسوس نہیں کی تھی۔ پر آج وہ اتنا رو رہا تھا کہ ساری دنیا ہی ویران بیابان لگ رہی تھی۔ وہ تو اسے چاہتا نہیں تھا پھر کیوں؟

"ہاں میں اسے چاہتا نہیں لیکن اس سے شدید عشق کرنے لگا ہوں۔" قبرستان کے سناٹے میں اندھیرے گھل مل رہے تھے۔ ریان کے لبوں پر اعترافِ عشق تھا مگر اسے سننے والا کوئی نہ تھا۔

وہ کل بہت تھکا ہارا سا آفس سے نکلا تھا مگر اس کی بس ہمیشہ آدھے گھنٹے لیٹ آیا کرتی تھی اور اس وقت وہ اپنی روٹ کی بس گنوا چکا تھا یعنی آدھا گھنٹا انتظار۔

اور یہ آدھے گھنٹے کا انتظار وہ بس اسٹاپ پر لگے ویٹنگ شیڈ میں بیٹھ کر کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو گیا تھا۔

وہ بیٹھا تھا جب ایک تیز ہوا کے جھونکے نے اسے گدگدایا تھا یہ تیز ہوا کا جھونکا خوشبو بھرا تھا اس نے بے ساختہ سر اٹھا کر دیکھا ایک قبول صورت لڑکی ہار سنگھار سے لیس کسی کا انتظار کر رہی تھی اس کی توجہ اس کی آواز پر لگی ہوئی تھی چکیلا لہجہ۔ کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

"تم میری جان ہو مگر تم جب آفس میں اپنے اسٹاف کے سامنے مجھے عام ایمپلائی کی طرح ٹریٹ کرتے ہو تو میرا دل چاہتا ہے میں تمہارے منہ پر ہی چائے کا کپ اچھال دوں جو میں تمہارے لیے بہت پیار سے بنا کر لائی ہوں۔"

دوسری طرف کی آواز شور کی وجہ سے واضح نہیں تھی مگر اسے پتا چل گیا تھا فون پر بات کرنے والا مرد کتنا گھاگ ہے وہ بیک وقت ایک سیلری میں دو کام لے رہا تھا' آفس کی سکریٹری وقت ضرورت گرل فرینڈ بننے کو تیار تھی تو کون کافر یہ لذت ہاتھ سے جانے دیتا' وہ خود ان کاموں کا فن کار تھا اسے بیٹھے بیٹھے یکدم فون کے دوسری طرف والے مرد سے حسد محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ دور تھا مگر اس کے قریب تھا وہ قریب تھا مگر صرف اس کے خوشبو کے جھونکے کو ہی محسوس کر سکتا تھا۔

اس کا دل چاہا وہ اس لڑکی پر اپنا جال پھینکے کہ ایک مرد اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا' لڑکی ویٹنگ شیڈ کے پول سے ٹیک لگائے کھڑی تھی یکدم دور ہو گئی اسے اس نئے مرد پر غصہ آنے لگا' سارا مزا کرکرا کر دیا تھا۔

"ارے صاحب آج کا اخبار آپ نے پڑھا۔"

اس نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"اخبار میں ایسی کیا نیوز آ گئی۔"

"وہ کل ایک ٹاک شو میں ماہر نجوم آئے تھے ان کی باتوں کا تذکرہ تھا کہہ رہے تھے مایا کلینڈر کے خاتمے کا مطلب ہے دنیا کا خاتمہ۔

مگر دیکھیے سر 21 دسمبر گزر گئی کچھ بھی نہیں ہوا اب نیا سال چند دن میں شروع ہو جائے گا اور یہ لوگ لکیر پیٹتے رہ جائیں گے۔"

اس کا منہ بنا ہوا تھا یعنی مجھے تمہاری باتوں میں دلچسپی نہیں ہے مگر وہ بہت باتونی انسان تھا یکدم اس کا شانہ ہلا کر بولا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے نیا سال ہماری زندگی میں کیا نیا پن لائے گا۔"

اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"نیا پن اور ہماری زندگی میں؟ ہم جیسے لوگ بس سال گنتے ہیں سال' زندگیاں تو وہ لوگ جیتے ہیں جو روز ٹی وی نیوز میں کھڑے ہو کر کہتے ہیں برف باری..... ہو ہو بہت مزا آ رہا ہے موسم بڑا کلاوڈی ہے' مچھلی کھانے کا بھی الگ مزا ہے۔ چکن کارن سوپ' مونگ پھلی' گاجر کا حلوہ' ڈرائی فروٹ یہ سب سردی کی سوغاتیں ہیں انجوائے کریں۔"

برابر میں بیٹھا شخص اس کے ہذیان سے یکدم چپ ہو گیا تھا مگر اس دکھ کا اثر اس کے چہرے پر بھی تھا وہ دونوں ایک ہی کیٹگری میں کھڑے تھے شیڈ میں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں بچی تھی جب ایک بہت بوڑھا شخص وہاں آیا تھا ایک آدمی اٹھا تھا اور بوڑھا شخص اس سیٹ کے لیے آگے لپکا مگر ایک جوان نے اس کی وہ سیٹ غبن کر لی تھی' ہر جگہ اندھیر نگری تھی جہاں جس کا داؤ لگ رہا تھا وہ وہاں بیٹھتا جا رہا تھا حق کسی کے حصے میں نہیں آ رہا تھا سب غاصب بن کر اپنے دکھوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر مظلوم بن کر ہمدردیاں سمیٹنے اور دوسرے پر ظالم جابر کا تمغہ لگا کر خوش ہو رہے تھے بوڑھے نے بڑی حسرت سے سیٹ کو دیکھا پھر اپنی کپکپاتی ٹانگوں کو کچھ دیر بعد سیٹ پھر خالی ہوئی وہ پھر لپکا تھا مگر اس بار

بھی وہ بیٹھ نہیں سکا تھا۔

جب ایسا تیسری بار ہوا تو وہ چیخ پڑا۔

"اس سیٹ پر بیٹھنا صرف میرا حق ہے؟"

سب حیران ہو گئے تھے مگر سب سوٹڈ بوٹڈ شخص کا ساتھ دے رہے تھے آج کے زمانے میں گواہی کا معیار بھی رہ گیا تھا' ساتھ دینے کا معیار حق نہیں منفعت کا مارجن تھا' مگر زندگی میں پہلی بار اس نے اس خود غرضی سے ہٹ کر سچی گواہی دی تھی۔

"یہ سیٹ بابا جی کا حق ہے وہ یہاں کب سے کھڑے ہیں۔"

"ہاں مگر میں یہاں پہلے آیا تھا اپنے دوست کے ساتھ صرف چائے پینے اس کیفے تک گیا تھا پھر بھی میں نے سیٹ پر بیٹھنے کے لیے شور نہیں کیا اپنے نمبر کا انتظار کیا۔"

سب اس کی بات پر اسے سراہ رہے تھے۔ پھر بابا جی پر جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔

"نہیں اس سیٹ پر میرا حق ہے یہ صرف چند گھنٹے کی بات کر رہا ہے میں پورے پچاس سال سے کھڑا ہوں' میں زیادہ حقدار ہوں میں چپڑاسی سرفراز ہوں' میں چوبیس گھنٹے کھڑا رہتا ہوں۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ کوئی مجھے بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ بھی دے سکے۔"

سب یکدم ٹرانس میں آ گئے تھے صرف وہ کھڑا ہوا تھا۔

"بابا جی بیٹھ جاؤ یہ تمہارا ہی حق ہے۔"

بابا بیٹھ گیا تھا اور رو رہا تھا۔

"کل میری بیٹی مر گئی میں وہاں بھی کھڑا رہا کسی نے غریب رشتہ دار کی طرح مجھے نہیں پوچھا میری بیٹی اس کے ماموں کے گھر بیاہی گئی تھی پر بیوی کے مرتے ہی میرا ہر رشتہ ختم' کہتے ہیں تم نے کمایا کیا ہے' بچوں کے لیے کیا کیا ہے تمہاری سزا ہے تم کھڑے رہو۔

میں سزاوار ہوں۔"

اس نے بابا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آپ کے ہاتھ کانٹوں سے تاج بناتے ہیں جبران کہتا ہے کچھ نہ کرنے والے ہاتھوں کے مقابلے میں کانٹوں سے تاج بنانے والے ہاتھوں کو سلام کرنا چاہیے آپ ناکام نہیں ہو لوگوں کی سوچیں' فکریں ناکام ہیں جو ظاہریت پر باطنی روشنی کا انکار کرتی ہیں۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔

وہ لڑکی ابھی بھی پول سے کھڑی اپنے سیل فون پر باتیں کر رہی تھی۔

مایا سال کے ختم ہونے قیامت آنے کا تذکرہ کرنے والا شخص جا چکا تھا اگر جس کی جوان اولاد مر جائے اور اسے اس کا چہرہ نہ دیکھنے دیا جائے کہ وہ ان کی طرح امیر نہیں اس کے لیے تو وہی قیامت تھی' یہاں ہر شخص کی قیامت الگ تھی' نیا سال پتا نہیں کس کے لیے کیا لاتا کیا نہیں مگر آج اس نے زندگی سے ایک نیا سبق سیکھا تھا کسی کے دکھے دل پر مرہم رکھنا' انکریمنٹ سے بڑھ کر خوشی رکھتا ہے اور وہ آج اس خوشی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جا رہا تھا۔

ہر انسان کی زندگی کا نیا سال کا پہلا دن وہی ہوتا جہاں سے اس نے کوئی خوشی پائی' کوئی نئی بات سیکھی زندگی کو بدلنے والی کسی راہ پر پہلا قدم رکھا سو وہ اپنی زندگی کے نئے سال کو خوشی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خوش آمدید کہنے کا حق رکھتا تھا۔
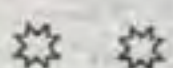
☼ ☼

فرحین اظفر

پورے سات ماہ کی مسلسل ضد کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا تھا۔

وہ کپڑے دھوتے ہوئے ۔ اٹھی اور پانی سے شرابور ٹپکتے پائنچے اور آدھے سے زیادہ تر دامن لیے حیرت اور خوشی سے وہ سفید چکنا کاغذ کھولے اس کا لفظ لفظ حفظ کر رہی تھی۔ جس میں صاف دو ٹوک اور واضح الفاظ میں اسے روزگار مل جانے کی نوید سنائی گئی تھی۔

گو کہ یہ انتظامیہ کی جانب سے اس کے لیے ایک معمولی نوکری کا پروانہ تھا۔ لیکن اس نے یوں عقیدت سے تھام کر پرس کے اندرونی خانے میں رکھا جیسے "اس کی خدمات کے اعزاز میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا ہو۔

"ثانیہ!" اسجد کی آواز پر وہ حواسوں میں لوٹی۔

اندازہ ہی نہ تھا کب سے سلاد کی پلیٹ سامنے سجائے مسکرائے جا رہی تھی۔

"کھانا ملے گا آج۔"

اسجد اس نوکری کے لیے ابھی تک دل سے آمادہ نہ تھا۔ بے حد بجھے دل سے اسے نوکری کی اجازت دیتے سمے 'ذہن میں کہیں ایک خیال یہ بھی تھا کہ دس سال پرانی بی اے پاس کو آج کل کے انگلش میڈیم' کمپیٹیشن زدہ اسکول کون سا ملازمت دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ واقعی ملازمت دے ہی دیں گے۔

مگر آج اس کی امید نے اپنی آخری کرن بھی گل کر دی تھی۔ اور اس کا بگڑنا لازم تھا ثانیہ بڑی خوشدلی سے کھانا دستر خوان پر لگا رہی تھی۔ اس کے لب مستقل مسکرا رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

اسجد تیکھی' ترچھی نظروں سے اسے دیکھتا' اندر ہی اندر تپتا ہوا' ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ وقت اکثر ہی دونوں ساتھ بیٹھ کر گزارتے تھے۔ ثانیہ کے ہاتھ کی گرما گرم چائے' ہر موڈ اور ہر موسم میں یکساں مزا دیتی تھی۔ وہ مجبوراً" سیاسی گفتگو والے۔ الزامات کی بھرمار اور جھوٹ کے پلندوں سے بھرے ٹاک شوز صرف اسجد کے ساتھ دن بھر کا کچھ حصہ بٹانے کی خاطر اس وقت تک دیکھتی جب تک کہ نیند سے تھک کر بستر پر نہ گر جاتی۔

چائے تو آج بھی حاضر تھی۔ مگر خلاف معمول ثانیہ ساتھ بیٹھنے کے بجائے الماری کھولے کھڑی تھی۔

"اب کیا کر رہی ہو۔"

"صبح کے لیے ابھی سے کپڑے پریس کر لوں۔ پہلا دن ہے۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔" اسجد سخت بے مزا ہو گیا۔ اور وہ کپڑے اٹھائے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو سنی! آپ بڑے ہو۔ چھوٹی بہن کا خیال رکھنا۔ اور ہاں واپسی میں میں' خود آؤں گی لینے۔ آپ وین میں مت آنا۔ انکل کو بتا دینا ماما نے کہا ہے۔"

دوسرے دن اسکول کے لیے بچوں کو تیار کرنے کے بعد وہ بہت محبت سے تاکید کر رہی تھی اور بچے تابعداری سے سر ہلا رہے تھے۔ وہ ممتا کے جذبات سے مغلوب ہو کر انہیں چوم بھی نہ سکی تھی کہ وین کے تڑپتے ہوئے ہارن سے گھر کے در و دیوار گونج اٹھے۔

بچے تیزی سے باہر لپکے۔ وہ آیت الکرسی کا ورد کرنے کے بعد اپنی تیاری کی طرف آ گئی۔

نئی نوکری کے پہلے دن اسجد نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح اسے اسکول ڈراپ کر دے گا۔ اور وہ واپسی پر بچوں کو لیتی ہوئی آجائے گی۔ مگر وہ اسجد ہی کیا جو وعدہ وفا کر جائے۔ اس نے جاگنے میں اتنی دیر لگائی کہ جب چادر سے منہ نکال کر مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر باہر نکل گئی۔

"کپڑے اور ناشتا تیار ہے۔" وہ سر سے پیر تک ریڈی ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم اتنی صبح تو خوشگوار ہی تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم بہار کے اختتامی دن تھے۔ لیکن اسے بس کے سفر کا سوچ کر ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ خیال

تھا کہ آج ہی کسی کنوینس کا بندوبست کرلے گی تاکہ کل کسی خواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بس جلدی آ گئی۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شکر تھا کہ سیٹ مل گئی۔ بیٹھتے ہی ذرا اطمینان ہوا تو دھیان چند دن پہلے کی نجل خواری کی طرف چلا گیا۔

دیکھا جاتا تو نوکری کوئی اس کی ایسی مجبوری نہ تھی کہ کیے بغیر گزارا ممکن نہ ہوتا لیکن ہوا یوں کہ اسجد کے بڑے بھائی کی نوکری بیٹھے بٹھائے ختم ہو گئی۔ انہیں مالی مشکلات نے گھیرا تو اسجد کو ان کی خاطر خواہ مدد کرنی پڑی۔ ثانیہ کی ساس بھی اس کے جیٹھ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایسی صورت میں انہیں صرف اسجد سے ہی امید تھی۔

اسجد نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ پھر امجد بھائی کو نوکری ملی بھی تو تنخواہ کوئی اتنی خاص نہ تھی۔ لہٰذا اسجد نے اپنی امداد سے ہاتھ نہ کھینچا۔ ثانیہ کو یہ بات بہت دیر سے کئی مہینوں بعد پتا چلی۔ بساط بھر ہنگامہ تو اس کا حق بنتا تھا۔

"سنی کا یونی فارم چھوٹا ہو رہا ہے۔ ہانی کے آنے جانے کے کپڑے ختم ہو چکے ہیں۔ آخر آپ کو نظر کیوں نہیں آتا۔" وہ دیر تک گرجتی برستی رہی۔

اسجد خاموش بیٹھا بظاہر ٹی وی دیکھتا رہا۔ اس شان بے نیازی پر ثانیہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ ٹی وی ہی توڑ ڈالے مگر یہاں بھی قسمت کی ماری تھی۔ چھوٹے سے فلیٹ میں بچوں کے لیے چند گھنٹوں کے کارٹونز کے سوا اور کوئی تفریح نہ تھی۔

"ماما! میری سائیکل کب آئے گی۔"

کبھی کبھار سنی معصومیت سے اپنی دو سالہ پرانی خواہش دہراتا تو وہ دل مسوس لیتی۔

"اسجد مجھے کرنی پڑے گی نوکری۔ ایسے تو خرچے پورے نہیں ہو سکتے۔" ٹی وی کے نشے میں دھت دیکھ کر اس نے ایک وقتی پھلجھڑی چھوڑی تھی۔ اسجد پر خاطر خواہ اثر بھی ہوا تھا۔ لیکن گزرتے دنوں نے اس کی سوچ کو استحکام بخشا اور وہ گھر سے نکل پڑی۔

حالانکہ اسجد کو اس نے کتنے جتن سے منایا تھا۔ وہ خود ہی جانتی تھی۔ مگر یہ سودا ایسا سر میں سمایا کہ پھر نکل نہیں سکا۔

کوئی مہینہ بھر پہلے اسجد نے اسے ہفتوں رلانے کے بعد کمپیوٹرائزڈ سی وی بنوا کر دیا تھا۔ وہ ایک عزم سے گھر سے نکلی اور سب سے پہلے گھر سے کافی دور ایک بڑے نام والے انگلش میڈیم اسکول میں قسمت آزمائی کو چنا لیکن بات بن نہیں سکی۔

"غلطی میری ہی تھی۔" اس نے گھر تک آتے آتے کمال فراخ دلی سے اعتراف بھی کر لیا تھا۔

ریسپشن پر بیٹھی ماڈل نما ریسپشنسٹ نے اسے دیکھتے ہی ایسی فر فر انگلش بولی کہ وہ جواب میں محض "ایں..... میں۔" کہہ کر فضا میں ہاتھ ہلاتی رہ گئی ماڈل گرل نے خود ہی اس کے ہاتھ سے سی وی اچک کر ایک احسان کرتی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس نے بے اختیار تھوک نگل کر خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی۔

"اوکے۔" آگے اس نے پھر دو جملے انگلش میں بولے۔ مگر اس قدر روانی اور فراٹے سے ثانیہ چپ چاپ دل ہی دل میں ترجمہ کرتی پلٹ گئی اور اگلے کئی دنوں تک نماز میں دعا کرتی رہی کہ اسکول سے کال نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ شکر تھا کہ اس کی دعاؤں نے شرف قبولیت پا لیا تھا۔

اگلی بار اس نے گھر سے اتنی دور اور اتنے ہائی فائی اسکول کے بجائے گھر کے قریب تھوڑے نچلے درجے کے اسکولوں کی طرف مارچ کیا۔

آس پاس کے رہائشی علاقے میں انگلش بولنے کا اتنا کریز نہیں تھا۔ اس کا حوصلہ بڑھا اور خود اعتمادی لوٹنے لگی۔ نتیجتاً" آج وہ اپنی نوکری کا پہلا دن بھگتانے کے لیے تیار تھی۔

اسکول کے معاملات ویسے ہی تھے۔ جیسے کم و بیش دوسرے اسکولز میں ہوتے ہیں۔ اسمبلی۔ پھر ٹیچرز اور بچوں کی کلاسز میں روانگی۔ پہلے دن وہ اپنے ٹرائل والے دن کی بہ نسبت بہتر پوزیشن میں تھی۔ ٹرائل کی بھی عجیب کہانی تھی۔ اور اس لفظ سے ثانیہ کے ساتھ جڑی دو چار کہانیوں کو مضحکہ خیز کہا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا

جس مرحلے کو اس نے بہت آسان سمجھا تھا وہ بہت مشکل نکلا۔

پہلے اسکول میں وہ آسان مضامین پڑھانے کی نیت سے گئی تھی۔ جیسے اردو' معاشرتی علوم' اسلامیات وغیرہ۔ مگر انہوں نے سائنس جیسے خشک مضمون کی مشکل کتاب پکڑا دی۔ حالانکہ پہلے اسے اس کی مرضی کے مطابق پرائمری کلاسز کے لیے ٹرائل دینا تھا۔ لیکن وہ کتاب.....

"یہ..... یہ فائیو کلاس کی بک ہے۔" اسے پہلے تصدیق کر لینا زیادہ مناسب لگا بس پھر اور تو کچھ نہیں ہوا۔ اس نے بورڈ پر چند ایک الفاظ ہی لکھے تھے۔

"سائنس..... پارٹیکلز وغیرہ۔"

مرحلہ سر ہوا اور باہر آ کر پتہ چلا کہ اس نے سائنس کو سائلنس اور پارٹیکلز کو پریکٹیکلز لکھ دیا ہے۔

ظاہر ہے نوکری آئے بغیر ہی روٹھی محبوبہ کی طرح واپس جا چکی تھی۔

اس سے اگلی جگہ' بچوں کو ہٹا کر ادارے کے چند سینئر اساتذہ اس کی پڑتال کرنے بیٹھ گئے۔ کپکپاتے ہاتھوں اور لرزتی آواز کے ساتھ اس نے اس کی بات کا ثبوت دینے کی کوشش کی کہ وہ ایک اچھی استاد بننے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہے۔ مگر جیوری کو اس کی ادا بھائی نہیں۔ سامنے براجمان چہروں کی دبی دبی مسکراہٹ نے حواس اڑانے میں بھرپور تعاون کیا اور اٹھتے اٹھتے ایک صاحبہ مشورے سے بھی نواز گئیں۔

"آپ پہلے مرر کے سامنے کھڑی ہو کر بولنے کی پریکٹس کریں۔" ساتھ ہی دروازے کے باہر کھڑی بوا کو آواز دی۔

"نیتی ان کو پانی پلائیں۔" وہ شرمندگی کے احساس سے وہیں جمی رہ گئی۔

چشم تصور سے باہر نکلتی ٹیچرز کو ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے دیکھنا بھی بڑے دل گردے کی بات تھی۔ اس آخری اسکول میں بھی یہی سوچ کر آئی تھی کہ اگر یہاں بھی اس کے ساتھ کوئی بونگی کہانی ہوئی تو "جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔" کے مصداق 'پورے علاقے

میں پبلسٹی سے بہتر ہو گا کہ وہ نوکری کے خیال پر لعنت بھیج کر روٹیاں تھوپنے اور جھاڑن مارنے کو ہی ترجیح دے گی۔ لیکن شومئی قسمت کہ وہ نہ صرف ڈیمو میں پاس ہو گئی بلکہ اسی وقت تنخواہ وغیرہ پر بات کر کے دوسرے ہی دن اپائنٹمنٹ لیٹر گھر پہنچا دیا گیا۔

پہلا دن مصروفیت کے لحاظ سے ہلکا ہی رہا۔ زیادہ تر کلاسز میں تعارف اور ہلکی پھلکی ڈکٹیشن سے کام چلایا گیا۔ آخری پیریڈ فری ملا اور چھٹی کے ٹائم وہ خوشی خوشی مین گیٹ کے سامنے قطار میں لگی کنوینس ٹرانسپورٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"سب سے پہلے یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے۔" اپنے تئیں وہ چٹکیوں میں مسئلہ کو ہوا میں اڑانے چلی تھی۔ مگر پہلی دو تین گاڑیوں نے صاف جھنڈی دکھا دی۔

"ہم اس طرف نہیں جاتے۔"

"ارے تو کوئی وین اس طرف بھی تو جاتی ہو گی۔ یا وہاں کے بچوں کو یہاں داخلہ نہیں ملتا۔" وہ بری طرح بھنا گئی۔ دور سے ایک صاحب چلے آ رہے تھے۔ موٹی توند خاکی شلوار قمیص۔

"وہ رشید بھائی ہیں نا - ان کی وین جاتی ہے۔"

ثانیہ ڈرائیور کو دیکھ کر بدمزا سی ہو گئی۔

"جی مس! کہاں جانا ہے۔" گاڑی کی چابی سے کان کی ہفتہ واری صفائی جاری تھی۔ اس نے علاقے کا نام بتایا۔ پھر جو کرائے کی بابت معلوم کیا تو سب ہی کچھ نگاہوں میں گول گول گھوم گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو بھائی۔" مبادا سننے میں مغالطہ تو نہیں ہوا۔

مگر رشید بھائی اپنی بات دہرانے کے عادی نہیں تھے بلکہ ان کے پاس ثانیہ کی بات کے جواب میں وہی گھسی پٹی کہانیاں تھیں۔ رٹی رٹائی۔

"آپ کا گھر اندر کی طرف ہے....."

"گھر تو سب ہی سڑک پر ہوتے ہیں۔ یہ اندر باہر کا کیا مطلب۔"

"مین روڈ پر نہیں ہے نا..... الٹا روٹ۔ گھوم کر جانا پڑے گا۔"

"تو کس نے کہا ہے گھومنے پھرنے کو۔ سیدھے سیدھے آؤ اور جاؤ۔"

رشید بھائی نے اس کو یوں دیکھا جیسے لپٹے ہوئے اسکارف میں سے دو ننھے منے سینگ سر اٹھا رہے ہوں۔ وہ ان کے اڑیل پن سے کسی حد تک واقف ہو گئی۔

"صبح تو اسجد کو ہی ڈراپ کرنا ہو گا۔ واپسی کے لیے وین لگوالوں گی۔"

پہلا پہلا دن، چھ گھنٹے کا مسلسل کام۔ آخر میں وین والے کی جھک جھک اور دو بسیں بدل کر گھر جانا۔ وہ انتہا سے زیادہ تھک چکی تھی۔

بچے اس کے انتظار میں تھے۔ بس میں دھکے کھا کر گھر پہنچتے پہنچتے وہ بھی بن مانس بن چکے تھے۔ جو اس نے ایک ٹی وی ایڈ میں دیکھا تھا۔ یہی بچے تھے جو اسکول وین میں اس سے زیادہ لیٹ گھر پہنچتے تھے۔ مگر آج ایک تو سب بچوں کو گھر جاتے دیکھ کر خود چھٹی میں رکنا۔ اور پھر گرمی اور بس میں لٹک کر گھر آنا۔ گمان غالب تھا کہ مزید کچھ دیر کھانے کو نہ ملا تو ثانیہ کو نگل لیں گے۔

"یہ ٹی وی والے بھی کچھ سوچ کر ہی بناتے اور دکھاتے ہیں۔ اوپس تھوڑا ہی۔" کچن میں تیز تیز ہاتھ چلاتے وہ اپنی تھکن بھلائے یہی سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
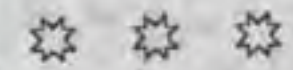
ایک ڈیڑھ ہفتے میں وہ پوری طرح سیٹ ہو چکی تھی۔ لیکن راستے نے تھکا ڈالا تھا۔ ایک دن تو اسجد چھوڑنے گیا۔ لیکن راستہ اتنا لمبا تھا کہ اگلے دن وہ اسے جگاتی ہی رہ گئی۔ وہ ڈھیٹ بن کے پڑا رہا۔ وہ اسکول سے لیٹ ہو گئی اوپر سے۔ بچوں کو رکنے کی تاکید نہیں کی تھی۔ لہٰذا وہ وین سے گھر جا چکے تھے۔ بے اختیار دل چاہا اپنے ہی بال نوچ ڈالے مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

وین لگواتے ہی بنی۔ ایک چوتھائی حصہ۔ کنوینس کی مد میں جانے والا تھا۔ یہ افسوس بھی کچھ کم نہ تھا۔

ایک شام اس کی پڑوسن چلی آئیں۔

"بڑی مصروف ہو گئی ہو۔ کتنے دن سے چکر نہیں لگایا۔"

"ہاں۔" وہ جانے کیوں فخر سے مسکرائی۔

"سب یہی کہہ رہے ہیں۔" وہ لاؤنج میں بکھری چیزیں سمیٹتی رہی۔ پڑوسن خالہ کو عمر کے لحاظ میں وہ ہمیشہ سے خالہ کہتی آئی تھی۔ اس وقت بڑے غور سے اس کے چھوٹے سے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"بہت تھک جاتی ہو گی آ کے۔"

"ہاں بہت۔ واپس آ کے تو کچھ ہوش نہیں رہتا۔ مغرب سے پہلے اٹھتی ہوں پھر کام شروع کرتی ہوں۔" اسے بھی گھر کی ابتری کا احساس ہو رہا تھا۔ جھینپ کر صفائیاں دینے لگی۔

"خیر صفائی ستھرائی اور کپڑوں کی دھلائی کا کام تو صبح ہی صبح ہو پاتے ہیں۔ ورنہ بے وقت ہوں تو بس آدھے ادھورے، اونے پونے ہی نبٹتے ہیں۔"

انہوں نے بیڈ روم میں کھلنے والی بالکونی میں جھانکتے کپڑوں کے ڈھیر اور واشنگ مشین کی پکار سن لی تھی۔ مشین کی بیل بند کرنے کے لیے اٹھتی ہوئی ثانیہ کا منہ بن گیا۔

"خیر میں تو ایک کام سے آئی تھی۔ کمیٹی ڈال رہی ہوں نئی۔" وہ یوں خوش ہو کر بولیں گویا کمیٹی کھلنے کی خوشخبری دے رہی ہوں۔

"ہیں اچھا کتنے کی۔" اس کا موڈ سدھرنے کے بھی کچھ امکانات پیدا ہوئے۔ مگر تفصیلات سن کر اوس گر گئی۔

"مگر خالہ میری تو تنخواہ بہت کم ہے۔ اگر ہر مہینے کمیٹی اور وین کا کرایہ نکال دیا تو میرے پاس کیا بچے گا۔"

"تو تم میرے ساتھ مل کر آدھی ڈال لو۔ نکلے گی تو آدھی کر لیں گے۔" خالہ کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔

"چار پیسے اکٹھے آئیں گے تو کچھ کر سکو گی۔ ورنہ

ہزار دو ہزار تو بس پھر ہو جاتے ہیں۔"

"کہتی تو آپ ٹھیک ہیں۔" اسے راضی ہونے میں دیر نہ لگی۔

کتنے عرصے سے سوچ رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں پڑا قالین اٹھا کر نیا ڈال لوں۔ عید تہوار پر آنے والوں کے سامنے اس کی اڑی اڑی رنگت اور دھبے دار پرانا پن پورے ڈرائنگ روم میں جگہ جگہ منہ سے بولتے اس کے پھڑاپے پر کسی سوگواریت کی سی خاموشی اوڑھا دیتا تھا۔

ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ اس کی ایک بدتمیز سسرالی رشتے دار نے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اپنے بچوں کو یہ کہہ کر شوز اتارنے سے منع کر دیا کہ کارپٹ پر ان کے پیر گندے ہو جائیں گے۔

ثانیہ تو سر سے پیر تک جھلس کر رہ گئی۔ مانا کہ قالین پرانا اور بدرنگا ہو چکا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اس میں اور چٹے فرش میں کوئی فرق نہیں۔ اب وہی خواہش ہمک ہمک کر اسے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی اور وہ صرف نظر سے قاصر تھی۔ پڑوسن خالہ بھی کمیٹی کا ممبر پکا کر کے ہی اٹھیں۔

ہفتہ بھر میں روٹین قابو میں آ گئی۔ مگر کوئی نہ کوئی ایک چیز مستقل نظر انداز ہوتی ہی رہتی تھی۔ کبھی ہانی کا تو کبھی سنی کا ہوم ورک رہ جاتا۔ کبھی اسجد کو کپڑوں کی شکایت پیدا ہو جاتی۔ دھلے موزے، رومال، بنیانیں، بغیر دھلی ہونے کا شکوہ۔ کبھی مجبوری میں اسے خاگینہ پکانا پڑتا تو بھی اسجد کا منہ بن جاتا۔

بچوں کو اسکول کے لنچ میں فرنچ فرائیز چاہیے ہوتے اور صبح اس کے پاس اتنا ٹائم نہ ہو پاتا۔ کسی دن جھاڑ پونچھ رہ جاتی تو کسی دن اپنے پسندیدہ ڈرامے سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اور سب سے زیادہ صدمہ اسی بات کا ہوتا تھا۔

ایسے میں کسی مہمان کی آمد رحمت کم اور زحمت زیادہ مشابہہ نظر آتی۔ بہرحال اس بیل کو کسی نہ کسی طرح منڈھے چڑھانا ہی تھا۔ یوں لنگڑاتی کرتی سنبھلتی گرتی ہستی چل ہی رہی تھی۔

آٹھ سے دس تاریخ تک تنخواہ مل جاتی تھی۔

"سب سے پہلے اس وین والے کا منہ بند کر دوں گی۔" وہ ثانیہ کو دیکھتے ہی دانت نکوستا ہاتھ پھیلا دیتا۔ اپنے ایڈوانس وصولی کے قواعد اسے ازبر کرانے کی زبردستی کوشش کرتا۔

"ارے بھائی! میں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی۔ ابھی تو نوکری لگی ہے۔ تنخواہ ملے گی جبھی تو دوں گی۔ یا کہیں سے ڈاکہ ڈال کر لا کے دوں۔۔۔ ہیں۔" تنگ آ کر اس نے وین والے کے بالکل ایسے لتے لیے جیسے کبھی اس کا اپنی ساس کے لینے کو جی چاہتا تھا۔ جب وہ پہلی تاریخ سے پہلے ہی اسجد کے کانوں میں خرچ کا رولا ڈال دیتی تھیں۔ (اب تو خیر سے کافی امن تھا۔ رولے سیاپے بھائی کے گھر منتقل ہو چکے تھے۔ ساس سمیت)

کافی عرصے بعد بھڑاس نکلی تھی۔ اس کی طبیعت میں بحالی آ گئی۔ اور وین والے رشید بھائی کی حالت بھی سدھر گئی اور مطالبات کی شدت میں خاطر خواہ کمی آ گئی۔

خدا خدا کر کے مہینے کی سب سے بے کس تاریخیں آگے کو سرکیں۔ ستائیس، اٹھائیس، انتیس، تیس اور پھر آئی پہلی تاریخ۔ نئے خواب، نئی امید اور کچھ نئے جگنو اس کی مٹھی میں دبا کے مسکرائی اور اسی مسکراہٹ کے پرلی طرف سے خالہ جی کا چہرہ نمودار ہوا۔

"کمیٹی کیا ہواؤں میں ڈالی ہے۔" انہوں نے ہنس کر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ نچایا۔

"ہیں۔۔۔ خالہ اتنی جلدی۔۔۔ تو نہیں دے سکتی ہیں۔" وہ ہکلا سی گئی۔

"دس تک دے دوں۔"

"لو۔ اتنا انتظار کیا کرنا میاں سے لے کر دے دو۔ بعد میں اسے دے دینا۔" خالہ نے آرام سے راہ سجھائی۔ لیکن یہ راہ اتنی بھی آرام دہ نہ تھی۔

"ابھی تو خیر مجھے جلدی نہیں۔ لیکن دس تک تو دیر ہو ہی جاتی ہے نا۔"

"جی۔" وہ مری مری آواز میں بول کر رہ گئی۔

اسجد کی جیب سے نوٹ نکلوانا وہ بھی ہزار کا۔ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ درست ہی تھا۔ گگی بندھی تنخواہ کا ہر مسکہ گویا اپنے اوپر استعمال کی مہر لگوا کر ہی لاتا تھا۔

اتنے روپے دائیں اتنے بائیں اتنے آگے پیچھے اور کچھ ایویں خوا مخواہ میں ادھر ادھر ہو جانے کے لیے' رکھے ہونے ضروری ہوتے تھے۔ اب اتنی ٹائٹ سچویشن میں اس کا جھنجلانا غیر فطری امر نہ تھا۔

"ماما! یہ ــــ" سنی تھرماس اٹھائے کھڑا تھا۔ کسی کلاس فیلو نے گرا کر توڑ دیا تھا۔" اسجد سے جھاڑ کھانے کے بعد یہ خبر بھی کچھ کم دکھ بھری نہ تھی۔ اس کا جی چاہا یا تو اپنا پھوڑ لے یا اس بچے کا بھی توڑ دے۔ جس نے یہ تھرماس توڑا تھا۔ دونوں میں سے ایک بھی ممکن نہ تھا۔ اور دونوں میں اس کا اپنا نقصان ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

خالہ خوش خوش اور مطمئن سی اٹھ گئیں۔ ان کا دیا گیا مشورہ خالی تو نہیں گیا تھا۔ البتہ ثانیہ قبل از وقت اپنے سر پر کسی قسم کا قرض لینا نہیں چاہتی تھی جبھی کچھ بجھ سی گئی۔

اسجد نے اپنی امی کو بھیجنے والی رقم میں سے اس کی مدد کر دی تھی۔ اب ثانیہ تو ثانیہ۔ خود اسجد بھی بے چینی سے اس کی تنخواہ کا انتظار کر رہا تھا۔

"ابھی تو صرف دس یا پندرہ دن کی ہی ملے گی۔" وہ بھی دن گن رہا تھا۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا۔ جس کا کب سے ارمان تھا۔ انتظار تھا۔ ایک ایک کر کے ٹیچرز جاتی کیش اور سفید لفافے میں ملفوف اپنی مہینے بھر کی محنت وصول کر کے آفس سے باہر نکلتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ آفس میں اکیلی رہ گئی۔

"مس ثانیہ ہماری پالیسی کے مطابق آپ کی ان دس دنوں کی سیلری نیکسٹ منتھ ملے گی۔ اس منتھ کی فل پے کے ساتھ۔"

"ایں ــــ؟" اس کا منہ کھل گیا۔ پورا آفس گھوم گھوم گیا۔ اس نے ہکلا کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"دیکھیں یہ ہمارے آرڈر تو ہوتے نہیں۔ مینجمنٹ سے آتے ہیں۔" اب کہنے کو کیا بچا تھا۔ بمشکل تمام اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"ایک بار بات کر کے کوشش ــــ"

"سوری اب تو دیر ہو چکی ہے۔ پرنسپل خود سب کی پے دیکھتی ہیں۔ پھر اکاؤنٹس میں پے لیول سیکشن سے کمپیوٹرائزڈ پے سلپ نکلتی ہے۔ اس کے بعد ــــ"

مزید ضبط کا یارا نہ تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اس نے باہر کا رخ کیا۔ آگے وین والا سوالی تھا۔ اور وہ اسجد کے آگے سوالی بننے پر مجبور تھی۔ وہ تو سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک پیسہ نہیں بچا میرے پاس۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ آپ کے پاس خزانے گھڑے ہیں۔" طنز کا کوئی موقع خالی جانے سے بہت گناہ ملتا ہے۔ ایسا وہ سوچتی تھی اور پابندی سے شوہر پر لاگو کرتی تھی۔

"لیکن مجھے ضرورت پڑے گی تو آپ سے ہی مانگوں گی نا۔"

اسجد چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر جیسے اس کی مصیبت زدہ شکل پر رحم آ گیا۔

"یہ لو! بائیک کی سروس کے لیے رکھے تھے۔" اس کے ہاتھ میں چند سو سو کے نوٹ تھے۔ ثانیہ کی جان میں جان آئی۔

وین والے کا منہ بند کر کے ذرا سکون ملا۔

ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے۔ بظاہر یہ آدھے دن کی جاب تھی۔ لیکن سارے دن کی توانائیاں لے کے نچوڑ دیتی تھی۔ دن بھر بچوں کی چیخ چیخ میں سر کھپا کر گھر آنے کے بعد بچے ذرا بھی شور کرتے تو برے لگتے۔ پہلے اسجد آفس سے آتا تھا تو بچے ہنستے کھیلتے اس سے لپٹ جاتے اور اب کبھی سوتے ہوئے ملتے تو کبھی کسی نہ کسی بات پر ضد کرتے۔ اوپر سے اسکول کے کاموں میں بار بار غلطیاں کرنے پر انچارج سے جھاڑ الگ پڑ جاتی۔ زندگی کی پہلی پہلی ٹیچنگ اور پروفیشنل

سروس تھی۔ پر فیکشن آنے میں دیر تو لگنی ہی تھی۔ ملنے والیوں اور بہن بھابھیوں نے گرما کے ملبوسات کی نمائش اور سیل کا بتا دیا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ دوبار اسجد کے سامنے خوار نہ ہوئی ہوتی تو دو سوٹ تو یقیناً ــــــ خرید ہی چکی ہوتی۔ مئی کے مہینے کی سڑتی ہوئی گرمی اور لان کی نئی کلیکشن۔

"واہ ــــ واہ ــــ مزا آجاتا۔" اس نے دل ہی دل میں چٹخارہ لیا۔

"لیکن ــــ" دس تاریخ تو ابھی بہت دور تھی اور اس پر بہت سا قرضہ چڑھ چلا تھا۔

☼ ☼ ☼

خدا خدا کر کے مہینہ گزرا۔ کچھ ادھار اسجد کو لیتا ہی پڑا۔ اس نے ثانیہ کو بلا تکلف باتیں سنائیں اور لتاڑا۔ وہ سر جھکا کر اس امید پر یہ "ہیپی برتھ ڈے" دیکھتی رہی کہ جلد ہی وہ ان کا منہ بند کر دے گی۔ اس بار اس نے خالہ کو صاف صاف جواب بھی دیا۔

"میری تنخواہ دس کو ملے گی۔ اس لیے میرا حساب کتاب ذرا دیر کا ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ اب اسجد کی گگی بندھی تنخواہ میں سے ہر مہینے تو نہیں لے سکتی نا۔"

خالہ بھی لہجے کا روکھا پن بھانپ گئیں۔ اس لیے چپ چاپ واپس ہو لیں کوئی اصرار نہ مشورہ۔

اللہ اللہ کر کے مئی کی تنخواہ نے اپنی جھلک دکھائی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کرکرے کاغذ کے ابھرے ہوئے امبوز ڈیزائن پر انگلیاں پھیرتی رہی۔ لبوں سے پھوٹنے والی مسکراہٹ کو زبردستی کنٹرول کرتی رہی۔

اس بار رشید بھائی کو دست سوال دراز کرنے سے پہلے ہی چپ کرا دیا گیا۔ ابھی آدھی سیلری بچتی تھی۔ لیکن اسجد نے اس کی خوشیوں کو گرم چائے کی پیالی میں ڈبو کر خودکشی کروا دی۔

"مجھے بھی واپس کرنے ہیں۔ تمہاری وجہ سے لینا پڑا ادھار۔"

اس نے بالکل کسی ادھ مری مرغابی کی طرح اپنا بیگ کھولا اور نوٹ نکال کر اسجد کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے کمال بے مروتی سے جینز کی پچھلی جیب میں ٹھونسے اور سیٹی پر کسی شوخ گانے کی دھن بجاتا بال بنانے لگا۔

"داتا بی مائی چھمک چھلو۔" چھمک چھلو بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگائے آنسو پیتی رہی۔

جون' جولائی کی چھٹیاں اس کے لیے خوشی کے بجائے غم کا پیغام لائیں۔ لان کے نئے سوٹوں' چپلوں اور میچنگ پرس کی شاپنگ کے تمام پلان' دیوانے کا خواب ثابت ہوئے۔ بے حد جھک جھک اور منتوں ترلوں کے بعد' وہی چھ مہینے بعد موسم بدلنے پر تین سوٹ جو بقول خود اس کے نصیب سے جڑے تھے اور حق مہر میں بندھے تھے۔ اس کے خوابوں کی ادھوری تعبیر۔ اس نے اسی پر شکر کا کلمہ پڑھا اور ہمیشہ والی کفایت شعاری کا مظاہرہ کر کے "ایک سگھڑ اور ذمہ دار ماں ہونے کا کردار بخوبی نبھایا۔ لان کے چھوٹے چھوٹے شوخ رنگوں والے پرنٹ کے پیسز لا کر اپنی بیٹی کے کئی ایک نت نئے ڈیزائن کے فراک بنا ڈالے۔ تمام مصروفیات ایک طرف لیکن اب اسے اگست کے مہینے کا شدت سے انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

ساون بھادوں نے ہر جانب جل تھل مچا دی تھی۔ ماہ اگست میں اسکول کھل جانے کی خوشی بھلا اس سے زیادہ اور کس کو ہو سکتی تھی۔ لیکن خوشی صحیح معنوں میں کافور ہوئی بلکہ کونین بن کر یوں اس کے حلق میں اٹکی کہ گویا نہ نگلے بنی نہ اگلے۔

"آپ نیو ٹیچر ہیں۔ جون جولائی کی سیلری تو صرف ان ٹیچرز کو ملتی ہے جن کو ایک سال ہو چکا ہے۔ اور وہ بھی ستمبر میں جون اور اکتوبر کے ساتھ جولائی ــــ"

انچارج کی نظریں اسے بے حد طنزیہ اور خود کا مذاق اڑاتی ہوئی لگیں۔ حالانکہ اس نے تو بہت گول مول کر کے پوچھا تھا پھر بھی ــــ

☼ ☼ ☼

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔
کہنے کو یہ نوکری کا چوتھا مہینہ تھا۔ مگر ڈرائنگ روم کا کارپٹ تو خیر نیا کیا ہی آتا۔ اس کی انگلی میں ایک چھلا تک نہ آسکا۔

"پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔" وہ دل ہی دل میں کئی کئی بار خود کو تسلی دیتی۔

"دل کی بستی دھواں دھواں کب تک۔"

اب تو کوئی ادھار واپس نہیں کرنا تھا۔ صرف کمیٹی جو کہ اگلے مہینے تک ختم ہو جانی تھی۔ کیونکہ خالہ کو چھ سے زیادہ ممبر دستیاب نہیں ہو سکے تھے اور رشید بھائی کی ڈیمانڈ۔

"ہیں..... کیوں۔" حواس تب اڑے جب رشید بھائی زیادہ ہی ڈیمانڈنگ ہو گئے۔

"سب دین والے لیتے ہیں جی۔ سب بچے بھی دیتے ہیں۔ اور میں بھی۔"

"لیکن ہم دیں کہاں سے۔ ہمیں تو تنخواہ بھی نہیں ملی۔"

"یہ ہمارا مسئلہ تو نہیں ہے نا۔ ہمارا بھی تو گھر بار ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ جون جولائی میں صرف ہوا تو نہیں کھا سکتے۔" اس نے فوراً آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

مرتا کیا نہ کرتا۔

"یہ اچھی رہی۔ صبح ہاتھ میں ہزار ہزار کے کئی نوٹ پکڑو اور شام تک ایک بھی نہیں بچتا۔" وہ جی بھر کر بدمزا اور بددل ہوئی۔ لیکن ہمت نہیں ہاری۔

"گرتے ہیں شہسوار ہی....."

☼ ☼ ☼

اگست کے اختتامی دن اور ستمبر کا تقریباً پورا مہینہ ماہ رمضان ہی اپنی رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ چھایا رہا۔ اس نے خوب دل لگا کر روزے رکھے اور ——
—— اپنی روزگار کی سلامتی اور بگار میں برکت کی دعا میں مانگیں۔

عید سے ایک دن پہلے یعنی چاند رات سے اسکول میں چھٹیاں تھیں اور اس سے ایک دن پہلے اٹھائیسویں روزے کو یہ حوصلہ شکن خبر اس سمیت سب ہی ٹیچرز نے دل تھام کر سنی کہ سیلری عید کے بعد ملے گی۔

عید اور اس کے بعد کے دونوں چھٹی کے دن عجیب بجھے بجھے انداز میں گزرے۔ تنخواہ نہ ملنے کی تھکن، مہمانوں عزیز داروں یہاں تک کہ میکے والوں کی آمد پر بھی اتر نہ سکی۔

عید کی چھٹیوں کے بعد اسکول کے پہلے دن اسے اٹھنے میں بے حد دقت محسوس ہو رہی تھی۔ یا تو یہ گزرے دنوں کے کام اور مصروفیت کی تھکن تھی۔ یا موسم سے بیزاریت کہ ستمبر اچھا خاصا ستمگر کی طرح گزرا۔

بہر حال جانا تو تھا۔ دو دن بعد ہفتہ واری تعطیل تھی۔ سو اس نے بچوں کی دونوں دن کی چھٹی کروا دی اور بچوں کو میکے روانہ کر دیا۔ گو کہ اس حرکت پر اسے اسجد سے کافی کچھ سننے کو ملا۔ مگر اس نے کمال خوب صورتی سے ہضم کر لیا۔

ایک بار پھر تنخواہ کا لفافہ ہاتھ میں تھا۔ مگر اس بار وہ مخصوص جوش و خروش مفقود تھا۔ اس نے خاموشی سے لفافہ لے کر پرس میں ڈال لیا۔ حالانکہ جانتی تھی کہ اس بار تو اسے کچھ روپے مل ہی جائیں گے اپنی مرضی سے خرچ کرنے کے لیے لیکن دل جانے کیوں بجھا بجھا سا تھا۔

خالہ اور رشید بھائی کو فارغ کر کے اس نے بچوں کے لیے کچھ پھل منگوائے اور گروسری کا تھوڑا سا سامان۔ باقی رقم الماری میں ڈال لی۔

اسجد کی نظروں سے اس کی طبیعت کی گرانی چھپ نہ سکی۔

"کیا بات ہے اتنی چپ چپ کیوں ہو۔"

"پتا نہیں کیوں بس ایسے ہی....." اچانک جانے کیا ہوا کہ بات کرتے کرتے آنکھوں میں نمی بھر گئی۔

"مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بے دلی سے اٹھ کر بکھرا وا سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اکتوبر کا پت جھڑ گرما سے گلے ملتا اپنے زوروں پر تھا۔ سارا دن سورج کی روشنی میں گھلی زردی اس کے مزاج میں چھب دکھاتی رہتی۔ اسٹاف میں دوست بن جانے والی ایک دو ٹیچرز نے اس کی خاموشی اور بیزاری کو محسوس کیا اور سنجیدگی سے ڈاکٹر کے پاس جانے کے مشورے دینے لگیں۔

اس نے ہر لوئر مڈل کلاس عورت کی طرح سنی ان سنی کر دیئے کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی نوبت انتہائی شدید علالت کی صورت میں ہی آتی تھی۔ ورنہ تو گھر میں ہی علاج معالجہ کر کے خود کو فٹ فاٹ کر لیا جاتا تھا۔

اسجد کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی۔ اس نے خاموشی سے الماری کی نچلی دراز میں رکھے روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ وہ پوچھتا رہ گیا کہ۔

"ہوا کیا ہے آخر۔" وہ کیا کہتی۔ جواب خود اس کے پاس بھی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"لو پورے چھ ہزار۔" نئے مہینے کی شروعات تھیں۔ جب خالہ نے اس کی کمیٹی کھلنے کی خوش خبری سنائی۔ اسجد ہی کے کہنے پر اس نے آدھی کے بجائے پوری رقم کی کمیٹی ڈال لی تھی۔

عرصے بعد کوئی کام کی خبر سنی تھی۔ لحہ بھر میں طبیعت پر چھائی سستی اور بیزاری دور ہوئی اور اس کی جگہ شوخی اور تر و تازگی نے لے لی۔ گو کہ کمیٹی ممبران کی وجہ سے کمیٹی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ پھر بھی آج کل میں اسے تنخواہ ملنے والی تھی۔

"مل ملا کر اتنے تو ہو جائیں گے کہ بچوں اور اپنے لیے چند کپڑے ہی بنا لوں گی۔ سردیاں بھی آنے والی ہیں۔ اس بار تو کافی کے ساتھ خشک میوہ بھی لینا ہے۔"

جل اٹھے چراغ اور دمک اٹھیں امیدیں۔

عہد بندھنے لگے۔ اسجد کو بھی روٹھی ہوئی الفت اور توجہ واپس ملی۔ وعدے، ارادے اور پیمان سبھی پروان چڑھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

رو رو کر اس کی جان آدھی ہو چلی تھی۔ جبکہ قریب بیٹھے اسجد کے تاثرات اور بھی زیادہ جی جان جلانے والے تھے۔ جو کبھی تو بے حد سنجیدہ بیٹھ جاتا اور کبھی اس پر نظر پڑتی تو فوراً دانت نکل آتے۔

ادھر اس کے دانت نکلتے۔ ادھر اس کے آنسو۔ اور وہ اور شدت سے سسکنے لگتی۔ کتنی خوش تھی وہ چند گھنٹوں پہلے تک۔

اچھی طرح یاد تھا۔

بے انتہا چمکتے چہرے اور کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ اس نے سامنے روشنیوں اور رنگوں کے مرقع۔ شان سے ایستادہ سر اٹھائے کئی منزلہ شاپنگ مال کو دیکھا اس کی قسمت میں تو جیسے ہفتہ واری دنوں کے بچت بازار ہی لکھے تھے۔

ایسے ملٹی اسٹوری، امپورٹڈ اور بیش قیمت چیزوں

سے بھری، ٹھنڈی ٹھنڈی (ایئرکنڈیشنڈ) دو کانوں والے مالز تو سال میں ایک یا دو بار ہی دیدار کرواتے تھے۔ وہ بھی تب جب اسجد کو ذرا امیدوں سے زیادہ بونس مل جاتا یا کوئی بھولی بسری کمیٹی۔ اس کے نصیبوں کی طرح کھل جاتی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر فضا میں رچی مہنگی مہنگی گاڑیوں سے دھوئیں کی صورت نکلتے پیٹرول کی مہک کو پھیپھڑوں میں بھرا تھا اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔ سارا منظر ڈولا آگے پیچھے فضا میں ہاتھ لہرائے اور پھر کچھ یاد نہیں۔

بس آنکھ کھلی تو شاپنگ پلازہ، سرکاری اسپتال کی پیلی اور سفید عمارت میں بدل چکا تھا۔ رنگوں اور روشنیوں کے سیلاب کی جگہ ٹمٹماتے سو واٹ کے بلب اور انرجی سیورز نے لے لی۔

سامنے کھڑی ڈاکٹر۔ اسجد سے مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

"ویک نیس بہت زیادہ ہے۔ کھانے پر توجہ دیں اور اگر مزید ویک نیس بڑھی تو بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ یہ میڈیسن فی الحال۔۔۔" وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر ثانیہ میں سننے کی تاب نہ تھی۔ تب سے اب تک نہ اس کے آنسو تھمے تھے۔ نہ اسجد کی مسکراہٹ۔

"مجھے کل ہی میری ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" بہت سوچ سمجھ کر بالآخر اس نے بات شروع کی۔

"کیوں بھئی۔۔۔ اتنی جلدی۔۔۔"

"میں یہ سب سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہوں۔" اس کی سنجیدہ آواز میں کہیں مذاق کی رمق نہ تھی۔ پھر بھی وہ چند لمحے اس کا چہرہ ٹٹولتا رہا۔

"میرا خیال ہے تم مذاق کر رہی ہو۔"

"کیوں اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔" وہ تڑخ اٹھی۔

"دو بچوں کو کھلانے پہنانے کے پیسے نہیں ہیں آپ کے پاس اور تیسرا آجائے گا تو۔۔۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ہم اپنی مرضی سے تو نہیں لا رہے نا۔ پھر جو دے رہا ہے وہ انتظام بھی کر دے گا۔" اسجد ہر طرح سے مطمئن تھا۔

"یہ سب بیکار اور فضول کی باتیں ہیں۔"

"ثانیہ!" اسجد ایک دم بگڑا تھا اور زور سے پکارا وہ چپ کر گئی۔ اسے ویسے بھی ثانیہ کو اتنے غصے سے مخاطب کرنے کی ضرورت بہت کم پڑتی تھی اور ایک ہی بار میں ثانیہ کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

"تم۔۔۔ چند روپوں کی لالچ میں اس قدر اندھی بھی ہو سکتی ہو میں نے سوچا تک نہ تھا۔ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے کا تو جانور بھی نہیں سوچتے۔ شرم نہیں آئی تمہیں۔ تم انسان ہو اور مسلمان بھی۔ خبردار۔۔۔ خبردار جو تم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو فضول اور بیکار باتوں سے تشبیہ دی تو۔۔۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا۔

"خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ذرا سوچو تم کتنی خوش نصیب ہو جس نعمت کو ترستے لوگوں کی زندگیاں تمام ہو جاتی ہیں۔ وہ تمہیں اس نعمت سے تیسری بار نوازنے جا رہا ہے اور تم۔۔۔"

اس نے بات مکمل نہیں کی۔ ثانیہ کے جھکے سر کو دیکھتا سونے چلا گیا۔ سوچ کے بے شمار در اس کے ذہن میں کھلے چھوڑ کر۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن صبح اسکول روانگی کے وقت اس کے ہاتھ میں استعفیٰ تھا۔ اور واپسی میں وہی سفید لفافہ جو اس کے خیال میں آخری ہی تھا۔ شام میں اس نے وہ لفافہ جوں کا توں اسجد کے سامنے دھر دیا۔

"کمیٹی کے پیسے ان میں ملا کر ابھی سے سنبھال لیں۔ ابھی سے بچت ہوگی تو۔" اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ کیونکہ اسجد تمام ناراضی بھلائے شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆

شازیہ جمال نیر

ابھی کچھ خواب باقی ہیں

زوردار چھناکے کی آواز آئی اور گل دوپہری سے سجا ایک اور گملا کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ مانو نے فوراً سے پیشتر بائیک کو بریک لگائی، لیکن نقصان تو ہوچکا تھا۔

"غضب خدا کا لڑکی ہے یا پٹاخہ۔ پھر گملا توڑ دیا ہے تم نے۔ آخر کب سدھرو گی؟" دادو چھڑی کی ٹک ٹک کرتی برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے غصے سے بولیں۔ بائیک سائیڈ پر کھڑی کرکے اس نے خود کو ان کی ڈانٹ پھٹکار سننے کے لیے تیار کیا۔

"دادو! قسم لے لیں اتنی احتیاط سے چلاتی ہوں، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ ایک تو جگہ بھی اتنی تنگ ہے۔" اس نے غصے سے ٹوٹے ہوئے گملے کو دیکھا۔ گویا وہ خود چل کر اس کے راستے میں آگیا ہو۔

"ہاں تو بی بی کس نے کہا ہے کہ اس موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاؤ۔ باہر سڑکوں پہ جاکر اپنا شوق پورا کرلو۔" دادو پورے جلال میں آچکی تھیں۔ اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

"یہ ساری خرافات تیمور نے ہی سکھائی ہیں نا تمہیں، ابھی جاکر اس کی خبر لیتی ہوں۔" دادو کو نواسے کی خبر لینے کا خیال آیا تو اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

تیمور اس کا گرو اپنی متوقع درگت سے بے خبر اس وقت لاؤنج میں فاطمہ کے ہاتھ سے بنے ہوئے گرم گرم پکوڑوں سے لطف اٹھا رہا تھا۔

"بہو! دیکھ رہی ہو اپنی بیٹی کی حرکتیں۔ ارے میں کہتی ہوں سمجھاؤ اسے ورنہ اگلے گھر جاکر تو ناک کٹوائے گی ہماری۔" امی کچن سے باہر نکلیں تو دادو نے انہیں بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

"افوہ! دادو ایک گملا ہی تو توڑا ہے، کون سا کسی کی ٹانگ توڑ دی ہے۔" اس کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔

"مانو!" امی نے اسے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تائی امی کے پکارنے پر دوبارہ کچن کی طرف چلی گئیں۔ البتہ جاتے جاتے اسے بری طرح گھورنا نہیں بھولی تھیں۔

"نانو! مسرت خالہ واش روم میں پھسل گئی ہیں۔ امی پوچھ رہی ہیں ان کی عیادت کو کب چلیں گی؟" زینی اس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئی تھی۔

"بڑی کام چور ہے یہ مسرت، آئے دن کہیں نہ کہیں جان بوجھ کر پھسل جاتی ہے۔ تاکہ گھر کا سارا کام بوڑھی ساس کو کرنا پڑے۔ بے چاری زیتون پلنگ پر بیٹھ کر کھانے کا ارمان لیے ہی دنیا سے چلی جائے گی۔"

دادو حسب عادت اصل موضوع سے ہٹ چکی تھیں۔

"لیکن نانو کیا پلنگ پر بیٹھ کر کھانا ضروری ہے؟ وہ چٹائی پر بیٹھ کر بھی تو کھا سکتی ہیں۔" زینی نے ناک سے پھسلتا چشمہ درست کرتے ہوئے نکتہ اعتراض اٹھایا۔ ان دونوں کو بحث میں الجھا چھوڑ کر مانو چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔

"تم یہاں اکیلے بیٹھے ہو۔ فاطمہ کہاں ہے؟" اس نے پکوڑوں پہ ہاتھ صاف کرتے تیمور سے پوچھا اور پلیٹ اپنی طرف کھسکالی۔

"آپا تو میں یہاں فاطمہ کے لیے ہوں۔ پر فاطمہ نہ سہی اس کے ہاتھ کے بنے پکوڑے ہی سہی۔" اس نے دوبارہ پلیٹ اپنے قبضے میں لے لی۔

"فاطمہ! سنا تم نے یہ تیمور تمہیں پکوڑا کہہ رہا ہے۔" مانو نے اندر داخل ہوتی فاطمہ سے کہا اور جلدی سے پلیٹ میں پڑا آخری پکوڑا اٹھایا۔

"توبہ مانو، کتنی جھوٹی ہو تم۔ خبردار اب میری بائیک کو ہاتھ بھی لگایا تو۔ احسان فراموش کہیں کی۔" تیمور اسے وارننگ دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوکب خواجہ کی جانشین! منگیتر کے دل تک تو تم میدے کے رستے پہنچ چکی ہو۔ اب ذرا اپنی ہونے والی بے چاری اکلوتی نند کے بارے میں بھی کچھ سوچ لو۔" زینی مسکین سی شکل بناتی ہوئی فاطمہ سے بولی۔

"مسکین اور بے چاری کا تو مجھے نہیں پتا البتہ تمہارے اور مانو کے لیے میں نے پکوڑے رکھ دیے ہیں کچن میں۔" فاطمہ نے مانو کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور ریموٹ اٹھا کر چینل سرچ کرنے

لگی۔

"فاطمہ مانو آکر دسترخوان لگاؤ کھانا تیار ہے۔" تائی امی نے آواز لگائی تو فاطمہ ریموٹ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"زینی! تم فاطمہ کی ہیلپ کرادو پلیز۔ ورنہ مجھے دیکھ کر تو دادو کو پھر سے اپنے گملے یاد آجائیں گے۔" مانو نے زینی سے کہا اور کشن اٹھا کر چہرے پر رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼
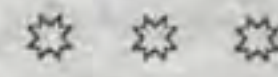
"کیوں بچوں کی طرح شور مچا رکھا ہے۔ تمہارے تایا ابو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے کمرے تک تم لوگوں کی آوازیں نہیں جانی چاہئیں۔"

وہ تینوں لاؤنج میں لڈو کھیل رہی تھیں۔ مانو نے موبائل پر "چھمک چھلو" لگایا ہوا تھا۔ امی ڈانٹ کر واپس باہر چلی گئیں تو تینوں کے منہ لٹک گئے۔

"توبہ ہے، لوگوں کے گھروں میں کتنی رونق ہوتی ہے اور ایک ہمارا گھر ہے، ہر وقت یہ نہ کرو، وہ نہ کرو کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے۔" فاطمہ برے برے منہ بناتی بیڈ پر لیٹ گئی اور کشن اٹھا کر چہرے پر رکھ لیا۔

"آئیڈیا!" لڈو کی گوٹیں ڈبے میں رکھتے ہوئے مانو جوش سے بولی۔

"رہنے دو۔ اس بار ہم تمہارے کسی ایڈونچر کا حصہ نہیں بنیں گے۔" زینی ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے سنو تو۔ قسم سے بہت مزا آئے گا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے بولی۔

"ساجدہ بھابھی کی بیری دیکھی ہے، کتنے موٹے موٹے سرخ بیر لگے ہوئے ہیں۔ کیوں نہ آج جب دوپہر کو دادو لوگ قیلولہ فرمائیں گی تو ہم دیوار پر چڑھ کر ان کے گھر کود جائیں گے۔ ساجدہ بھابھی تو گزشتہ تین دنوں سے گاؤں اپنی ساس سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ عامر بھائی بھی اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔ بولو کیسا؟" تائید طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اور جو کسی کو پتا چل گیا پھر؟" فاطمہ کشن ایک طرف رکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ مانو کا آئیڈیا اسے پسند آیا تھا۔ کیونکہ ساتھ والے گھر میں پکے پکے بیروں نے اس کا جی للچایا ہوا تھا۔

"کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ ویسے تو ساجدہ بھابھی اتنی کنجوس ہیں۔ ایک ایک بیر گن کر رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو کبھی ہمسائیوں کو جھوٹے منہ بھی بیر کھانے کی دعوت دی ہو۔" مانو کے کہنے پر دونوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پروگرام ڈن ہوا تو زینی بھاگ کر کچن سے چھوٹی باسکٹ اٹھالائی۔ فاطمہ نے بڑا اسٹول دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔

جوں ہی کھانے پکانے سے فارغ ہوکر سب ادھر ادھر ہوئے تو یہ تینوں دبے قدموں چلتی باہر نکل آئیں۔ سب سے پہلے مانو دوپٹے کا ایک سرا پکڑے آہستہ آہستہ نیچے اتر گئی۔ دوسرا سرا ان دونوں نے پکڑا ہوا تھا۔ مانو نے نیچے اتر کے چھوٹی سیڑھی دیوار کے ساتھ لگادی۔ کیونکہ فاطمہ اور زینی دوپٹے کے ساتھ نیچے اترنے کا رسک نہیں لے سکتی تھیں۔

"کتنی پھوہڑ ہیں ساجدہ بھابھی، گھر کیسا پھیلا ہوا ہے۔" زینی کمر پر ہاتھ رکھ کر گھر کا جائزہ لینے لگی۔

"افوہ! جلدی کرو، ہم یہاں ساجدہ بھابھی کے پھوہڑ پن کو ڈسکس کرنے نہیں آئے۔" فاطمہ کے کہنے پر مانو پھرتی سے کسی ماہر کی طرح بیر کے درخت پر چڑھ گئی اور زور، زور سے ٹہنیاں ہلانے لگی۔ فاطمہ اور زینی نے نیچے گرنے والے سرخ بیر جلدی سے چن لیے۔ اچانک عامر بھائی کی پھٹ پھٹی دروازے پر آکے رکی تو تینوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"عامر بھائی اس وقت کیا کرنے آئے ہیں؟" فاطمہ ڈر کے مارے کانپنے لگی۔

"کہیں کسی نے مخبری تو نہیں کردی۔" زینی نے خوف زدہ نظروں سے ڈیوڑھی کی طرف دیکھا۔ جیسے ہی دروازہ ہلکے سے کھٹکے کی آواز کے ساتھ کھلا یہ دونوں سرپٹ دیوار کی طرف بھاگیں۔

"ارے باسکٹ تو اٹھاؤ۔" مانو اوپر سے چلائی۔ زینی نے گرتے پڑتے باسکٹ اٹھائی اور اپنے صحن میں

چھلانگ لگادی۔ مانو دم سادھے عامر بھائی کو بیر کے عین نیچے گزرتا ہوا دیکھنے لگی۔ انہوں نے کمرے کا لاک کھولا، تھوڑی دیر بعد کوئی فائل اٹھائے باہر نکل آئے۔ کمرہ دوبارہ لاک کیا اور گیٹ کی طرف چل پڑے۔ مانو سانس روکے یہ ساری کارروائی دیکھتی رہی۔ جیسے ہی پھٹ پھٹی کے رخصت ہونے کی آواز آئی دیوار پار دونوں کے سر نمودار ہوئے۔

"مانو! جلدی سے نیچے اتر آؤ۔ بس اتنے بیر کافی ہیں۔" فاطمہ اپنی کہنی سہلانے لگی۔

"شکر ہے بال بال بچ گئے۔ اگر کسی کو ہمارے کارنامے کی بھنک بھی پڑجاتی تو ہماری خیر نہیں تھی۔" باغ میں امرود کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیر کھاتے ہوئے وہ اپنے ایڈونچر کو انجوائے کرتی رہیں۔

☼ ☼ ☼
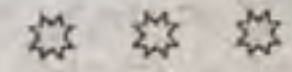
موسم نے اچانک انگڑائی لی اور سردی کی شدت میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ آسمان پر ادھر ادھر اڑتے سفید بادلوں کے ٹکڑوں نے شاہ مشرق کو اپنے سفید پروں میں چھپالیا۔ نواز بھائی کل رات ہی اسلام آباد سے لوٹے تھے۔ امی کچن میں ان کا ناشتا بنارہی تھیں۔ مگر انہیں اس وقت صرف چائے کی طلب تھی۔

"نواز! پھر کیا سوچا ہے تم نے بیٹا؟" تائی امی نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا اور خود دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کس سلسلے میں امی؟" انہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"دیکھو بیٹا! میں جانتی ہوں زینی میں بچکانہ پن بہت ہے اور میں تم پر اپنی پسند زبردستی مسلط نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے بہروز صاحب کی بیٹی ثنا کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ ان کا دوبار فون آچکا ہے۔ وہ جواب کا انتظار کررہے ہیں۔" تائی امی کے بتانے پر ان کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

"امی! پلیز میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنی۔" چائے کا کپ رکھ کر وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"لیکن کیوں بیٹا؟ آخر کب تک؟" تائی امی اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے بولیں۔

"مجھے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ آپ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" نواز بھائی سختی سے کہتے ہوئے میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھائے باہر نکل گئے۔

"بھابھی! سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا ان شاء اللہ۔ آپ فکر مت کریں۔" امی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"سکینہ آپا کی طبیعت خراب ہے۔ زینی نے فون کرکے فاطمہ اور مانو کو بلایا ہے۔ میں سوچ رہی تھی شام کو ان کی طبیعت کا پوچھنے چلیں گے۔ اماں جی تو دن کے وقت ہو آئیں گی۔" امی ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔ بلڈ پریشر کی مریضہ تائی امی کو ڈاکٹر نے ٹینشن لینے سے منع کیا تھا۔ اس لیے امی نے موضوع تبدیل کردیا۔

☼ ☼ ☼

"پھپھو اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" فاطمہ نے ان کا سر دباتے ہوئے پوچھا۔

"میری بیٹی آگئی ہے نا، اب بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی۔ ورنہ بخار سے زیادہ تو مجھے زینی نے پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔" پھپھو نقاہت زدہ لہجے میں بولیں۔

زینی کے اناڑی پن کے مظاہرے تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی دیکھ چکی تھیں۔ سارا گھر پھیلا ہوا تھا۔ کوئی ایک چیز بھی تو اپنے ٹھکانے پر نظر نہیں آرہی تھی۔ پھپھو کا ڈائٹ چارٹ دیکھ کر وہ سوپ بنانے کی غرض سے کچن میں چلی آئی۔ کچن میں پھیلی ابتری دیکھ کر تو اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہارا اپنا گھر ہے، جہاں سے جی چاہے شروع ہوجاؤ۔" فروٹ چاٹ کے لیے پھل کاٹتی زینی کو گھورتے ہوئے وہ سنک میں پڑے برتنوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"لو جی میری فروٹ چاٹ تو تیار ہے، تم بس لنچ کے لیے کوئی اچھی سی ڈش تیار کرلینا۔" زینی ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے! میں خود ہی سب کچھ کرلوں گی۔ تم بس ایک مہربانی کرو یہاں سے چلتی پھرتی نظر آؤ۔" فاطمہ نے میز پر بکھرے پھلوں کے چھلکے دیکھتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ تو وہ کندھے اچکاتی باہر نکل گئی۔

"زینی! تیمور گھر پر ہے؟" مانو نے کچن سے نکلتی زینی سے پوچھا۔

"ہاں، اپنے کمرے میں ہوگا۔" زینی کے بتانے پر وہ تیمور کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"تیمور! تمہارے لیے چائے بنا لاؤں؟" کمپیوٹر اسکرین سے نظریں ہٹا کر وہ حیرت سے مانو کو دیکھنے لگا۔ مرتے ہوئے کے منہ میں پانی کے دو قطرے تک نہ ٹپکانے والی مانو اس سے چائے کا پوچھ رہی تھی۔ حیران ہونا لازمی بنتا تھا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" اپنی حیرت پر قابو پاکے وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ مانو جھٹ پٹ چائے بنالائی۔

"تیمور! تمہیں گن چلانا آتی ہے؟" وہ اس کے قریب دوسری چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"ہاں، مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" اس نے سپ لیتے ہوئے پوچھا۔ جلدی میں بنائی گئی چائے میں وہ چینی ڈالنا بھول گئی تھی۔ تیمور نے کپ دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"مجھے بھی گن چلانا سکھادو پلیز۔" وہ منت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"مگر تم گن چلا کر کیا کروگی؟"

"تمہیں نہیں معلوم مجھے گن چلانے کا کتنا شوق ہے۔" وہ بچوں کے سے اشتیاق سے بولی۔

"سارے عجیب شوق پالے ہوئے ہیں تم نے۔ ورنہ لڑکیوں کو تو شاپنگ، فیشن اور پارٹیز سے ہی فرصت نہیں ملتی۔" وہ سر جھٹک کر ہنس پڑا۔

"مجھے نہیں پتا اور لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ تم بس مجھے ایک بار گن چلانا سکھادو۔ میں تمہیں روز اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاؤں گی۔" مانو نے گویا اسے لالچ دی۔

"ڈیئر کزن! گن چلانا تو میں تمہیں سکھادوں گا، مگر تم پلیز یہ چائے والی آفر رہنے دو کیونکہ میں روز شوگر فری چائے نہیں پی سکتا۔" تیمور شرارت سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے سارے عجیب و غریب شوق وہ اسی کے ذریعے پورے کرتی تھی۔ غلیل سے نشانے باندھنا بھی تیمور نے ہی اسے سکھایا تھا اور وہ سارا دن ٹاہلی پر بیٹھے کوؤں پر تاک تاک کر نشانے لگاتی تھی۔ دادو اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے سخت عاجز تھیں۔ اب بھی فاطمہ اور زینی کی ہیلپ کرانے کی بجائے اسے اپنی سرگرمیوں سے فرصت نہیں تھی اور ابھی تو اسے زینی کے میاں مٹھو کے ساتھ دماغ کھپانا تھا جو صبح سے مانو آگئی، مانو آگئی کی گردان کیے جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا جی! آپ لوگوں کا رزلٹ کب تک آرہا ہے؟" صبح ناشتے کی ٹیبل پر تایا ابو نے ان سے پوچھا۔ ناشتا افراد خانہ ہمیشہ مل کر کرتے تھے۔ یہ دادو کا حکم تھا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے لیکن ناشتے کی ٹیبل پر سب موجود ہوں۔

"اس مہینے کے اینڈ تک آجائے گا۔" فاطمہ نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے بتایا۔

"اس بار ٹاپ کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہنڈرڈ پرسنٹ تایا ابو۔" مانو نے اعتماد سے جواب دیا۔ وہ فاطمہ کی نسبت پڑھائی میں زیادہ اچھی تھی۔ اس کا شاندار رزلٹ کو دیکھ کر وہ اکثر اس کی شرارتوں کو نظر انداز کردیا کرتے تھے۔

"میری ارمغان صاحب سے بات ہوئی ہے، کہہ رہے تھے جب کلاسز اسٹارٹ ہوں تم لوگ اکیڈمی جوائن کرلینا۔ اب وہ گھر پر پڑھانے نہیں آسکیں گے۔" تیمور بھائی نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے کب ختم ہوں گی ان کی پڑھائیاں۔ سوئی میں دھاگہ ڈالنا تک نہیں آتا۔ بس سارا وقت یہاں سے وہاں کد کڑے لگاتی پھرتی ہیں۔" دادو کو اپنے من پسند موضوع پر بولنے کا موقع مل گیا۔

"صبح صبح اس ہاٹ ایشو پر بات کرنا ضروری ہے؟" وہ دونوں ایک دوسرے کو بے چارگی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"تیمور بیٹا! رات میری باقر صاحب سے بات ہوئی تھی، تم آج ان سے مل کر باقی معاملات طے کر لینا۔" ابو کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تیمور بھائی بھی۔ "جی بہتر" کہتے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ فاطمہ برتن سمیٹنے لگی۔ مانو کے ذمہ آج پروین کے سر پر کھڑے ہو کر (محاورتاً) تفصیلی صفائی کروانا تھا۔ امی نے آج مشین لگا کر سارے میلے کپڑے دھونے کا پروگرام بنالیا۔ کیونکہ کتنے دنوں بعد آج دھوپ نکلی تھی۔ دادو اپنی مرغیوں کی خبر لینے چل پڑیں۔ تائی امی دھوپ میں چٹائی بچھا کر فاطمہ کی قمیص کی ترپائی کرنے لگیں۔

"دادو! آپ کے نام خط آیا ہے۔" فاطمہ دور سے ہاکر کی طرح آوازیں لگاتی اندر آئی۔

"ہائے میں مر گئی۔ یہ کون ایرا غیرا نتھو خیرا ہماری دادو کو چٹھیاں لکھ لکھ کر بھیج رہا ہے۔ شکر ہے دادا جی زندہ ہیں، ورنہ انہوں نے تو چٹھی بھیجنے والے کی ایسی کی تیسی کر دینی تھی۔" مانو کی اسپیڈ بریکر کی طرح چلتی زبان کو دادو نے چھڑی مار کر روکا۔

"ہر وقت اول فول بکتی رہتی ہے۔ پڑھ کے سنا مجھے کس نے بھیجا ہے؟" مانو اپنی کمر سہلاتی خط کا لفافہ چاک کرنے لگی۔ فاطمہ بھی تجسس کے مارے اس کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔

"لکھا ہے۔ پیاری بہن زبیدہ! ہائیں دادو آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ آپ کی ایک اور بہن بھی ہے۔" اس نے مشکوک نظروں سے دادو کی طرف دیکھا۔

"خبردار جو اب کوئی فضول بات منہ سے نکالی۔ آگے پڑھو کیا لکھا ہے؟" دادو ہمہ تن گوش تھیں۔

"اچھا سنیں۔ زبیدہ! تو تو بڑی بے وفا نکلی ہے۔ کتنا کہتی تھی تو مجھ سے کہ زہرہ شہر جا کر تجھے کبھی نہیں بھولوں گی۔ پر تو نے تو کبھی مجھے بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ تو جانتی ہے نا میں دل کی بڑی کمزور ہوں اور تیری بے وفائی نے تو میرا دل ہی ٹوٹے ٹوٹے کر دیا ہے۔

"دادو! یہ جو کوئی بھی ہیں انہوں نے بس آپ کو کھری کھری سنانے کے لیے خط لکھا ہے۔" مانو جل کر بولی، مگر دادو کا چھڑی کی طرف بڑھتا ہاتھ دیکھ کر آگے پڑھنے لگی۔

"تو نے تو کبھی پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ مگر میں تیرے شہر آنے کی تیاری پکڑ رہی ہوں۔ تیرے گوڈے سے جڑ کر سارے گلے شکوے کروں گی۔ تجھے اپنا وعدہ تو یاد ہے نا۔" مانو نے منہ بنا کر خط بند کیا۔ دادو پراسرار انداز میں برابر مسکرائے جا رہی تھیں۔

"کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔" فاطمہ بور سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چوہا نہیں، دادی زہرہ۔" مانو کہہ کر ہنسی۔

"ہاں یک نہ شد دو شد۔" دونوں تبصرہ کرتی باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆
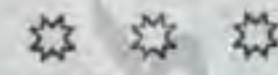
آج دادی زہرہ نے آنا تھا اور دادو نے پورے گھر میں ایمرجنسی نافذ کر رکھی تھی۔ دونوں بہوؤں سے باہمی مذاکرات کے بعد ماجد کو بازار دوڑایا، تاکہ دادی زہرہ کی پسندیدہ سبزیاں اور دالیں وغیرہ چن چن کر لے آئے۔ مانو اور فاطمہ کو دادی زہرہ کے شایان شان بیٹھک سیٹ کرنے کا حکم دیا۔

"دادو! آپ دادی زہرہ کا پلنگ اپنے کمرے میں کیوں نہیں رکھوا لیتیں۔" مانو کی تجویز کو انہوں نے سرے سے مسترد کر دیا۔

"سارا دن چپڑ چپڑ بولتی تھی زہرہ۔ اب تو اس کی یہ عادت پختہ ہو چکی ہوگی۔ نہ خود سوئے گی اور نہ ہی مجھے سونے دے گی۔ مجھ سے اب اس عمر میں راتوں کو نہیں

جاگا جاتا۔" دادو کو اپنے آرام میں کسی کا مخل ہونا ہرگز پسند نہیں تھا۔

"دادو! آپ اپنی عزیز از جان سہیلی کے بارے میں ایسا کہہ رہی ہیں۔ اگر انہوں نے سن لیا تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ ویسے بھی بقول ان کے وہ دل کی بڑی کمزور ہیں۔" فاطمہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"تم لوگ فضول میں دماغ مت چاٹا کرو میرا۔ بس جو کہا ہے وہ کرو۔ اٹیچ باتھ روم میں نیا تولیہ، صابن اور شیمپو وغیرہ یاد سے رکھ دینا۔ لیکن زہرہ تو پہاڑی مٹی سے سر دھوتی تھی۔ اب میں یہ مٹی کہاں سے لاؤں؟" دادو انہیں جھاڑ کر ایک نئی فکر میں مبتلا ہو گئیں۔

"اماں جی! ماجد سامان لے آیا ہے، آ کر ایک بار دیکھ لیں۔" تائی امی نے کچن میں سے نکل کر انہیں آواز دی۔

"یہ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔" زینی نے چشمہ درست کرتے ہوئے گھر میں پھیلی افراتفری کا جائزہ لیا اور اسٹول پر چڑھ کر ساجدہ بھابھی کے گھر جھانکنے لگی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ اپنے ہمسائیوں کے علاوہ یہاں بھی دائیں بائیں آگے پیچھے بسنے والوں سے دوستانہ مراسم قائم کر رکھے تھے۔

"ہائے ربا! کیسا وقت آگیا ہے، دو دن کے لیے اپنی ساس سے کیا ملنے چلی گئی پیچھے سے محلے کے شتر بے مہار بچوں نے تو میری بیری کی چھانٹی ہی کر ڈالی ہے۔" ساجدہ بھابھی نے زینی کے آگے اپنا دکھڑا رو دیا۔

"بھابھی! یہ تو بہت برا ہوا۔ آپ کچھ نہ کچھ "حفاظتی اقدامات" کر کے ہی جاتیں۔" زینی نے ہمدردی سے کہا۔

"ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ یہ حرکت کی کس نے ہے۔ میں نے ایسا سبق سکھانا ہے کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔" ساجدہ بھابھی کے انتقامی جذبات بے دار ہونے لگے۔ زینی جھر جھری لے کر پیچھے ہٹی۔

"مشتو نگڑی! تمہیں دیواروں پر لٹکنے کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے یا نہیں؟" دادو کی نظر کرم اب اپنی نواسی پر پڑی تھی۔ ٹانگوں پر چھڑی مار کر نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"نانو! لینگویج پلیز۔" چھڑی سے زیادہ تو لفظ "مشتو نگڑی" نے بلبلانے پر مجبور کر دیا۔

لیکن دادو کے تو آج سارے انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ نواسی کو صحن کی "اچھی طرح" صفائی کرنے کا کام ذمہ لگا کر خود کچن میں گھس گئیں۔ جہاں دونوں بہوئیں دادی زہرہ کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے دعوت شیراز کا بندوبست کرنے میں مصروف تھیں۔ مانو اور فاطمہ نے بیٹھک سے ہاتھ ہلا کر اسے "بیسٹ آف لک" کا اشارہ کیا اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔ زینی نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پائنچے چڑھائے، دوپٹہ کمر پر باندھا اور صفائی میں جت گئی۔

"بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔" وہ شڑاپ شڑاپ کر کے صحن دھونے میں مگن تھی۔ ہاتھوں اور زبان پر بریک اس وقت لگا جب پانی کے چھینٹے سامنے سے آتے نواز بھائی کے سفید کاٹن کے سوٹ کو داغ دار کر گئے۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟ جو کام کرنا نہیں آتا وہ کرتی کیوں ہو؟" نواز بھائی اپنے بے شکن لباس پر بنے نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے غصے سے بولے۔

"میں تو کام میں مصروف تھی۔ آپ کیا آنکھیں بند کر کے چل رہے تھے؟" وہ آہستگی سے بڑبڑائی۔

"کیا کہا تم نے؟" نواز بھائی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"نواز بھائی! داغ تو اچھے ہوتے ہیں! ویسے بھی جب تک کام کریں گے نہیں تو سیکھیں گے کیسے؟" وہ معصوم بن کر بولی۔

"ایسا میں نہیں بلکہ سرف ــــ والے کہتے ہیں۔" ان کی خشمگیں نگاہوں سے خائف ہو کر جلدی سے وضاحت دی۔

"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ مایوسی سے سر ہلاتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

"آخر کار "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔" کی عملی تفسیر بنی دادی زہرہ خراماں خراماں چلتی اندر آئیں

اور دادو کے گلے لگ گئیں۔ کافی دیر رونے دھونے کا سیشن جاری رہا۔ آخر تائی امی نے انہیں آگے بڑھ کر پانی کا گلاس تھمایا۔

"لو زہرہ! پانی پیو۔" دادو نے گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

"نہیں زبیدہ! پہلے تو پی۔ تو مجھ سے بڑی ہے نا' اس لیے پہلا حق تیرا بنتا ہے۔" دادی زہرہ بڑے ادب سے بولیں اور صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ دادو "بڑی عمر" والا طعنہ پانی کے گلاس کے ساتھ غٹا غٹ پی گئیں۔

"زہرہ! یہ دونوں میری بہوویں ہیں۔ بڑا ذکر کرتی تھی میں ان سے تیرا۔" دادو نے رسم تعارف نبھائی۔

"اور یہ میری پوتیاں۔۔۔" بائیں طرف دیکھا جہاں پوتیاں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھیں۔

"خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گی دادیاں دو۔" ریلنگ پر جھک کر نیچے کا نظارہ کرتے ہوئے مانو نے تبصرہ کیا اور تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

☆ ☆ ☆

دادو کی زبانی دادی زہرہ کی آمد کا مقصد سن کر بیٹ کی ہلکی زینی سرپٹ فاطمہ کے کمرے کی طرف دوڑی۔ اندر سے بند دروازے کو اس بری طرح سے دھڑ دھڑایا کہ مانو کی آئی بروز بناتی فاطمہ سے کٹ لگتے لگتے رہ گیا۔ ویسے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ کٹ لگنے کی صورت میں تو اس نے فاطمہ کو زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔

"کون بدتمیز ہے؟" دروازہ کھلتے ہی "بدتمیز" افتاں و خیزاں اندر داخل ہوئی اور چٹا چٹ مانو کی بلائیں لے ڈالیں۔

"ہائے مانو! تم کتنی خوش قسمت ہو۔" دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی مانو اس افتاد پر بوکھلا گئی۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ پیچھے ہٹو۔ میرا کون سا دس کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آیا ہے جو تم میری قسمت پر رشک کر رہی ہو۔" زینی کو دور دھکیل کر وہ چھوٹا شیشہ اٹھا کر آئی بروز چیک کرنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے دادی زہرہ کیوں آئی ہیں؟" زینی حسب عادت سسپنس پھیلاتے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے دادو سے ملنے۔" فاطمہ نے اکتا کر کہا اور ہاتھوں پر دھاگہ لپیٹنے لگی۔

"ارے نہیں پاگل۔ دادی زہرہ اپنے پوتے کا رشتہ لے کر آئی ہیں مانو کے لیے۔ کیونکہ دادو نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی پوتی کی شادی ان کے پوتے سے کریں گی۔ اب وہ دادو کو ان کا وعدہ یاد دلانے آئی ہیں۔" زینی نے آخر کار ان دونوں کے سر پر دھماکہ کر ہی دیا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" مانو غصے سے جھنجلا کر بولی۔

"بکواس نہیں' بلکہ سچ ایک دم سچ۔ ابھی اپنے گناہ گار کانوں سے سب کچھ سن کر آ رہی ہوں۔" زینی مطمئن تھی۔

"ہائے مانو کتنا مزا آئے گا تمہاری شادی میں' قسم سے مجھے گاؤں کی شادی اٹینڈ کرنے کا بہت شوق ہے۔" فاطمہ بھی پرجوش ہو گئی۔

"پٹو گی تم لوگ میرے ہاتھوں سے اور دادو سے تو میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔" وہ غصے سے تن فن کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے رکو تو ابھی تمہاری دوسری آئی برو بنانی ہے۔" فاطمہ نے آگے بڑھ کر اسے باہر جانے سے روک دیا۔

"بھاڑ میں گئی آئی برو۔ دادو میرے خلاف یہ جو کھچڑی پکا رہی ہیں' میں نے اس کا دلیہ بنا دینا ہے۔" فاطمہ کو ایک طرف ہٹا کر وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترنے لگی۔

"دادو! آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔" بہوؤں سے انتہائی خوش گوار موڈ میں گفتگو فرماتی' دادو اس کی مداخلت پر بدمزا ہو گئیں۔

"یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے؟ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھو۔" ان کی پہلی نظر اس کے زمین پر رلتے دوپٹے

پر پڑی تھی۔

"اوڑھ لوں گی۔ لیکن پہلے آپ میری بات سنیں۔ بچپن میں اپنی گڑیوں سے کھیلنے کی بجائے آپ اپنی سہیلیوں سے کس قسم کے وعدے کرتی پھرتی تھیں؟" امی کی گھورتی نظروں کو نظر انداز کر کے وہ جرح کرنے والے انداز میں بولی اور ساتھ رکھا موڑھا کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو تمہیں پتا چل گیا ہے۔" دادو نے چشمے کی اوٹ سے زینی کو گھورا۔ نیوز والی ساری عادتیں اسی میں تھیں۔

"مجھے کسی اجڈ' دیہاتی' ان پڑھ سے ہرگز شادی نہیں کرنی اور گاؤں میں رہنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ بس ان محترمہ کو صاف صاف انکار کر دیں میری طرف سے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر قطعی انداز میں بولی۔

"تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے بڑوں کی باتوں میں مداخلت مت کیا کرو۔ ویسے بھی لڑکیاں ان معاملوں میں نہیں بولتیں۔" امی نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

"ٹھیک ہے جو دل چاہے کرتی رہیں' مگر پھر جو میں کروں گی نا تو پھر کچھ مت کہیے گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خبردار! اگر زہرہ کے سامنے الٹی سیدھی حرکت کی تم نے۔ دیکھا بہو میں نا کہتی تھی یہ ہمیں ضرور شرمندہ کروائے گی۔" دادو اسے تنبیہہ کر کے بہو کے سامنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگیں۔ اسی وقت دادی زہرہ بیٹھک سے نکل کر ان کی طرف چلی آئیں۔

"زبیدہ! دیکھ میں اپنی آمنہ دھی کے لیے سونے کے کنگن لے کر آئی ہوں۔ یہ مجھے میری ساس نے پہنائے تھے۔ بڑا ارمان تھا کہ اپنے سجاول پتر کی دلہن کو اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گی۔" دادی زہرہ نثار ہوتی نظروں سے مانو کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ماشاء اللہ! اپنی مانو کے ہاتھوں میں خوب سجیں گے۔" تائی امی توصیفی انداز میں بولیں تو امی بھی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ مانو پاؤں پٹخ کر وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

"میری دھی رانی شرما گئی ہے۔" دادی زہرہ نہال ہو کر بولیں۔

☆ ☆ ☆

"مانو! ایک جگہ پر سکون سے بیٹھ جاؤ۔ یوں ٹانگیں گھسانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اس مسئلے کا حل سوچنا چاہیے۔" فاطمہ نے کمرے میں غصے سے چکر کاٹتی مانو سے کہا۔

"اب پتا چلا ہے کہ دادو مجھے اپنی دوست کے سامنے اصغری بنا کر پیش کرنے کی سرتوڑ کوششیں اس لیے کر رہی تھیں۔ اگر مجھے ان کے عزائم کا پہلے سے پتا ہوتا تو۔۔۔" اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"تو کیا کر لیتیں؟" زینی نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ مانو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ لیکن اسی وقت تیمور دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور آتے کے ساتھ ہی صوفے پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"اپنی قیمتی جان پر کھیل کر بڑی مشکلوں سے نانو کی نظر بچا کر آیا ہوں' ورنہ انہوں نے تو گویا قسم کھائی ہوئی ہے کہ جب تک ان کی سہیلی صاحبہ یہاں پر قیام پذیر ہیں تب تک میں ان کی پوتی محترمہ آمنہ صاحبہ سے کم از کم ایک سو پچاس فٹ دور رہوں۔ تاکہ میری جانشین کو مجھ سے کوئی نیا گر سیکھنے کا موقع نہ مل سکے۔ ہونہہ ظالم سماج۔" زینی نے پانی کا گلاس بھائی کی طرف بڑھایا' جسے وہ ایک ہی سانس میں غٹا غٹ چڑھا گیا۔

"ہائے واوے مانو! کیا واقعی تمہاری شادی ہو رہی ہے؟" خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے وہ رازداری سے مانو کی طرف جھک کر بولا۔

"ہاں تمہیں کوئی شک ہے؟ پرسوں ولیمہ ہے' بریانی کھانے ضرور آنا۔" مانو نے چڑ کر کہا اور پھر سے کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگانے شروع کر دیے۔

"عزیز ہمشیرہ! آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں ہوں نا تمہارا گرو۔ ابھی تمہارا مسئلہ چٹکیوں میں حل کیے دیتا

ہوں۔" تیمور کے کہنے پر وہ سچ مچ کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ گویا اسے پکا یقین ہو کہ گرو اپنی جانشین کا مسئلہ واقعی چٹکیوں میں حل کردے گا۔

"فاطمہ! تم اور زینی جاکر دادی زہرہ کو مانو کی ساری اصلیت بتادو۔ دیکھنا وہ خود ہی اپنے اس نیک ارادے سے باز آجائیں گی۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں غلطی سے بھی مانو کو اپنی بہو بنانے کی غلطی نہیں کریں گی۔" تیمور کے اطمینان سے کہنے پر مانو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟ کون سی اصلیت؟"

"یہی کہ اپنی مانو درختوں پر چڑھنے میں گلہریوں کو بھی مات دیتی ہے۔ بائیک چلانا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور تو اور نشانے باندھنے میں اتنی ماہر ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے نشانے باز اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔" تیمور نے ایک ہی سانس میں اس کی چیدہ چیدہ خوبیاں گنوادیں۔

"لیکن دادی زہرہ ہمیں اکیلے میں بھلا کہاں دستیاب ہوں گی؟ ہر وقت تو وہ یک جان دو قالب بنی رہتی ہیں۔" زینی کو نئی فکر نے آن گھیرا۔ فاطمہ بھی سوالیہ نظروں سے تیمور کو دیکھنے لگی۔

"میرا کام تھا راستہ بتانا اب منزل تک پہنچنا تم لوگوں کا اپنا کام ہے۔" تیمور کندھے اچکا کر بولا۔

"تیمور بیٹا! آج تمہارے ماموں کے کچھ دوست کھانے پر آرہے ہیں۔ ذرا مارکیٹ سے یہ سامان تو لادو۔ ماجد بے چارہ تو آج اماں جی کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ اسٹور میں سالوں سے بند کاٹھ کباڑ کو دھوپ لگوانے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔" تائی امی نے کمرے میں موجود حاضرین پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور لسٹ تیمور کی طرف بڑھا دی اور حسب عادت جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تیمور لسٹ پر نظریں دوڑاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ مانو کی امید بھری نظریں فاطمہ اور زینی کی طرف اٹھ گئیں۔ اب جو کچھ کرنا تھا ان دونوں نے مل کر کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

دادو نے اپنی اکلوتی دختر نیک اختر پھپھو سکینہ کو آج دادی زہرہ سے ملوانے اور مشورہ کرنے کے لیے خاص طور پر بلوالیا۔ امی اور تائی امی بڑی پیٹی کھول کر سامان کا تفصیلی جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ گھر میں زور و شور سے ہوتی تیاریوں کو دیکھ دیکھ کر مانو جلے پیر کی بلی کی مانند یہاں سے وہاں چکراتی پھر رہی تھی۔ آخر کار جب صبر کے سارے پیمانے چھلک گئے تب مانو نے فاطمہ اور زینی کو زبردستی دادو کے کمرے کی طرف دھکیلا۔

دادو اپنی خاص الماری میں سالوں سے سنبھالی چیزیں دادی زہرہ کو دکھانے میں مصروف تھیں۔ دونوں کی بے وقت اور بغیر اجازت مداخلت گراں گزری۔

"دادو! پتا ہے آپ کی مرغیوں نے آج کتنے انڈے دیے ہیں؟" دادو کی گھورتی نظروں سے گھبرا کر فاطمہ نے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔

"ہاں صبح گنے تھے میں نے پورے چار تھے۔" دادو جواب دے کر دوبارہ اپنے سابقہ مشغلے میں مصروف ہوگئیں۔

"دیکھو زہرہ! یہ ریاض کے ابا ملتان سے لے کر آئے تھے۔ میں نے نشانی کے طور پر خالی ڈبے سنبھال کر رکھ دیے تھے۔ آج بھی ان کو دیکھتی ہوں تو منہ میں اسی سوہن حلوے کا ذائقہ گھل جاتا ہے۔" دادو نے سوہن حلوے کے خالی ڈبے دادی زہرہ کے سامنے رکھے۔ دادی زہرہ اپنی آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں بسائے ان نوادرات کو دیکھتی جارہی تھیں۔

"لیکن! دادو مرغیاں ہیں پانچ اور انڈے صرف چار کیوں؟" فاطمہ کارپٹ پر ادھر ادھر پھیلی چیزوں کو ہٹا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"ہاں، وہ کٹو آج کل ناغہ کررہی ہے۔ باقی سب تو روز ہی دیتی ہیں۔" اپنی مرغیوں کا ذکر کرتے ہوئے دادو کے لہجے میں شیرینی گھل جاتی تھی۔

"نانو! وہ کھاتی تو سب کے ساتھ برابر کا ہے، پھر انڈے دینے میں ناغہ کیوں؟ یقیناً کٹو بیگم آپ کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ آپ کو اس کے خلاف نوٹس لینا چاہیے۔" زینی صاحبہ جب بھی بولتی تھیں

چھپر پھاڑ کر بولتی تھیں۔

"آئے ہائے باؤلی ہوگئی ہو کیا۔ اب میں ڈنڈے کے زور پہ تو اس سے انڈہ لینے سے رہی۔" انہوں نے گویا نواسی کی عقل پر ماتم کیا۔

"اُفوہ! نانو آپ اس کی مالکن ہیں۔ ہر قسم کا رویہ اختیار کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہیں۔ اس کی شکل دیکھ کر تو لگتا ہے کہ اگلے دو، چار ہفتوں تک اس کا انڈہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت پڑ گئی ہے نا نواب زادی کو۔" زینی کی جذباتی تقریر سن کر فاطمہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ گویا وہ مرغی کے بارے میں نہیں، بلکہ کسی ساس کو اس کی کام چور بہو کے خلاف بھڑکا رہی ہو۔

"اوہو! دادو دراصل زینی کے کہنے کا مطلب ہے کہ کہیں کٹو بیگم کی طبیعت خراب نہ ہو۔ ورنہ اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت کم از کم آپ کی مرغی ہرگز نہیں دے سکتی۔ جا کر دیکھیں تو سہی کہیں اس کے ساتھ سیریس مسئلہ تو نہیں ہے۔" فاطمہ کا مشورہ دادو کے دل کو لگا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کٹو بیگم کی طبیعت کی فکر لگ گئی۔

"جا کر دیکھوں تو سہی بات کیا ہے آخر؟ اتنا سا منہ نکل آیا ہے بے چاری کا۔ ورنہ پہلے تو اس کا سارا دن مصری سے ہنکچے لینے میں گزر جاتا تھا۔"

دادو چھڑی کی ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئیں۔ تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ اب دادو کی واپسی سے پہلے پہلے انہوں نے دادی زہرہ کو مانو کی اصلیت سے آگاہ کرنا تھا۔ تاکہ وہ اسے بہو بنانے کے نیک ارادے سے باز آجائیں۔

"آمنہ کدھر ہے؟ نظر نہیں آرہی؟" دادی زہرہ کو مانو کی کمی محسوس ہوئی تو اس کی بابت پوچھا۔

"اسے بھلا کہاں ہونا ہے؟ چھت پر چڑھ کر گڈی اڑا رہی ہے۔ آج اسے محلے کے سلیم سے بدلہ لینا ہے۔ جس نے پرسوں اس کے گڈے پر بو کاٹا مارا تھا۔ ویسے دادی آپ ایک ایک بار پھر سوچ لیں کہیں شہری بہو لانے کا خواب آپ کو مہنگا نہ پڑ جائے۔" زینی تو اس وقت پوری کی پوری پھاپھا کٹنی بن گئی تھی۔ ویسے بھی وہ دونوں سوچ کر آئی تھیں کہ جی بھر کے مانو کی برائیاں کرنی ہیں۔

"ہاں تو اور کیا؟ جسے انڈہ تک ابالنا نہ آتا ہو اور جسے یہ تک پتا نہ ہو کہ چائے بنانے کا طریقہ کیا ہے، وہ بھلا آپ کی اتنی وڈی حویلی کا انتظام کیسے سنبھالے گی؟" فاطمہ جوش سے بولتی ان کے اور قریب ہوگئی۔

دادی زہرہ کے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ ایسی ہی "آنے کے ان سے آئے بہار" والی بہو لانا تو ان کا دیرینہ خواب تھا۔ ورنہ جب سے وہ آئی تھیں تب سے زبیدہ نے "میری پوتی بہت سادہ، فرماں بردار اور اللہ میاں کی گائے ہے۔" جیسی باتیں بتا کر تو انہیں ہولائے رکھا تھا۔ وہ دونوں ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے بے خبر زور و شور سے مانو کی برائیاں کرنے میں مگن تھیں۔

"دادو! مانو ایسی بالکل بھی نہیں ہے۔ جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ یہ تو دادو نے آج کل اس کی تمام "شرارتی و غیر شرارتی" سرگرمیوں پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ ورنہ اگر آپ اس کی حرکتیں دیکھتیں تو دنگ رہ جاتیں۔" دور سے دادو کی چھڑی کی ٹک ٹک سنائی دی تو دونوں کی چلتی زبانوں کو بریک لگ گئے اور وہ وہاں سے کھسکنے کے لیے پر تولنے لگیں۔

"دادی! آپ پلیز یہ سب کچھ دادو کو مت بتائیے گا۔ ورنہ وہ ہم پر بہت غصہ کریں گی۔" فاطمہ نے ان سے اتنے منت بھرے لہجے میں کہا کہ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ دادی زہرہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر انہیں یقین دہانی کروائی۔

"کیا ہوا؟ کام بن گیا؟" بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتی مانو بھاگ کر ان کے قریب آئی۔

"ارے دادو ہمیں، ایسی پٹی پڑھائی ہے دادی زہرہ کو کہ اگر تم دنیا کی آخری لڑکی بھی ہو میں تو وہ ہرگز اپنے پوتے کی شادی تم سے نہیں کریں گی۔" زینی فخریہ لہجے میں بولی اور دھپ سے صوفے پر گر گئی۔ گویا کسی بڑے محاذ سے واپس آئی ہو۔

"سچ کہہ رہی ہو؟" مانو بے یقینی سے بولی۔
"تمہیں ہماری قابلیت پر کوئی شک ہے؟" فاطمہ نے برا مناتے ہوئے کہا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش کرنے لگی۔
"کیوں اندر گھسی ہوئی ہو' باہر اتنی اچھی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ آجاؤ میں تمہارے سر پر تیل کی مالش کردوں۔" تائی امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے ان سے کہا۔

منصوبے پر عمل درآمد تو کیا جاچکا تھا۔ اب بس نتائج دیکھنا باقی تھے۔ امید اچھی تھی۔ سو تینوں ہلکی پھلکی ہو کر نرم گرم دھوپ کا مزا لینے باہر صحن میں چلی آئیں۔ امی دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی بنا رہی تھیں۔ نواز بھائی آج شاید فیکٹری نہیں گئے تھے۔ اس لیے فرصت سے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سب سے پہلے مانو پیڑھی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ تائی امی کے نرم ہاتھوں کا مساج اسے بہت مزا دیتا تھا۔ تینوں باری باری مالش کروا کے چھت پر چلی گئیں۔

ابھی دادو کی ان پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ورنہ جب سے ساتھ والی رفعت خالہ کا فلمی دیور اپنی چھت پر چھنو سے باضابطہ ملاقات کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ تب سے دادو نے ان کے چھت پر جانے پر پابندی عائد کردی تھی۔

"ہم کیوں اس چھوٹے ڈون کی وجہ سے اپنی چھت سے محروم رہیں۔" تیل سے چپڑے بالوں کو فولڈ کر کے کیچر میں مقید کرتے ہوئے مانو نے ناک چڑھا کر کہا۔ وہ اس قسم کی پابندیوں کو بھلا کہاں خاطر میں لانے والی تھیں۔

"نواز! تمہارے سر پر بھی مالش کردوں بیٹا؟" تائی امی نے ہولے ہولے اپنی کنپٹیوں کو دباتے نواز بھائی سے پوچھا۔ عرصہ گزر گیا تھا انہوں نے ایسی فرمائشیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔

"آں۔۔۔ نہیں' مجھے ابھی ایک ضروری کام کے لیے باہر جانا ہے۔" وہ اخبار کرسی پر رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ تائی امی آنکھوں میں پھیلتی نمی روکنے کے لیے زور' زور سے آنکھیں جھپکنے لگیں۔ امی نے کچن کی کھڑکی سے یہ منظر بہت دکھ سے دیکھا۔

پورے چھ برس بیت چکے تھے انہیں نواز بھائی کی بے رخی سہتے سہتے۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرادی گئی تھیں۔ انہیں اچھی طرح یاد تھے وہ دن جب نواز تعلیم سے فارغ ہو کر نیا نیا فیکٹری جانے لگا تھا۔ زندہ دل تو تھا ہی' مگر ان دنوں مزاج کی جولانیاں بام عروج پہ تھیں۔ اس کا عقدہ بھی اک دن کھل ہی گیا جب جاگنگ سے واپس آکر اس نے اچانک تائی امی سے اپنی یونیورسٹی فیلو نیلوفر اعجاز کے گھر رشتہ لے کر جانے کی بات چھیڑ دی۔ جبکہ تائی امی شروع ہی سے زینی کو اپنی بہو بنانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ نواز' نیلوفر کے سلسلے میں کس حد تک سیریس ہے۔ ہے بھی یا نہیں؟ تائی امی نے ایک بار اس سے زینی کے بارے میں بات کرلینا چاہی۔ مگر نواز نے صاف انکار کردیا کہ زینی جیسی لاابالی اور نان سیریس لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ تائی امی کے لیے اپنے بیٹے کی خوشی ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔ گھر میں انہوں نے صرف دیورانی کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتادی۔ دادو کو لاعلم رکھنا انہیں فی الحال مناسب لگا۔ کیونکہ وہ بھی نواسی کو نواز کی دلہن بنا دیکھنا چاہتی تھیں۔

اوائل اپریل کی ایک خوش گوار صبح تائی امی اور امی دونوں نیلوفر کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

"زینی سیڑھیوں سے پھسل گئی ہے۔" پھپھو سکینہ کے فون نے ان کی جان ہی نکال دی۔ وہ لوگ سب کچھ بھول بھال کر ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ زینی کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ایک پاؤں بری طرح فریکچر ہو گیا تھا۔ پھپھو سکینہ کا رو' رو کے برا حال تھا۔

"اگر پہلے سے ہی ٹک کر بیٹھنا سکھایا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ شکر کرو کوئی ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی۔ ورنہ لڑکی ذات ہے' کوئی عیب لگ جاتا پھر؟" دادو نے بیٹی کو ڈانٹا۔ ان کا تسلی دینے کا بھی اپنا انداز تھا۔

"اچھا ہے۔ اب دو چار ہفتے بستر پر پڑی رہے گی تو دیواریں اور منڈیریں بھی ذرا سکون کا سانس لے سکیں گی۔" درد سے کراہتی زینی نے آنکھیں میچ لیں۔ زخموں سے زیادہ تو نانو کی باتوں نے کراہنے پر مجبور کردیا۔

"اُفوہ! دادو اب بس بھی کریں۔ ایک تو وہ اتنی زخمی ہے۔ اوپر سے آپ مسلسل اسے برا بھلا کہے جارہی ہیں۔" مانو نے سوں سوں کرتے ہوئے دوست کی سائیڈ لی۔ فاطمہ آنسو پیتے ہوئے اس کی پٹیوں میں جکڑی ٹانگ محبت سے دبانے لگی۔

"آں۔۔۔ فاطمہ کی بچی! چھوڑ اسے پاگل ہو گئی ہو کیا؟" زینی درد سے بلبلا اٹھی۔ فاطمہ نے بوکھلا کر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیے۔ شام ڈھلے سب کی واپسی ہوئی۔ مانو اور فاطمہ زینی کی تیمارداری کے لیے اس کے پاس ہی ٹھہر گئیں۔

دن کسی خزاں رسیدہ شجر کے پتوں کی طرح ایک ایک کر کے گرتے رہے تھے۔ نت نئی مصروفیت نے نیلوفر کے گھر جانے کا کام التوا میں ڈال دیا۔ لیکن ایک دن گھر کے کام جلدی سے نبٹا کر دونوں نواز کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئیں۔ پوش علاقے میں واقع وہ گھر اور اس کے مکین انہیں اچھے لگے تھے۔ نیلوفر کی والدہ سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ ان لوگوں کی آمد کا مقصد جان کر انہوں نے مناسب الفاظ میں معذرت کرلی۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو خوامخواہ کی زحمت اٹھانا پڑی۔ چند روز پہلے ہی ہم نے نیلوفر کا رشتہ اس کی خالہ کے بیٹے سے طے کردیا ہے۔ اس مہینے ان شاء اللہ شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا ارادہ ہے؟" انہوں نے تو گویا بات ختم کردی تھی۔ مگر بات ختم کہاں ہوئی تھی؟

نواز کے غیر متوقع ردعمل نے ان کی راتوں کی نیندیں تک اڑادیں۔ ان کا خیال تھا کہ نواز ان پر غصہ کرے گا۔ نیلوفر کے گھر دیر سے جانے پر گلہ کرے گا۔ مگر اس نے تو سب کچھ سن کر چپ سادھ لی۔ ایک لفظ تک نہ کہا اور تائی امی کو اس کی جامد مسلسل خاموشی نے توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے خود کو فیکٹری کے کاموں میں بری طرح مصروف کرلیا تھا اور گھر والوں سے آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔

"یہ نواز بھائی کو کیا ہوا ہے؟" ایک دن زینی حیرانی سے کہنے لگی تو وہ چونک گئیں۔
"کیوں تمہیں کچھ کہا ہے اس نے؟"
"نہیں۔ کچھ کہا تو نہیں ہے' لیکن وہ کچھ عجیب سے نہیں ہوگئے؟" زینی ہم کلامی کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔ یوں ہی ایک ہی زاویے پر بیٹھے کتاب ماضی کے اوراق پلٹتے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔
"بھابھی!" امی نے ان کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئیں۔
"آجائیں کھانے کا ٹائم ہو رہا۔"

☼ ☼ ☼

"مانو!" فاطمہ کی زوردار چیخ نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔ امی کے ہاتھ سے مٹروں کا تھال چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ مٹر کے دانے یہاں وہاں پھیلتے چلے گئے۔ دادی زہرہ سے اپنی مرغیوں کا تفصیلی تعارف کرواتی دادو نے دہل کر ہاتھ کلیجہ پر دھر لیا۔
"کیا ہوا ہے؟" تائی امی گیلے آٹے سے سنے ہاتھ لیے کچن سے باہر نکل آئیں۔
"وہ۔۔۔ ہمارا رزلٹ آؤٹ ہو گیا ہے۔ ہم پاس ہو گئے ہیں۔" سب کی حیران پریشان نظریں خود پر جمی دیکھ کر وہ آہستگی سے بولی اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ چھت پر چڑیوں کے کٹورے میں پانی ڈالتی مانو تک بھی اس کی چیخ بخوبی پہنچ گئی۔
"یا اللہ! یہ لڑکیاں ایک نہ ایک دن میرا ہارٹ فیل کروا کر رہیں گی۔" دادو نے دو' دو کر کے سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اترتی پوتی کو دیکھ کر ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ زینی تک بھی غالباً" اطلاع پہنچ چکی تھی۔ جب ہی حسب عادت پونی ٹیل جھلاتی اندر داخل ہوئی اور جملہ حاضرین پر نگاہ غلط ڈالے بغیر مانو اور فاطمہ کے

گلے لگ گئی۔

"نواز بھائی! ہمیں اس بار گولڈ کی چین چاہیے۔" فاطمہ نے لاڈ سے بھائی سے فرمائش کی۔

"شیور گڑیا! وائے ناٹ۔" نواز نے مسکرا کر کہا۔ پھپھو سکینہ رات کو پھپھا اور تیمور کے ساتھ پہنچ گئیں۔ تائی امی نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا۔ وہ لوگ رزلٹ ڈے ہمیشہ یوں ہی جوش و خروش سے مناتے تھے۔

"میں اگرچہ مقابلے کے امتحان کی تیاری میں بری طرح مصروف تھا۔ مگر جب لوگوں کی کامیابی کا پتا چلا تو رہا نہیں گیا۔ منہ میٹھا تو کرواؤ۔" تیمور نے پاس سے گزرتی فاطمہ سے کہا تو اس نے مٹھائی کی پلیٹ اس کی طرف بڑھادی۔

"جی نہیں' پہلے گفٹ' پھر مٹھائی۔" مانو نے جلدی سے پلیٹ جھپٹ لی۔

"مانو! خدا کو مانو یار کیوں ہر وقت ظالم سماج بن کر بیچ میں ٹپک پڑتی ہو۔" تیمور نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

"آجاؤ بچو! کھانا تیار ہے۔" امی کے بلانے پر وہ کندھے اچکاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"زہرہ! تم کچھ کھا کیوں نہیں رہیں؟" دادو نے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی دادی زہرہ سے پوچھا۔

ٹیبل پر انواع و اقسام کی ڈشز تھیں۔ دادی زہرہ نے اپنے سامنے رکھے دیسی کھانوں پر نظر ڈالی اور آہستگی سے بولیں۔

"بس دل نہیں چاہ رہا ہے کچھ کھانے کو۔" حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا صاف صاف کہہ دیں' سبزیاں کھا کھا کر تو لگتا ہے میرے پیٹ میں پورا کھیت اگ آیا ہے۔

"ہاں جی! اگر سالن پسند نہیں آیا تو آپ یہ کوفتے ہیں نا اور یہ بریانی بھی۔" تائی امی نے ان کی طرف ڈونگہ بڑھایا۔ ان کی تو مانو دل کی مراد بر لائی۔ ساگ' شلجم اور ٹنڈے وغیرہ کے سالن کو جلدی سے پرے کھسکا دیا۔

کتنے دن ہوگئے تھے مروت میں سبزیاں کھاتے کھاتے۔ آج تو انہوں نے شہری کھانوں پہ خوب ہی ہاتھ صاف کیا۔ دادو بے چاری تو اپنی سہیلی کی کسی زمانے میں پسند کردہ سبزیاں اہتمام سے پکوائی تھیں۔ انہیں کیا پتا تھا کہ دادی زہرہ جیسا دیس ویس بھیس والے مقولے پر عمل کرنا چاہتی تھیں۔

"آمنہ پتر! مجھے صبح وہ بنا کر دو گی جو ڈبل روٹیوں کو اوپر تلے رکھ کر بناتے ہیں۔ جس کے اندر شاید کوئی انڈہ شنڈہ بھی رکھا ہوتا ہے۔" دادی زہرہ نے فروٹ ٹرائفل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لاڈ سے مانو سے فرمائش کی۔ مانو کو اچھو لگ گیا۔ فاطمہ نے اپنی ہنسی چھپانے کے لیے پانی کا گلاس منہ سے لگالیا۔

"سوری دادی! مجھے تو یہ چیز بنانی نہیں آتی۔ آپ کو فاطمہ اور زینی نے بتایا تو تھا کہ ......" انہیں جواب دے کر وہ فاطمہ کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگی۔ اگر انہیں ساری اصلیت بتادی تھی تو پھر یہ فرمائش' چہ معنی دارد؟

مانو نے پوری کلاس میں ٹاپ کیا تھا اور اپنی اس کامیابی پر وہ حد درجہ مسرور تھی۔

"مانو! ہمیں ٹریٹ چاہیے اور وہ بھی اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ میں۔ آخر ارسہ الیاس کو ہرانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔" فاطمہ نائٹ کریم کا ہاتھوں پر مساج کرتے ہوئے بولی۔

"اوکے! ڈن نہ صرف ٹریٹ دوں گی' بلکہ شاپنگ بھی کرواؤں گی۔"

☼ ☼ ☼

"او خدا کی بندیو! اب بس بھی کرو۔ ہم لوگ کسی شادی کے فنکشن میں نہیں جارہے جو تم لوگ یوں بج سنور رہی ہو۔" پچھلے ایک گھنٹے سے فاطمہ اور زینی کی تیاریاں دیکھ دیکھ کر مانو کو خفقان ہونے لگا۔

"مانو! دراز سے میری سلور کلر کی اسٹیل والی چوڑیاں نکال دو پلیز۔" فاطمہ نے ٹاپس پہنتے ہوئے عجلت سے کہا تو مانو بھنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"صرف دس منٹ ہیں تم لوگوں کے پاس۔ اگر اس سے زیادہ دیر کی تو باہر جانا کینسل۔ میں تو ابھی تک حیران ہوں کہ دادو نے ہمیں اتنی آسانی سے اجازت کیسے دی؟" فاطمہ کی چوڑیاں نکال کر اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیں۔

"شاید انہیں لگا ہو کہ پوتی بے چاری اب کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ اس لیے اس کی زیادہ سے زیادہ خواہشیں پوری کی جانی چاہئیں۔" زینی نے سینڈل پہنتے ہوئے قیاس آرائی کی۔

"بکومت' اگر ایسا ہے تو میں ابھی جاکر ان کی یہ غلط فہمی دور کردیتی ہوں۔" مانو اسے گھورتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہنے کے لیے باہر نکل آئی۔

"بی بی! گاڑی تو سروس کے لیے گئی ہوئی ہے۔ ورکشاپ والے نے آج شام تک کا کہا ہے کہ ٹھیک ہوجائے گی۔" پروین کے ساتھ مذاکرات میں مصروف گل خان کے جواب نے اس کا موڈ آف کردیا۔

"یہ ساری رکاوٹیں کس بات کی طرف اشارہ کررہی ہیں؟ نواز بھائی اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ تیمور ایگزامز میں مصروف ہے اور اب گاڑی غائب' میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا الارم دے رہی ہے۔" فاطمہ کی بات سن کر زینی چڑ گئی۔

"اُفوہ! کسی ٹیکسی سے چلے جاتے ہیں۔ اب اتنا تیار ہونے کے بعد پروگرام کینسل کرنا فضول ہے اور ویسے بھی شاید دوبارہ ایسا موقع نہ ملے۔" زینی کے کہنے پر مانو نے فاطمہ کی طرف دیکھا تو اس نے تمہاری مرضی کہہ کر کندھے اچکا دیے۔

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس ریسٹورنٹ میں کرم دین کا انتظار کررہا تھا اور ابھی تک اس کے یہاں پر آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ گزشتہ چار سالوں سے مالٹوں کے باغات کا ٹھیکہ اس نے کرم دین کے حوالے کیا ہوا تھا اور ہر گزرتے سیزن میں مالٹوں سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کمی اس کی حیرت اور پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ منشی چاچا نے اسے دبے لفظوں میں اس بار خود ہی سارے معاملات پر نظر رکھنے کو کہا۔ شک تو اسے پہلے سے ہی تھا۔ مگر ظہور (ملازم) سے حاصل ہونے والی تفصیل نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ کرم دین اگرچہ قابل اعتبار اور ایمان دار آدمی تھا۔ مگر زر' زمین اور زن کے چکر میں اچھے اچھوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔

"اگر وہ بے قصور اور سچا ہوا تو تم سے ملنے ضرور آئے گا۔" منشی چاچا کے کہنے پر اس نے آج خود ہی اکیلے میں اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ڈیر کزنز! آج کا لنچ میری طرف سے۔ اس لیے جو دل چاہے آرڈر کرو۔" مانو گردن اکڑا کر شاہانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"کانگریچولیشن اینڈ سیلی بریشن۔" زینی کارنش بجا لائی۔

"ویسے مانو! اگر ہوسکے تو اپنی نہ ہونے والی ساس کے لیے بھی کوئی برگر وغیرہ پیک کروالو۔ کیونکہ سنا ہے کہ وہ شہری کھانے بہت شوق سے تناول فرماتی ہیں۔" فاطمہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ اپنی رسٹ واچ پر بے زاری سے نظریں دوڑاتے سجاول حسین کو ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ اپنا نعمان اعجاز یہاں کیا کررہا ہے؟" مانو تمام لوگوں پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ اس کی نظروں کا محور وائٹ کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس سجاول حسین تھا۔

"جی منشی چاچا! آپ نے صحیح کہا تھا۔ کرم دین میرے بلانے کے باوجود بھی نہیں آیا۔" اس نے کال کرکے منشی چاچا کو بتادیا' کرم دین کو نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا۔ مزید انتظار کرنا اسے بے کار لگا۔ دفعتاً" ایک حیران پریشان آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ اسی سمت گردن موڑ کر دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔

"او مائی گاڈ! لگتا ہے میں اپنا والٹ تو گھر بھول آئی ہوں۔" مانو کی بات سن کر دونوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"کیا مطلب؟ دماغ خراب تو نہیں ہوگیا ہے تمہارا؟" زینی اس کا بیگ چیک کرنے لگی۔

"اندر واقعی والٹ نہیں ہے۔" وہ مرے مرے

لہجے میں بولی۔

''مانو کی بچی! یہ سب تمہاری جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ اب ہم کیا کریں گے؟'' فاطمہ بے چینی سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے روہانسے لہجے میں بولی۔

''یہ عمرو عیار کی زنبیل کندھے پر لٹکانے سے پہلے ذرا اندر ''جھانکی'' بھی مار لی ہوتی کہ اندر کچھ ہے بھی یا نہیں۔'' زینی کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

''وہ والا ویٹر ہمیں مشکوک نظروں سے گھور رہا ہے۔'' فاطمہ کو تو اب سب کچھ ''مشکوک'' نظر آرہا تھا۔

''کہیں جرمانے کے طور پر ہمیں یہ سارے برتن نہ دھونے پڑ جائیں۔'' زینی کی بات سن کر تو فاطمہ کا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس نے چشم تصور میں خود کو برتن دھوتے ہوئے دیکھا تو زور سے جھرجھری لی۔

''مانو کی بچی ہمیشہ ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے اینڈ میں۔'' زینی کو بہت کچھ یاد آرہا تھا۔

''اُفوہ! تم لوگ تو یوں مجھے ڈانٹ رہی ہو جیسے میں نے جان بوجھ کر یہ سب کیا ہو۔'' ایک تو وہ خود بھی اچھی خاصی پریشان تھی دوسرا ان لوگوں کی باتیں اسے غصہ دلا رہی تھیں۔

''غلطی میری ہے اور میں ہی اسے سدھاروں گی۔''

''کیا کرو گی تم؟'' فاطمہ نے سراسیمگی سے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ تو کر ہی لوں گی۔'' وہ ایک عزم سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایکسکیوزمی سر! مجھے آپ کی ہیلپ چاہیے۔ نہ جان نہ پہچان' وہ حیرت سے اپنے سامنے کھڑی اس کامنی سی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

''جی فرمائیے!'' گرچہ وہ ان کی ساری باتیں من وعن سن چکا تھا مگر پھر بھی اسے یہ قطعی امید نہیں تھی کہ وہ ہیلپ لینے اسی کے پاس آئے گی۔

''ایکچوئلی سر! میں اپنی کزنز کو ٹریٹ دینے آئی ہوں۔ اور پتا نہیں کیسے میں اپنا والٹ گھر پر ہی بھول کر آگئی ہوں۔ آپ پلیز مجھے پانچ ہزار ادھار دے دیں۔ میں بہت جلد آپ کو لوٹادوں گی۔ دیکھیں سر! ہم ایسی ویسی لڑکیاں بالکل بھی نہیں ہیں بس اس بار اکیلی گھر سے باہر نکلی ہیں نا تو یہ گڑبڑ ہو گئی۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ فاطمہ اور زینی منہ پھاڑے اسے حیرت سے تکنے لگیں۔ وہ دانستہ ان کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

سجاول نے دس ہزار اس کی طرف بڑھائے جس میں سے اس نے گن کر پانچ ہزار اپنے پاس رکھ لیے اور باقی واپس کر دیے۔ اور بغیر کوئی شکریے کے کلمات ادا کیے وہ واپسی کے لیے مڑ گئی۔

''ارے آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔'' یاد آنے پر وہ دوبارہ پلٹ کر بولی۔

''نعمان اعجاز۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''کیا واقعی؟'' وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔ (لیکن نعمان اعجاز تو آج کل کلین شیو ہے؟)

''کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟'' اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آں نہیں' مجھے بھلا کیوں اعتراض ہو گا؟'' مانو نے گڑبڑا کر کہا اور سرعت سے اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی اسے زینی اور فاطمہ کو بھی اطمینان دلانا تھا۔ جن کے چہرے پر کھد بد کے اثرات صاف نظر آرہے تھے۔

☼ ☼ ☼

''آج اتنی گھٹن کیوں محسوس ہو رہی ہے؟'' اس نے کام کرتے کرتے سر اوپر اٹھایا اور کھڑکی کھول دی۔ تازہ ہوا نے اندر داخل ہو کر کمرے کی بوجھل فضا کو خاصی حد تک خوش گوار یت میں بدل دیا' مگر اندر کی گھٹن پھر بھی کم نہ ہوئی تو وہ گاڑی کی چابیاں اور موبائل اٹھا کر آفس سے باہر نکل آیا۔

''بھائی! اس بار ہمیں گولڈ کی چین چاہیے۔'' فاطمہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو اس نے گاڑی کا رخ مارکیٹ کی طرف موڑ دیا۔

”عاصم! یہ دیکھیں کیسا لگ رہا ہے؟“ کھنکتی ہوئی شناسا آواز نے اسے اپنی جگہ پر ساکت کردیا۔ اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے میں اسے گویا صدیاں لگ گئیں۔

”نیلوفر اعجاز!“ پورے چھ سال بعد یہ نام اپنی زبان سے ادا کرتے ہوئے اسے بہت اجنبی اجنبی سا لگا۔

”ارے نواز احمد! تم یہاں کیسے؟“ وہ چھ سالوں میں بالکل بھی تو نہیں بدلی تھی۔

”کیسے ہو؟ اور یہ اسپیشل شاپنگ کس کے لیے ہو رہی ہے؟“ اس نے نواز کے ہاتھوں میں جھولتی نفیس چین کو دیکھتے ہوئے معنی خیزی سے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک‘ تم سناؤ پاکستان کب آئیں؟“ کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کہ جب وہ اسے ملے گی‘ تب وہ اسے کیا کیا بتائے گا اور کیا کچھ پوچھے گا۔ لیکن آج اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ اپنی فیلنگز جان کر ہی ششدر رہ گیا۔ وہ اس سے کچھ بھی تو نہیں پوچھنا چاہتا تھا اور نہ ہی کچھ بتانا چاہتا تھا۔

”عاصم! یہ ہماری کلاس کا سب سے جینئس اسٹوڈنٹ تھا۔“ عاصم نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جسے اس نے بے دھیانی میں تھام لیا۔

”اماں جی کا فون آیا ہے۔ بے بی نے انہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔ اس لیے ابھی تو گھر چلو‘ باقی کی شاپنگ کسی اور دن کرلینا۔“ عاصم نے ریسٹ واچ پہ نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ یہ منظر کتنا مکمل اور خوب صورت تھا۔ نواز کو اپنا وہاں پر کھڑا ہونا ہی آکورڈ لگا اور اسے ایک ہی پل میں اپنی فیلنگز بدلنے کی وجہ اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔ نیلوفر اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر وہاں سے چلی گئی۔

اور اس پر چھ سالوں سے چھایا طلسم ٹوٹ گیا۔ واپسی کا سفر ہمیشہ تھکا دینے والا کیوں ہوتا ہے؟ شاید وہ خوش نصیب تھی کہ اس نے جو چاہا‘ پالیا۔ مگر جو پاتے ہیں صرف وہی خوش نصیب نہیں ہوتے۔ بلکہ جو کھوتے ہیں‘ انہیں اپنے کچھ کھونے کے عوض بہت کچھ مل جاتا ہے۔ بس انہیں آگے بڑھ کر خود ہی نشان منزل ڈھونڈنا پڑتے ہیں اور اس کی تو ہر راہ اپنی منزل کی طرف جاتی تھی۔ سراب کا سفر تمام ہوا۔ اب اسے اپنے پیاروں کی آنکھوں میں لو دیتے خوشنما خوابوں کو تعبیر دینی تھی۔

☼ ☼ ☼
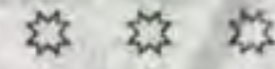
”یہ کام کے وقت پروین نہ جانے کن کونوں کھدروں میں چھپ جاتی ہے۔“ مانو کسی کام سے باہر آئی تو دروازے پر ہوتی مسلسل بیل سن کر جھنجلا گئی۔ دروازہ کھلتے ہی جو شخصیت سامنے نظر آئی اسے دیکھ کر منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ”فوراً“ سے پیشتر کھٹاک سے دروازہ بند کردیا۔

”یہ یہاں پر کہاں سے آگیا؟ شکل سے تو نہیں لگتا تھا کہ پانچ ہزار کے لیے ہمارا گھر تک ڈھونڈ لے گا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔“ ڈرتے ڈرتے دوبارہ دروازہ کھولا‘ مگر وہ ایک ڈراؤنی حقیقت کی مانند جوں کا توں موجود تھا۔

”دیکھیں! آپ یہاں پر کیوں آگئے؟ میرا مطلب ہے اگر آپ اسی وقت مجھے اپنا ایڈریس دے دیتے تو میں آپ کے پیسے وہیں پہنچا دیتی۔“ گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اس نے بمشکل بات مکمل کی۔

”اچھا ایک منٹ رکیں۔“ اسے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر دوبارہ کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگادی۔ اس خیر مقدم پر سجاول کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ بیڈ شیٹ درست کرتی فاطمہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”وہ ریسٹورنٹ والا ہیرو اپنے پیسے لینے ہمارے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔“ دراز سے پیسے نکالتے ہوئے وہ پھولی سانسوں سے بولی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

”کیا؟“ فاطمہ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پیچھے چلی آئی۔ پیروں کے نیچے آتے اپنے دوپٹے سے الجھ کر وہ گرتے گرتے بچی۔ لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر تو سانس سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ دادو موصوف کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا فرما رہی تھیں۔

”دادو! یہ۔۔۔“ بالوں کی الجھی بکھری لٹیں کیچر سے نکل کر چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ ایک طرف سے نیچے لٹکتا دوپٹہ زمین پر جھاڑو دے رہا تھا۔ جوتے ندارد‘ اکھڑی سانسیں‘ پوتی کا قابل اعتراض حلیہ دیکھ کر دادو کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ اس نے الجھی نظروں سے موصوف کو دیکھا۔

”سجاول پتر! اندر آجا‘ یہ تیرا اپنا ہی گھر ہے۔“ دادی زہرہ کی بات سن کر تو وہ غش کھا کر گرنے کو تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے افراد خانہ جمع ہوگئے۔

”چلو بھئی اندر چلو۔ یہاں پر کیوں مجمع لگالیا ہے۔“ دادو سجاول کو لیے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ مانو حیران پریشان اس کایا پلٹ کو دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
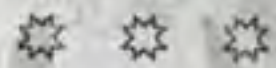
”معزز خاتون! میری باری کب آئے گی؟ صبح سے انتظار میں کھڑا سوکھ رہا ہوں۔ مجھے آج ناشتے میں آپ کے ہاتھ سے بنا گوبھی کا پراٹھا کھانا ہے۔“ اپنے عقب سے ابھرتی نواز کی آواز سن کر تائی امی کا انڈہ پھینٹتا ہاتھ جہاں تھا وہیں تھم کر رہ گیا۔ نواز اکثر ترنگ میں آکر انہیں معزز خاتون کے لقب سے پکارتا تھا اور اب پورے چھ سالوں بعد یہ لقب سن کر انہیں لگا کہ ان کا بیٹا لوٹ آیا ہے۔

”نواز!“ اپنے چہرے پر پھسلتی ان کی بے یقین نظروں نے اسے نظریں چرانے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرکے آنسو گرتے چلے گئے۔

”پلیز امی! روئیں مت‘ مجھے ڈانٹیں‘ برا بھلا کہیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ جانتا ہوں میں بالکل بھی اچھا بیٹا نہیں ہوں‘ مگر آپ دنیا کی بیسٹ ماں ہیں۔“ انہیں اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیے وہ ندامت سے کہہ رہا تھا۔

”بس صرف آج کا دن ہے‘ اس کے بعد میں آپ کو کچن کی شکل بھی نہیں دیکھنے دوں گا۔“ اپنی انگلی کی پوروں سے ان کے آنسو چنتے ہوئے وہ جذب سے بولا۔

”اور ہاں پھپھو سے کہیں کہ اب اپنی مس جینئس کو بھی ذرا گھرداری سکھائیں‘ جسے دیواروں سے لٹک کر ہمسائیوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں آتا۔“ وہ شرارت سے کہتا انڈہ پھینٹنے لگا۔

”تمہیں زینی کیسی لگتی ہے نواز؟“ وہ خوش گوار حیرت میں گھر کر پوچھنے لگیں۔

”میری ماں کی پسند بری کیسے ہوسکتی ہے؟“ اس نے اپنی ماں کا مان بڑھا کر انہیں اپنی ہی نظروں میں معتبر کردیا تھا۔ اگر ایک ماں اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ کر اس کے اندرونی جذبات جان سکتی ہے تو ایک بیٹا اپنی ماں کی دلی خواہش سے کیسے انجان ہوسکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

”کسی سے ملے بغیر کسی کو پرکھے بغیر اس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرلینا اچھی بات تو نہیں ہے۔“ امی نے ایک دن اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت سے سمجھایا۔ لیکن وہ اس وقت ناراضی سے سر جھٹک کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں تو یقین رکھو میں تمہارے بارے میں کوئی بھی غلط فیصلہ ہرگز نہیں کروں گی۔“ اسے دادو کی شفیق آواز سنائی دی اور ایک ایک کرکے ساری گزری باتیں ذہن کے دریچے پر دستک دینے لگیں۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی‘ لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ باہر ہلکی ہلکی کن من ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ بارش کے قطروں کے ساتھ یخ بستہ ہوا کے جھونکے نے اسے ٹھٹھرنے پر مجبور کردیا۔ اس نے جلدی

سے کھڑکی بند کردی۔

"مجھے یقین ہے دادو! آپ میرے بارے میں کوئی بھی غلط فیصلہ نہیں کر سکتیں۔" خانہ دل سے نکلی اس آواز نے اسے قطعاً" حیران نہیں کیا تھا کیونکہ جب سے اس نے سجاول کو غیر متوقع صورت حال میں اپنے سامنے دیکھا تب سے اس کے لیے کوئی بات بھی حیران کن نہیں رہی تھی۔

"میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس پورے ریسٹورنٹ میں کوئی ایک بھی تو اس "ہیرو" کے برابر کا نہیں۔" ریسٹورنٹ میں سجاول پر پہلی نظر پڑتے ہی اس نے جھک کر فاطمہ کے کان میں کہا تو وہ بھی گردن موڑ کر اسی سمت دیکھنے لگی۔ اس بات سے قطعاً" بے خبر کہ وہ ان کی ساری باتیں سن رہا ہے بلکہ محظوظ بھی ہو رہا ہے۔

"فاطمہ! اٹھو۔" اس نے ساتھ لیٹی فاطمہ کا کمبل کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"اونہوں۔!" وہ تھوڑا سا کسمسا کر دوبارہ سو گئی۔

"فاطمہ! پلیز ایک بار اٹھو تو۔ بعد میں سو جانا۔" اس نے آہستگی سے فاطمہ کے رخسار تھپتھپائے۔

"اففوہ مانو! کیا مصیبت ہے؟ رات کو بھی چین نہیں آتا تمہیں۔" فاطمہ تنگ آکر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اب بولو بھی کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

"فاطمہ! اس دن تم لوگوں نے دادی زہرہ کو میرے بارے میں "کچھ زیادہ" تو نہیں بتا دیا تھا نا؟" انگلیاں چٹخاتی اٹک اٹک کر بولتی مانو کی بات سن کر فاطمہ کی نیند، جمائیاں وغیرہ سب ہوا ہو گئیں۔

"مانو! کیا تم واقعی میں وہ کہنا چاہ رہی ہو جو میں سمجھ رہی ہوں؟" فاطمہ دیدے پھاڑ کر بولی تو مانو اثبات میں سر ہلا کر ہلکے سے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

صبح کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح چنچل اور ہنگامہ خیز تھی۔ ساری رات وقفے وقفے سے برسنے والی بارش کے بعد اب مطلع بالکل صاف تھا۔ تائی امی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کھلی پڑ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں چمکتے ستارے دیکھ کر امی اور دادو بن کہے ہی جان گئی تھیں کہ ان ارمانوں کو پورا کرنے کا وقت آگیا ہے، جو وہ برسوں سے اپنے دل میں لیے پھر رہی تھیں۔

فاطمہ اور مانو کو جب پتا چلا تو انہوں نے تو باقاعدہ "جھمر" ہی ڈال دی۔ کب سوچا تھا کہ جو بات خواب میں بھی ناممکن نظر آتی تھی وہ حقیقت میں یوں ممکن ہو جائے گی۔

"لو دیکھو ذرا اس لڑکی کو دو دن بھی ٹک کر اپنے گھر نہیں بیٹھ سکتی۔" حسب عادت پونی ٹیل جھلاتی اندر داخل ہوتی زینی کو دیکھ کر دادو بڑبڑانے لگیں۔

"کیوں میرے یہاں آنے پر پابندی لگ گئی ہے کیا؟ اور ویسے بھی آج تو میں اسپیشلی نواز بھائی سے بات کرنے آئی ہوں؟" وہ ابرو اچکا کر کہتی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"مانو اور فاطمہ کے لیے اسلام آباد سے گولڈ کی چین لے کر آسکتے ہیں۔ لیکن میرے لیے چاندی کا ایک چھلہ بھی نہیں۔ اس کھلے تضاد کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" اس کے جرح کرنے والے انداز پر دادو نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "بچیوں" کو مشرقی روپ میں دیکھنے کی حسرت، حسرت ہی رہ گئی۔ نواز نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے اخبار چہرے کے سامنے کر لیا۔

"ارے مانو! یہ تو۔۔۔" سیڑھیوں سے نیچے اترتے سجاول پر نظر پڑتے ہی اسے اچھو لگ گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات بھی کم و بیش ان دونوں جیسے ہی تھے جب انہوں نے ریسٹورنٹ والے "ہیرو" کو سجاول کے روپ میں اپنے گھر میں دیکھا۔

"کہیں اس نے ریسٹورنٹ والا قصہ نانو لوگوں کو بتا تو نہیں دیا؟" اسے بھی پہلی فکر اسی بات کی تھی۔ فاطمہ نے اسے اپنے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنے ہونق پن میں خود ہی سب کے بیچ بھانڈا پھوڑ دیتی۔

"مانو! سجاول بھائی نے ہمارا کتنا ساتھ دیا ہے تمہیں کم از کم ان کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا۔" ساری کہانی فاطمہ کی زبانی سن کر زینی تو "سجاول بھائی" سے بری طرح امپریس ہو گئی تھی۔

"ہاں میں بھی اسے یہی کہہ رہی تھی۔" فاطمہ نے چپس کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر چلو نیک کام میں دیر کیسی؟" زینی فوراً" متحرک ہو گئی۔

"لیکن میں ان سے کہوں گی کیا؟" مانو نے پوچھا۔

"کچھ زیادہ نہیں بس دوپٹے کا کونا مروڑتے ہوئے پلکیں جھکا کر دھیمے سروں میں کہنا ہے۔ سجاول جی! آپ نے اس کٹھن موقع پر ہمارا ساتھ دے کر ہماری جان پر جو احسان عظیم فرمایا اس کے لیے ہم آپ کے تہ دل سے مشکور ہیں۔" زینی تو ایک دم اس کی ڈائریکٹر بن گئی۔

"اففوہ! ایک تو محترمہ کو دوپٹا تک اوڑھنا نہیں آتا اور چلی ہیں نور پور کی چوہدرائن بننے۔" فاطمہ جھنجلا کر پھر سے اس کا دوپٹا سیٹ کرنے لگی۔

"اچھا بس اب نکلو بھی کہیں وہ گھر سے باہر نہ چلے جائیں۔" زینی نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

"جی نیازی صاحب! مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ریس میں میرا گھوڑا ہی جیتے گا ان شاء اللہ۔ آپ فکر نہ کریں میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔" سجاول پیٹھ موڑے کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ سج سج کر قدم اٹھاتی مانو اس کی بات سن کر دوسری ہی جست میں اس کے سامنے تھی۔

"آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ آپ کا ایک گھوڑا بھی ہے جو اس سال ریس جیتنے والا ہے۔" وہ یوں بے تکلفی سے بولی گویا برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

"اوہ سوری! میں اپنے ایڈریس کی طرح شاید یہ اہم بات بھی آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔" سجاول نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مصنوعی افسوس سے کہا۔

"ویسے آپ اتنا حیران کیوں ہو رہی ہیں میرے پاس صرف ایک گھوڑا نہیں بلکہ پورا اصطبل ہے اعلا نسل کے گھوڑوں کا۔" وہ اس کی روشن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے بولا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ پتا ہے ہارس رائڈنگ میرا برسوں پرانا خواب ہے، جو لگتا ہے اب پورا ہونے والا ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

"جی جی بالکل! آپ کا یہ خواب ضرور پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے آپ کو ہمارے گاؤں آنا پڑے گا۔" سجاول اس کے بچکانہ انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے دلچسپی سے بولا۔

"ہاں تو میں کون سا آپ کے گاؤں جانے سے انکار کر رہی ہوں۔ ابھی چلیں؟" کون سا دوپٹا کہاں کا دھیما پن؟ مانو فل فارم میں آچکی تھی۔ آخر کو بات اس کے دیرینہ خواب کی تھی۔

"ابھی۔۔۔؟ ابھی کچھ مناسب نہیں لگتا، بہتر ہو گا کہ آپ پہلے اپنی سہیلیوں سے مشورہ کر لیں۔" سجاول نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا تو وہ ناسمجھی سے اسی سمت دیکھنے لگی۔ فاطمہ اور زینی کے بگڑتے تیوروں پر نظر پڑی تو بھولا بسرا مقصد بھی یاد آگیا جس کے لیے وہ یہاں آئی تھی بلکہ بھیجی گئی تھی۔

"اف!" ایک لاچار نظر کندھے پر جھولتے دوپٹے پر ڈالی اور بے بسی سے کندھے اچکا دیے۔

"ایکچوئلی! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے بولی۔ اگر دادو اپنی "ٹام بوائے" پوتی کو اس روپ میں دیکھتیں تو شاید بے ہوش ہی ہو جاتیں۔

"شکریہ مگر کس لیے؟" سجاول نے بازو سینے پہ لپیٹتے ہوئے دریافت کیا۔

"مستقبل میں ہارس رائڈنگ سکھانے کے لیے۔" وہ شرارت سے کہتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے سے سجاول کا جاندار قہقہہ فضا میں گونج کر رہ گیا۔

★

انیسلہ کرن

میرا نام تابش ہے۔ تابش جاوید مجھے اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو اپنی خالہ کے گھر میں پایا۔

گندمی رنگت اور سادہ سے نقوش رکھنے والی میری خالہ جو مجھ پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان تھیں۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اور وہ ایسا کیوں نہ کرتیں آخر میں ان کی اکلوتی مرحومہ بہن کی واحد نشانی تھا۔ اوپر سے بنانے والے نے شکل و صورت ایسی بنائی تھی کہ اجنبی لوگ بھی مجھے پیار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اور وہ تو میری سگی خالہ تھیں پھر میں بھلا ان کی آنکھوں تارا کیسے نہ بنتا۔ اور صرف خالہ ہی نہیں ان کے گھر کے تمام ہی افراد مجھے بے حد چاہتے تھے۔

سدا کے کم گو اور نہایت انصاف پسند خالو جو ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا کرتے تھے اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت کو بالکل بھی پسند نہیں کیا کرتے تھے، اپنے اصولوں کے بہت پکے تھے مگر مجھے بھی وہ ہمیشہ خصوصی رعایت دیا کرتے تھے۔ پھر خالہ کی بوڑھی ساس تھیں جن کا بیشتر وقت چارپائی پر ہی گزرتا تھا اور محلے کی عورتوں میں دو، چار اکثر ہی ان کے پاس پائی جاتی تھیں وہ اپنے پاس اکثر ہی بچوں کی پسند کے کھانے پینے کی چیزیں رکھا کرتی تھیں۔ کبھی اپنے تکیے کے نیچے اور کبھی لوہے کی اس پرانی الماری میں جو ان کی چارپائی کے برابر میں رکھی رہتی تھی اور جس کی چابی انہوں نے بڑی حفاظت سے اپنے گلے میں ڈالی ہوئی سیاہ ڈوری میں پروئی ہوئی تھی۔ دادی جان کی ان چھپا کر رکھی ہوئی چیزوں میں میرا حصہ ہمیشہ باقی بچوں سے زیادہ ہوا کرتا تھا ایک تو دیگر لوگوں کی طرح دادی جان کو بھی مجھ سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی اور دوسرے مجھے اپنا مطلب نکالنے کا فن بچپن ہی سے آگیا تھا اور میں چکنی چپڑی باتیں کر کے دادی جان سمیت سبھی سے اپنی بات منوالیا کرتا تھا۔

خالہ کے تین بچے تھے سب سے بڑے توقیر بھائی جو بے حد سنجیدہ بلکہ تھکے سے انسان تھے۔ ان سے چھوٹی نجمہ باجی جو مجھ سے ساڑھے تین سال بڑی تھیں اور سب سے چھوٹی مرینہ جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی اور بچپن ہی سے میرے مذاق کا سب سے زیادہ نشانہ وہی بنتی آئی تھی۔ وہ شروع ہی سے بے حد شرمیلی اور دبو قسم کی لڑکی تھی۔ اور کالج میں پہنچ جانے تک بھی اس میں اعتماد کی کمی ہی رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہائی اسکول کے دنوں تک تو وہ ایسی ہوا کرتی تھی کہ اگر گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو وہ اس کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے کہیں چھپ جایا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی مگر پھر بھی اسے گھر میں وہ مقام حاصل نہیں تھا جو مجھے ملا ہوا تھا بلکہ اس نے شاید وہ مقام حاصل کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور بڑی خاموشی سے بغیر کسی کے کہے اور بغیر کچھ جتائے اس نے گھر کا سب سے چہیتا اور لاڈلا بچہ ہونے کا اعزاز میرے لیے چھوڑ دیا تھا۔

درحقیقت خالہ کے گھر میں سبھی لوگ ایسے ہی بے غرض تھے انہیں خود کو اہمیت دینے یا دوسروں سے اپنی باتیں منوانے کا کوئی شوق ہی نہیں تھا اس لیے اس گھر میں اس قدر سکون اور اطمینان تھا۔ روپے کی کمی ہونے کے باوجود وہاں محبت کی فراوانی تھی جس کا سب سے زیادہ حصہ مجھے ملا ہوا تھا۔ میرے اکثر کلاس فیلوز مجھ پر رشک کرتے تھے اور کبھی کبھی حیرت سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا میری خالہ کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو صرف اپنی ذات کو اہمیت دے اور اپنے آگے مجھ جیسے یتیم اور تنہا بچے کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ تب میرا جواب ہمیشہ نفی میں ہوا کرتا تھا کیونکہ میرے حساب سے تو وہاں سب ہی لوگ بہت بے غرض اور محبت کرنے والے تھے۔ مگر تب تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس گھر میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور صرف اپنی ذات سے پیار کرتا ہے۔ اور وہ شخص میں خود تھا۔

☼ ☼ ☼

میں مومنہ ہوں۔ مومنہ سعید میرا شمار ان لوگوں

ناولٹ
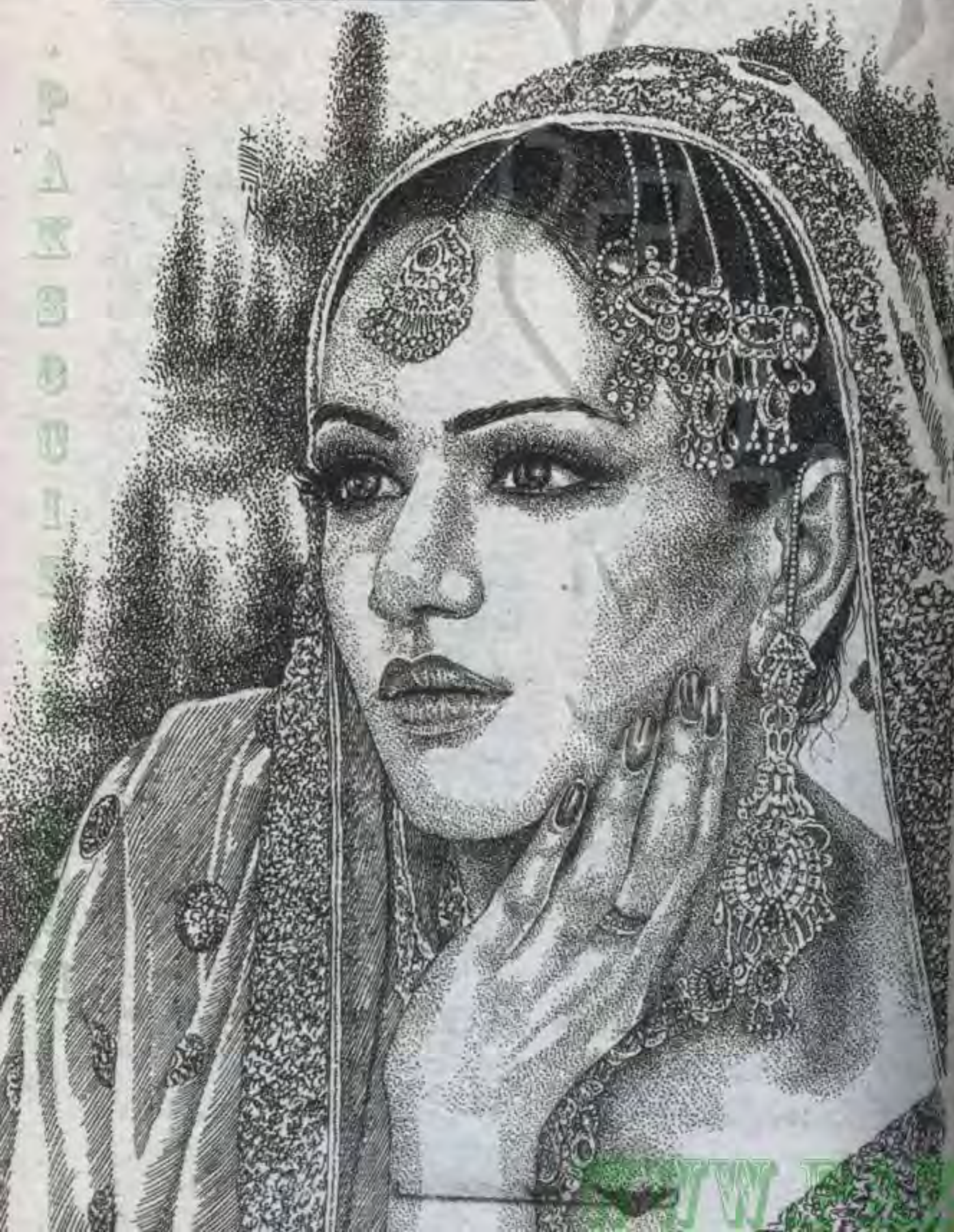
میں ہوتا ہے۔ جو پیدا ہی آزمائشوں کے لئے ہوتے تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں سیدھے سادے رستوں سے بیر ہوتا ہے اور اس بیر کی وجہ سے وہ زندگی میں بہت سی ایسی تلخیوں اور اذیتوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جن سے عام لوگ بڑی حد تک محفوظ رہتے ہیں۔

میں دو بہنوں اور ایک بھائی سے چھوٹی اور اپنے گھر میں کافی لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ خاص طور پر میں ابا سے بہت قریب تھی۔ اور وہ تینوں بڑے بھائی بہنوں سے کہیں زیادہ توجہ مجھ پر دیا کرتے تھے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور دوسرے میں شروع ہی سے بہت ذہین ہوا کرتی تھی اور ہمارے ابا کو ذہانت بہت متاثر کرتی تھی اس لیے وہ میری تعلیم پر بھی خاص توجہ دیتے تھے اور پتا نہیں یہ ابا کی خاص توجہ کا اثر تھا یا میرے اندر ہی کچھ ایسے جراثیم موجود تھے کہ میں جوں جوں بڑی ہوتی گئی تعلیم حاصل کرنے کا شوق میرا جنون بنتا گیا۔ اور میرے ذہن میں اسکول کے دنوں ہی سے یہ خیال نہایت پختہ ہو گیا کہ اگر مجھے معاشرے میں عزت اور اپنی کوئی شناخت چاہیے تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ پڑھوں۔

میں نے لڑکپن سے ہی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ مگر خواب دیکھنا جتنا آسان ہے ان کی تعبیر حاصل کرنا اتنا ہی مشکل اور کٹھن کام ہے یہ اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک شام ابا چپکے سے ہی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم سب کے لیے ہی ان کی اچانک موت بڑا دھچکا تھی مگر میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی میں ابھی فرسٹ ایئر میں تھی اور بچپن سے لے کر آج تک اپنے خوابوں کے راستے پر ابا کی انگلی پکڑ کر ہی چلی تھی اور اب ابا نہیں رہے تھے تو میرے چاروں طرف جیسے اندھیرا ہی چھا گیا تھا اگرچہ میرا بھائی برسر روزگار تھا اور اس کی آمدنی بھی کافی اچھی تھی مگر اس کو میری تعلیم تو کیا میری ذات سے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو صرف ان چیزوں میں دلچسپی تھی جو اس کی نئی نویلی اور حسین دلہن کو پسند تھیں اور اس کی دلہن کی پسند میں نہ تو میں آتی تھی اور نہ ہی میری تعلیم، اس لیے جب ابا کی وفات کے ایک ہفتے بعد میں نے کالج جانا دوبارہ سے شروع کیا تو بھابی اور بھائی دونوں نے ہی مجھے دبے لفظوں میں کالج چھوڑنے کا کہہ دیا ان دونوں کا ہی یہ خیال تھا کہ اب گھر کے معاشی حالات ایسے نہیں رہے کہ میری پڑھائی کا خرچہ اٹھایا جا سکے لہٰذا اب مجھے بھی اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ جانا چاہیے۔

بھائی اور بھابی کے اس رویے نے مجھے تکلیف پہنچائی تھی مگر ان دونوں کے رویے سے بڑھ کر اذیت مجھے اس چیز سے ہوئی کہ میری دونوں بہنیں بھی ان کی حامی تھیں۔ حالانکہ ان دونوں کو اچھی طرح سے پتا تھا کہ مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے۔ میں ان دونوں سے کافی چھوٹی تھی فرزانہ آپا مجھ سے پانچ سال اور ریحانہ آپا سات سال بڑی تھیں اصولاً تو انہیں اس نازک وقت میں میری ڈھال بننا چاہیے تھا مگر وہ میری ڈھال کیا بنتیں انہوں نے تو خود ہی میری جڑیں کاٹنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ شاید انہوں نے وقت کی چال کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اب گھر کا سربراہ ہمارا باپ نہیں بلکہ بھائی ہے اور ان کی بقا اس میں ہے کہ وہ موجودہ حکمران سے بنا کر رکھیں اور اس کی پیشانی پر کوئی بل نہ آنے دیں اس لیے وہ دونوں ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر بھائی اور بھابی کی حمایت کرتی نظر آنے لگی تھیں بھابی کے آگے پیچھے پھرنا اس کی خوشامد کرنا اور جہاں تک ہو سکے اسے آرام پہنچانا اور دونوں کی زندگی کے مقاصد جیسے خود بخود ہی طے ہو گئے تھے۔ اور رہ گئیں امی تو وہ بے چاری بالکل خاموش ہو گئی تھیں ابا کی اچانک وفات کے بعد انہوں نے کسی بھی معاملے میں دخل نہ دینے کی جیسے قسم ہی کھالی تھی۔

حالات ایسے تھے کہ میں اگر تھوڑی سی بھی کمزور ہوتی تو سب کچھ چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتی اور اپنی بہنوں کی طرح دن بھر گھر کے کام کرتی بھابی اور بھائی کی خوشامدیں کرتی اور شادی ہو جانے کے سپنے دیکھتی مگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی تعلیم حاصل کرنے کا خواب جیسے میری ضد بن گیا تھا اور اس ضد نے ہی مجھے اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ میں بھائی کے سامنے ڈٹ گئی اور تعلیم چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا نتیجہ حسب توقع تھا انہوں نے مجھے خرچ نہ دینے سے واشگاف الفاظ میں انکار کر دیا۔

اس چیز کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا اس لیے میں نے پہلے ہی اپنے لیے کچھ ٹیوشنز ڈھونڈ لی تھیں۔ کالج سے آنے کے بعد میں ساری سہ پہر اور شام بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی اور رات گئے تک بیٹھ کر خود پڑھا کرتی اس طرح میرا خرچہ تو نکل آتا تھا مگر میرے پاس فرصت اور سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں بچتا تھا۔ مجھے دن رات محنت کرنا پڑتی تھی اور اوپر سے گھر کے لوگوں کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت برا تھا۔ بھائی اور بھابی تو خیر مجھے مخاطب کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور خود میری اپنی بہنیں بھی بھائی اور بھابی کی خوشنودی کی خاطر مجھے نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنا چکی تھیں گھر میں صرف ایک امی جان کا دم تھا جن کی وجہ سے مجھے وقت پر کھانا اور دوسری بنیادی ضرورت کی چیزیں مل جاتی تھیں میں انہی کے کمرے میں رہتی تھی اور مجھے رات رات بھر پڑھتے اور اس قدر محنت کرتے دیکھ کر وہ کئی دفعہ بہت رنجیدہ ہو جایا کرتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی بھی بھائی کے سامنے میری سفارش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ماں تھیں نا انہیں اپنی اولاد کا اچھی طرح سے پتا تھا اس لیے کچھ کہہ کر وہ اپنی بے عزتی نہیں کروانا چاہتی تھیں۔

مجھے امی جان کی مجبوریوں کا احساس تھا اس لیے میرے دل میں ان کے لیے رتی بھر بھی گلہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کی اخلاقی مدد ہی تھی جس کی وجہ سے میں اتنی محنت اور جدوجہد کرنے کے قابل ہو سکی تھی۔ ورنہ باقی سب لوگ تو مجھ سے کسی اچھوت کا سا سلوک کرتے تھے۔

بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرنا کیسا لگتا ہے۔ یہ بات مجھ سے بہتر شاید کوئی نہ جان سکے کیونکہ میں نے اپنی نوجوانی کا بیشتر دور اسی طرح سے گزارا ہے۔

☼ ☼ ☼
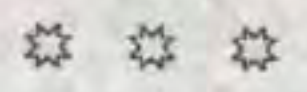
لڑکپن ہی سے میرے دل میں دولت مند بننے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے غربت نما سفید پوشی سے نفرت تھی ایک ایک روپیہ سوچ سوچ کر خرچ کرنا بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھانا اور سال میں معمولی کپڑے کے چند جوڑے بنانا مجھے ان سب چیزوں سے شدید قسم کی چڑ ہو چکی تھی بچپن ہی سے میں سنتا آیا تھا کہ میری شکل و صورت شہزادوں جیسی ہے شاید اسی لیے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مجھے شہزادوں کی طرح ہی زندگی گزارنی چاہیے۔

میرے دوستوں میں سے کوئی اتنا امیر تھا کہ جس کا طرز زندگی مجھے امارت کے خواب دیکھنے پر اکساتا اور نہ ہی ہمارے خاندان میں کوئی اتنا صاحب حیثیت تھا کہ جس کو دیکھ دیکھ کر میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا۔ البتہ مجھے یہ پتا تھا کہ میرے باپ کا تعلق ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تھا۔ مگر میرے باپ کا انتقال میری پیدائش کے ڈیڑھ برس بعد ہی ہو گیا تھا اور تب سے ددھیال والوں سے میرا کوئی تعلق بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرے باپ نے میری ماں سے پسند کی شادی اپنے سارے خاندان کی مخالفت مول لے کر کی تھی۔ اس لیے میری ماں کو میرے ددھیال والوں نے دل سے کبھی بھی قبول نہیں کیا تھا اسی لیے جب شادی کے ڈھائی سال بعد ایک زہریلے سانپ کے ڈسنے سے میرے باپ کا انتقال ہوا تو میرے ددھیال والوں نے بغیر کسی لحاظ کے مجھے اور میری ماں کو گھر سے نکال دیا۔

ویسے بھی اس وقت میرے دادا حیات تھے اور ساری خاندانی جائیداد انہی کے نام تھی اور قانون کی رو سے اس جائیداد میں میرا یا میری ماں کا حصہ نہیں بنتا تھا البتہ دادا اگر کچھ دینا چاہتے تو دے سکتے تھے مگر وہ بھلا ایسا کیوں چاہتے انہیں تو مجھ سے اور میری ماں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ بلکہ وہ تو اگر ہمارا کوئی شرعی حق ہوتا بھی تو ہمیں کچھ نہ دیتے اور نہ ہم ان سے زبردستی کچھ

حاصل کر سکتے تھے بھلا ایک کمزور عورت اور ایک ڈیڑھ سالہ بچے کی ان جدی پشتی جاگیرداروں کے سامنے حیثیت ہی کیا تھی۔ انہوں نے تو میری ماں سے وہ تمام زیورات بھی چھین لیے تھے، جو میرے باپ نے اسے وقتاً" فوقتاً" لا کر دیئے تھے۔ اور میری ماں جو محبت کرنے والے جیون ساتھی کی اچانک موت سے ویسے ہی گم سم ہو چکی تھی بغیر کوئی احتجاج کیے میری خالہ کے در پر آن پڑی زندگی میں اس کی دلچسپی تو اس لمحے سے ختم ہو چکی تھی جب میرا باپ دنیا سے رخصت ہوا۔ سال گزر جانے کے بعد اس کی سانسوں کی ڈوری بھی ٹوٹ گئی اور یوں میں صرف ساڑھے تین سال کی عمر میں ماں اور باپ دونوں سے ہی محروم ہو گیا۔

فطری طور پر میں لاپروا تھا اس لیے ذرا بڑا ہونے اور اپنے ددھیال کے بارے میں جاننے کے باوجود میرے دل میں کبھی رحیم یار خان جانے یا ان لوگوں سے ملنے کا خیال تک نہیں آیا تھا اور خود ان لوگوں نے بھی مجھ سے کبھی رابطہ نہیں کیا تھا مگر جن دنوں میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر آوارہ گردی کرتا پھر رہا تھا کہ اچانک ہی ایک روز رحیم یار خان سے میری دادی کی آمد ہو گئی۔

میں اس شام کرکٹ کھیل کر گھر پہنچا تو دادی جان کے پاس ایک بوڑھی خاتون کو دیکھ کر مجھے کچھ حیرت سے ہوئی انہوں نے نہایت قیمتی لباس اور زیورات پہن رکھے تھے اور ہمارے ملنے والوں میں سے تو کوئی بھی اتنا امیر کبیر نہ تھا جتنی وہ لگ رہی تھیں اس لیے انہیں دیکھ کر میرا حیران ہونا فطری رد عمل تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر میرے پاس آئیں اور چٹا چٹ میری بلائیں لینے لگیں۔ میں اس اچانک رد عمل سے تھوڑا سا گھبرا گیا مگر میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی آخر تھوڑی دیر بعد انہوں نے خود ہی میری بلائیں لینے کا سلسلہ موقوف کیا اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ لے کر مجھے محویت سے تکنے لگیں۔

"میرا تابش، میرا پوتا میرے جاوید کی نشانی۔"

خواب کے سے عالم میں بڑبڑا کر وہ ایک بار پھر مجھے چومنے لگیں۔ ان کے منہ سے نکلے فقرے نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ وہ میری سگی دادی ہیں مگر میں نے ان کے لیے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ محسوس نہیں کیا تھا میں بس تھوڑی دیر ہی وہاں بیٹھا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا مجھے اپنے ددھیال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر میری یہ بے نیازی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ دادی مجھے لینے کے لئے آئی تھیں۔

گھر میں سب کا خیال تھا کہ میں ان کے ساتھ جانے سے انکار کروں گا مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور فوراً" ہی دادی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس لیے نہیں کہ میرے دل میں دادی یا اپنے خاندان کے لیے محبت کا کوئی چشمہ پھوٹ پڑا تھا بلکہ اس لیے دادی نے مجھے رحیم یار خان میں اپنے خاندان کی شان و شوکت کے وہ سبز باغ دکھائے تھے کہ میں فیصل آباد میں ہوتے ہوئے بھی خود کو رحیم یار خان کی اس شاندار حویلی میں محسوس کرنے لگا تھا جہاں ہر طرف دولت کی ریل پیل تھی۔ تب نہ تو مجھے خالہ کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دکھائی دیئے تھے اور نہ ہی گھر کے دیگر لوگوں کے اترے ہوئے افسردہ چہروں نے مجھے کسی ملال سے آشنا کیا تھا بلکہ مجھے تو یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کس طرح میرے ددھیال والوں نے مجھے اور میری ماں کو کسمپرسی کے عالم میں اس شاندار حویلی سے باہر نکالا تھا جہاں میں اب جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں ایک خود غرض انسان تھا۔"

☼ ☼ ☼
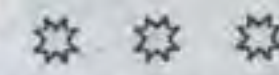
محنت مشقت کی چکی میں لگاتار دو سال تک پس کر میں نے اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کا امتحان تو پاس کر لیا تھا مگر میرے گھر میں میری حیثیت تب تک ایک اچھوت کی سی ہو چکی تھی۔ امی جان کے علاوہ گھر کا کوئی فرد مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ بھابی تو خیر برملا مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھیں اور بھائی

بھی مجھے خود سے مخاطب کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا آخر میں نے بھی تو وقت کے حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ وہ گھر جہاں بھائی اور بھابی کی بات کو ہی حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ وہاں آخر میں اپنی من مانی کر رہی تھی تو اس امر کی سزا تو مجھے ملنا ہی تھی۔

میں اپنی دونوں بہنوں کی طرح بھائی اور بھابی کی جی حضوری کر رہی ہوتی تو میرے ساتھ ایسا توہین آمیز سلوک کبھی روا نہ رکھا جاتا بھابی تب تک ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھیں گول مٹول پیارا سا بھتیجا مجھے بے حد اچھا لگتا تھا بچے تو ہمیشہ ہی سے میری کمزوری رہے تھے اور یہ تو میرا اپنا بھتیجا تھا اس لیے مجھے اس کی صورت دیکھ دیکھ کر اس پر پیار آتا رہتا تھا مگر بھابی اپنے بچے کو مجھے ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتی تھیں مجھے بہت ہی کم اسے اٹھانے اور پیار کرنے کا موقع ملتا تھا ورنہ اکثر میں دل مسوس کر ہی رہ جایا کرتی تھی۔

میری بہنیں بھی مجھے شاذو نادر ہی مخاطب کیا کرتی تھیں۔ ان دونوں کی منگنیاں قریب کے گاؤں میں ہو چکی تھیں اور وہ دن رات بھابی کی چاپلوسی کر کر کے اپنے جہیز کی چیزیں بنانے میں مصروف رہا کرتی تھیں ایسے میں مجھ سے بات کر کے وہ ان مراعات سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھیں جو فی الحال انہیں حاصل تھیں۔

میں ان سب باتوں کو شدت سے محسوس کرتی تھی مگر سوائے صبر اور برداشت کے میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ بدترین حالات کے باوجود میں اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے معاشرے میں ہر صورت اپنے لیے ایک الگ مقام بنانا تھا میں ساری زندگی ذلت کی اس چکی میں پسنے کے لیے تیار نہیں تھی جس میں میرے طبقے کی ننانوے فیصد عورتیں پستی تھیں۔

ابا مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے خود میری بھی یہی خواہش تھی۔ مگر اب اس خواہش کو پورا کرنا اتنا آسان نہیں رہا تھا ابا دنیا سے جا چکے تھے اور میں بالکل بے یارو مددگار تھی۔ معاشی تو کیا مجھے کسی کی جذباتی مدد بھی حاصل نہ تھی سوائے امی جان کے اور امی جان تو بے چاری دنیا سے بالکل ہی کنارہ کر چکی تھیں ان کو ہر وقت گم سم اور اداس دیکھ کر کبھی کبھی مجھے حیرت ہوا کرتی تھی ابا کی زندگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ امی کے لیے اس قدر اہم ہیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد ہنستی مسکراتی امی جان غم کی تصویر بن کر رہ جائیں گی۔

ایف ایس سی کے پیپرز کے بعد ہی میری دوستوں اور کلاس کی ان تمام لڑکیوں نے جو میڈیکل میں جانے کا ارادہ رکھتی تھیں مختلف اکیڈمیز جوائن کر لی تھیں ان اکیڈمیز میں میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کروائی جاتی تھی۔ میڈیکل میں جانے کی میری خواہش شاید ان سب لڑکیوں سے زیادہ شدید تھی جنہوں نے ان اکیڈمیز کو جوائن کیا تھا مگر میرے پاس ان کے جیسے وسائل نہیں تھے۔ میں نے ٹیوشنز پڑھا پڑھا کر اگرچہ کچھ رقم جمع کر لی تھی مگر یہی قلیل رقم میرا کل اثاثہ تھی اگر یہ میں انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں خرچ کر دیتی تو میڈیکل کالج کی فیس کہاں سے دیتی اس لیے میں نے دل مسوس کر اپنے طور پر ہی ٹیسٹ کی تیاری شروع کر دی۔

میری دونوں دوستیں میرے حالات سے بخوبی واقف تھیں اس لیے اس موقع پر ان دونوں نے ہی میری بہت مدد کی۔ وہ اپنے اکیڈمی کے لیکچرز اور نوٹس مجھے دینے کے علاوہ پڑھائی میں جہاں تک ہو سکتا تھا۔ میری مدد بھی کروایا کرتی تھیں۔ ان دونوں کا یہ تعاون میرے لیے بہت مددگار ثابت ہوا۔ محنت تو اگرچہ میں دن رات کر ہی رہی تھی مگر ان کے تعاون سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ ٹیسٹ کس طرح کا آئے گا اور اسے کس طرح سے کرنا ہو گا اپنی شب روز کی محنت اور دونوں دوستوں کے تعاون سے آخر کار میں نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔

میرا انٹری ٹیسٹ کلیر ہو گیا۔ اور مجھے میڈیکل میں ایڈمشن مل گیا۔ مگر اس کامیابی کی مجھے کافی بڑی قیمت

چکا تا ڑی میری دونوں دوستوں نے مجھ سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرلیا وجہ بس اتنی سی تھی کہ میرا میڈیکل میں داخلہ ہوگیا تھا اور ان دونوں کا نہیں ہوسکا تھا۔ اگرچہ ان دونوں کی ناکامی میں کسی بھی طرح سے میرا قصور نہیں بنتا تھا مگر پھر بھی انہوں نے پہلے مجھ سے اکھڑے اکھڑے رہنا شروع کیا اور کچھ ہفتوں بعد مجھ سے تعلق بالکل ہی توڑ دیا اور میں قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں میں مجرم بن گئی اس زمانے میں تو جیسے ہر شخص کو پرمٹ ملا ہوا تھا کہ وہ جس معاملے میں بھی چاہے اور جیسے بھی چاہے مجھے قصوروار ٹھہرائے اور میری ناکردہ غلطیوں پر مجھے سزا دے۔ میں ان دونوں کے سامنے اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی تھی اور خاموشی سے دوستی کے اس گھنے سائے سے محروم ہوگئی تھی جس کی ٹھنڈک نے ہمیشہ مجھے ستانے اور سکون کی چند گھڑیاں گزارنے کا موقع دیے رکھا تھا۔

بے حد خاموشی اور اداسی کے عالم میں میں نے بہاولپور جانے کی تیاری شروع کردی جہاں قائداعظم میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼
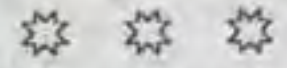
رحیم یار خان میں میرے دادا کی بنائی ہوئی وہ حویلی بلاشبہ بے حد شاندار اور پرتعیش تھی۔ مگر اس شاندار اور پرتعیش حویلی میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ دادا کا انتقال ہوچکا تھا اور حویلی میں دادی کے علاوہ میرے دو تایا اور ایک چچا اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ کہنے کو تو وہ کئی لوگ تھے اور ان سب سے ہی میرا خون کا رشتہ تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں ان سب لوگوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ دادی کے علاوہ وہاں کوئی مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اور یہ دادی ہی کا وجود تھا۔ جو مجھے اس حویلی میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی ورنہ ان سب لوگوں کی آنکھوں میں میرے لیے جو نفرت تھی وہ دیکھنے کے لیے کسی خاص چشمے کی ضرورت نہیں تھی۔

حویلی میری دادی کے نام تھی شاید اس لیے وہ لوگ مجھے وہاں سے نکالنے کا حوصلہ نہیں کرپائے تھے۔ اور نفرت کے باوجود مجھے وہاں رکھنے پر مجبور تھے۔ وہاں رہتے ہوئے میں نے اپنے مزاج کے خلاف اپنے کزنز اور دیگر رشتہ داروں کو اپنا بنانے کے لیے ہر وہ کوشش کی جو میرے بس میں تھی میں ان لوگوں میں گھل مل جانا چاہتا تھا مگر وہاں موجود لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی میرے ان جذبات کی پذیرائی نہیں کی ان سب کا سلوک میرے ساتھ حویلی کے ملازمین سے بھی برا تھا۔ ملازمین کو تو وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دے لیا کرتے تھے مگر مجھے وہ بالکل ہی بے وقعت سمجھتے تھے۔

اور میں جو خالہ کے گھر میں رہتے ہوئے ہمیشہ سے سب کی آنکھوں کا تارا رہا تھا صرف اور صرف عیش و آرام کی زندگی حاصل کرنے کی خاطر یہ ذلت سہنے پر مجبور تھا کیونکہ دادی مجھے یہی کہہ کر فیصل آباد سے لے کر آئی تھیں کہ وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد اور یہ حویلی میرے نام کردیں گی۔ اس بات کا علم ابھی باقی لوگوں کو نہیں تھا ورنہ وہ شاید مجھے قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

دادی کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھیں کہ کسی روز وکیل کو بلا کر میرے تایا اور چچا کے علم میں لائے بغیر جائیداد کی منتقلی میرے نام ہوجائے خود مجھے بھی اس مبارک دن کا شدت سے انتظار تھا جب میں بلا شرکت غیرے اس شاندار حویلی کا مالک ہوتا میں تصور ہی تصور میں ان تمام لوگوں کو جو وہاں دن رات مری تذلیل کیا کرتے تھے خود کو اس حویلی سے نکل جانے کا حکم دیتے دیکھتا تو میرا دل اندر تک خوشی اور سکون کے احساس سے بھر جایا کرتا تھا۔ مگر میرا یہ انتظار ہی رہا اور دادی ایک رات سوتے میں ہی چپکے سے اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

دادی کی اچانک وفات باقی سب کے لیے بھی دھچکا تھی مگر میری تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی کیونکہ دادی نے اپنے وعدے کے مطابق نہ تو جائیداد یا حویلی میں سے کچھ میرے نام کیا تھا اور نہ ہی میرے لیے کوئی وصیت چھوڑی تھی اس لیے اب مجھے کچھ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میرے تایا اور چچا تو میرے سلام کا جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جائیداد مجھے کیسے دے سکتے تھے پھر بھی مجھے موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ لوگ اپنی مری ہوئی ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھے حویلی میں ہی رہنے دیں آخر دادی خود فیصل آباد جا کر مجھے لے کر آئی تھیں مگر میری یہ خوش فہمی بھی خوش فہمی ہی رہی ان لوگوں نے دادی کی تدفین کے تیسرے ہی دن مجھے تین کپڑوں میں حویلی سے نکال باہر کیا اور ایسا کرتے ہوئے نہ تو ان میں سے کسی کے خون نے جوش مارا اور نہ ہی کسی کو مجھ پر ترس آیا۔

میں سارا دن گاؤں کی گلیوں میں لاچار پھرتا اور روتا رہا مگر وہاں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مجھے گلے لگا کر تسلی دیتا میرا دکھ بانٹتا یا میرے شقی القلب ددھیال والوں سے مجھے اس حویلی میں رہنے کا حق دلواتا جہاں میرے باپ نے اپنی ساری عمر گزاری تھی۔

سارا دن بے بسی اور دکھ کے سائے میں گزارنے کے بعد میں اسی شام فیصل آباد کے لیے روانہ ہوگیا خالہ کا گھر ہی اس بھری دنیا میں میرا واحد ٹھکانہ تھا اور مجھے اب وہاں ہی جانا تھا۔

یوں میں تین ماہ بعد ہی اپنے آبائی گاؤں سے واپس لوٹ آیا ان تین ماہ نے مجھے سوائے ذلت اور بے بسی کے احساس کے کچھ نہیں دیا تھا البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ میری دولت حاصل کرنے کی خواہش پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میڈیکل کالج میں داخلہ ہونے پر جہاں میں بے حد خوش تھی وہی اندر ہی اندر کئی پریشانیاں بھی مجھے ستا رہی تھیں سب سے بڑا مسئلہ تو رقم کا تھا اگرچہ ایڈمشن کے لیے رقم میں نے جمع کر رکھی تھی اور وہ اس مقصد کے لیے کافی بھی ثابت ہوئی تھی مگر چونکہ میرا داخلہ فیصل آباد کے پنجاب میڈیکل کالج میں نہیں ہوسکا تھا اس لیے اب بہاولپور جا کر مجھے نا صرف ہاسٹل میں رہنا تھا بلکہ وہیں اپنے لیے ٹیوشنز یا کسی پارٹ ٹائم جاب کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

یہ ایسے مسائل تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں میری راتوں کی نیند اڑادی تھی ایک بالکل اجنبی شہر جہاں آپ کا کوئی دوست کوئی واقف کار نہ ہو وہاں جا کر رہنا اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کام کرنا اور اوپر سے میڈیکل کی مشکل پڑھائی، مجھے بعض اوقات اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگتا سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہوجاتا مگر مجھے کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا اور عجیب بات یہ تھی کہ بظاہر یہ لگنے کے باوجود کہ میں ان تمام مسائل سے نبرد آزما نہیں ہوسکتی میں نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ میں بہاولپور نہ جاؤں۔ میں نے یہ موقع بہت محنت اور قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اور اب اسے ضائع کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اسی ادھیڑبن میں دن گزرتے جارہے تھے جب ایک رات امی جان نے مجھے اپنے پاس بلایا اور چپکے سے کافی بڑی رقم مجھے تھمائی میں ہکا بکا کھڑی کبھی ان کا چہرہ اور کبھی اپنے ہاتھ میں موجود اس رقم کو دیکھے جارہی تھی جو میرے سارے نہ صحیح مگر بہت سے مسائل حل کرسکتی تھی۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ امی جان نے اتنی بڑی رقم کہاں سے لی ہوگی اور جب میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنا زیور میری تعلیم کی خاطر چپکے سے بیچ دیا ہے تو میری آنکھوں سے بے اختیار ہی آنسو بہنے لگے، امی جان کے پاس زیادہ زیور نہیں تھا مگر جتنا بھی ان کا کل اثاثہ یہی تھا اور اب میری خاطر انہوں نے اپنا یہ اثاثہ بھی فروخت کردیا تھا وہ بھی بغیر گھر میں کسی کو خبر کیے، میرا دل چاہا کہ میں امی جان کے قدموں سے لپٹ جاؤں میری بظاہر ساری دنیا سے لاتعلق ہوجانے والی ماں نے کس طرح میری پریشانیوں کو نا صرف محسوس کیا تھا بلکہ ان کو حل کرنے کی مقدور بھر کوشش بھی کی تھی۔

"عصمت رو بیٹا اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے"

مجھے گلے لگا کر تسلی دیتے ہوئے وہ خود بھی آبدیدہ ہوگئی تھیں اس رات انہوں نے بہت عرصے کے بعد

مجھ سے بہت ساری باتیں کہیں مجھے کئی نصیحتیں کیں کہ میں اجنبی شہر میں جاکر کیسے رہوں اور کن کن چیزوں کا خیال رکھوں میں پورے دھیان سے ان کی تمام نصیحتوں کو سنتی رہی اور دل ہی دل میں ان پر عمل کرنے کا عہد بھی کرتی رہی۔

امی جان کی دی ہوئی رقم میں سے ہاسٹل کی فیس اور ضروری اخراجات کے لیے رقم نکال کر میں نے باقی رقم بہاولپور پہنچتے ہی بینک میں جمع کروادی میں اس رقم کو صرف انتہائی ضرورت کے وقت ہی خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی کیونکہ مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ اس رقم کے بعد اب امی جان بھی میری کوئی معاشی مدد نہیں کرسکتیں اس لیے میں ان روپوں کو سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہتی تھی۔

کلاسز جوائن کرنے کے دو ہفتے بعد ہی مجھے اپنی ایک کلاس فیلو کے توسط سے ایک بہت اچھی ٹیوشن مل گئی ایک ہی گھر کے تین بچوں کو ان کے گھر جاکر پڑھانا تھا بچے گرامر اسکول میں پڑھتے تھے اور اس لیے ان کا کورس بھی کافی مشکل تھا اور مجھے ان کو پڑھانے کے لیے اچھی خاصی محنت کرنا پڑتی تھی مگر ٹیوشن پڑھانے کا معاوضہ اتنا اچھا تھا کہ میرے ماہانہ اخراجات آرام سے پورے ہوجایا کرتے تھے۔ ہاسٹل کے واجبات اور کالج کی فیس امی جان کی دی ہوئی رقم سے ادا ہوجاتی تھی اور یوں مجھے پڑھنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت مل جایا کرتا تھا اگر میں اس ایک ٹیوشن کے علاوہ مزید کوئی کام تلاش کرتی تو مل سکتا تھا مگر اس صورت میں میری اپنی پڑھائی ڈسٹرب ہوکر رہ جاتی ابھی بھی مجھے اکثر رات گئے تک اپنی نیند کی قربانی دے کر پڑھنا پڑتا تھا کیونکہ دن میں تو مجھے بالکل ہی وقت نہیں ملتا تھا۔

دو سال تک میں نے ٹیوشن پڑھائی پھر وہ لوگ کسی دوسرے شہر شفٹ ہوگئے تو مجھے ایک کوچنگ سینٹر میں شام کی تین کلاسز مل گئیں اور یوں میرا کام چلتا رہا۔

ایم بی بی ایس کے بعد مجھے اپنے ایک ٹیچر کی مہربانی سے وہیں بہاول وکٹوریہ ہسپتال میں ہاؤس جاب کا موقع بھی مل گیا اور ایک سال کا ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی میں فیصل آباد لوٹ آئی۔ گزشتہ پانچ سالوں میں صرف تین بار گھر آئی تھی وہ بھی محض چند روز کے لیے ایک تو میری اپنی پڑھائی اور جاب کی مصروفیات بے تحاشا ہوا کرتی تھیں اوپر سے گھر میں مجھے جس قسم کے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا میں خود ہی فیصل آباد آنے سے احتراز کرتی تھی۔ اور اب پانچ سال کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لوٹ آئی تھی مگر اس بار میرے دل پر ہمیشہ جیسے بوجھ نہیں دھرے تھے بلکہ زندگی میں شاید پہلی بار میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور خوش محسوس کررہی تھی۔

میں ڈاکٹر بن چکی تھی اور یہ بہت بڑی کامیابی تھی اس کامیابی کا سرور ہی اتنا تھا کہ مجھے اپنے ارد گرد کی بدصورتی اب پہلے کی طرح پریشان نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ میرے گھر میں اگر کچھ بدلا تھا تو صرف یہ کہ میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں ورنہ بھائی اور بھابی کا رویہ میرے ساتھ پہلے جیسا توہین آمیز ہی تھا ان کے بچے بھی مجھ سے دور دور رہتے تھے اور امی جان پہلے سے بڑھ کر خاموش طبع ہوچکی تھیں۔

✽ ✽ ✽
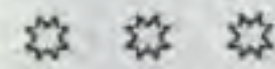
صرف تین ماہ اور دو دن کے بعد میں ایک بار پھر وہیں آپہنچا تھا جہاں سے چلا تھا یعنی خالہ کے گھر' اسی غربت نما سفید پوشی کی دنیا میں جہاں آپ اپنے عیبوں اور اپنی کمزوری پر اتنا شرمندہ نہیں ہوتے جتنا ان مجبوری اور کمزوریوں کے دوسروں پر کھل جانے سے ہوتے ہیں۔ جہاں ایک نیا سوٹ خریدنے کے لیے بھی خصوصی بچت کرنا پڑتی ہے اور جہاں اچھا کھانا صرف کسی خاص موقع پر ہی نصیب ہوتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی کے پچھلے پندرہ برس اس گھر میں گزارے تھے مجھے وہاں کی سفید پوشی یا شاید غربت سے چڑ تھی مگر پہلے یہ چڑ اتنی شدید نہیں تھی جتنی اب ہوگئی تھی اب تو مجھے اس زندگی سے باقاعدہ نفرت ہوگئی تھی۔ رحیم یار خان کی اس شاندار حویلی میں گزارے تین ماہ نے میرے مزاج اور میری سوچ پر

بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ امارت اور شان و شوکت کی زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ لینے اور قریب قریب اپنی ملکیت محسوس کرلینے کے بعد اب مجھ سے پہلے والے حالات برداشت نہیں ہورہے تھے۔ مجھے اپنی قسمت سے بے تحاشا گلے پیدا ہوگئے تھے۔ بعض اوقات میرا دل چاہتا کہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کردوں۔ آخر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا۔ کیا ضروری تھا کہ دادی کو اپنی عمر کے آخری حصے میں میرا خیال آتا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتیں یا پھر یہ ضروری تھا کہ وہ مجھے سہانے خواب دکھا کر بغیر میرے لیے عملی طور پر کچھ کیے یوں چپ چاپ دنیا سے رخصت ہوجاتیں۔ دادی کے آنے سے پہلے خالہ کے گھر میں اگر میں بہت خوش نہیں تھا تو ناخوش بھی کبھی نہیں رہا تھا مگر اب تو یہ گھر مجھے جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹتا تو یوں لگتا کہ کمرے کی دیواریں میری طرف جھکتی چلی آرہی ہیں اور کوئی لمحہ آتا ہے جب یہ دیواریں میرا دم گھونٹ دیں گی یا گھر کی بوسیدہ چھت میرے وجود پر آگرے گی۔ اس طرح کی سوچوں اور خیالات نے میری زندگی کو اجیرن بنا کر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ خالہ کے گھر میں سب نے مجھے نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لیا تھا بلکہ میری دلجوئی میں بھی انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی مجھے ایک بار بھی یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ میں ان سب کی محبتوں اور خلوص کو ٹھکرا کر وہاں سے گیا تھا الٹا وہ لوگ مجھے خوش رکھنے کے جتن کر کرکے ہلکان ہورہے تھے مگر میں تھا کہ سنبھلنے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوچکا تھا۔ اسی لیے میٹرک میں پاس ہوجانے کے باوجود میں آگے پڑھنے کے لیے راضی نہیں ہوا تھا اور سب کے منع کرنے کے باوجود میں نے ایک دوست کے چچا کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملازمت کرلی تھی۔ جس سے ہونے والی آمدنی محدود تھی مگر اس سے میری کم سے کم اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی خواہش کسی نہ کسی حد تک پوری ہونے لگی تھی۔

ایک سال تک میں نے یہ کام کیا مگر پھر میں اس سے بھی اکتا گیا میں ساری عمر کے لیے سیلز مین تو بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے دولت چاہیے تھی شان و شوکت سے زندگی گزارنا میرا اولین مقصد بن چکا تھا اور میرے پاس اس وقت اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے واحد راستہ تعلیم کا ہی تھا۔ اس لیے پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میں نے اگلے سال کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ گزشتہ ایک سال کے دوران میرے وجود پر چھائی مایوسی کے بادل اگر مکمل طور پر چھٹے نہیں تھے تو بھی ان میں تھوڑی بہت کمی ضرور ہوگئی تھی۔ اس لیے میں دھیرے دھیرے نارمل زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔

✽ ✽ ✽

فیصل آباد آنے کے بعد میں نے چند ماہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کی پھر مجھے سرکاری جاب مل گئی تو میں نے سول اسپتال جانا شروع کردیا ان دنوں میں بے حد مطمئن اور پرسکون رہنے لگی تھی کیونکہ میرے حساب سے میرا جدوجہد کرنے اور تکلیفیں اٹھانے کا زمانہ گزر گیا تھا میں نے جتنی محنت کرنا تھی وہ کرلی تھی اور میرا خیال تھا کہ اب میرا اس طویل جدوجہد اور محنت کا پھل کھانے کا زمانہ آچکا ہے مگر میری یہ سوچ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی تھی اور میرے سکون اور اطمینان کو رخصت ہوتے بھی زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

امی جان اب بیمار رہنے لگی تھیں اور ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اپنے جیتے جی مجھے میرے گھر کا کر جائیں میرے آنے کے بعد انہوں نے بارہا اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا میں پہلے پہل تو اس ذکر کو ہنسی میں ٹالتی رہی مگر پھر جب امی جان کی بے قراری دیکھی تو مجھے بھی اس معاملے میں سنجیدہ ہونا پڑا اگرچہ میں نے کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح راتوں کو تاروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر کسی بانکے سجیلے راجکمار کے سپنے تو نہیں دیکھے تھے بلکہ درحقیقت مجھے کبھی

ایسے سپنے دیکھنے کی فرصت ہی زندگی نے نہیں دی تھی مگر تھی تو میں ایک لڑکی ہی نا۔

امی جان کے سامنے شادی کی ہامی بھرنے کے ساتھ ہی میری آنکھوں نے ان گنت خواب سجانے شروع کردیے تھے۔ اس وقت تک میرا خیال تھا کہ میری شادی ہوجانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آخر میں ڈاکٹر بن چکی تھی ہر ماہ ہزاروں کماتی تھی پھر جلد ہی اپنا چھوٹا سا کلینک بھی سیٹ کرنے والی تھی۔ بھلا کسی بھی خاندان کو مجھے اپنی بہو بنانے یا کسی بھی لڑکے کو مجھ سے شادی کرنے میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا مگر بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ یہ سب میری خوش فہمیاں ہی تھیں۔

میرے ڈاکٹر بن جانے سے نہ تو لوگوں کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی تھی اور نہ ہی معاشرے کی ترجیحات میں کوئی فرق پڑا تھا۔ وہاں اب بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لڑکوں کی مائیں اور بہنیں ابھی بھی اپنے لیے بہو اور بھابھی ڈھونڈتے ہوئے لڑکی کی دس خوبیوں کو بھلا کر اس کی کسی ایک کمزوری کو ایشو بنا سکتی تھیں اور جتنی چاہے لڑکیوں کو ریجکٹ کرسکتی تھیں۔ انہیں اس چیز سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ مومنہ سعید نے ڈاکٹر مومنہ سعید بننے کے لیے کتنا کٹھن اور تکلیف دہ سفر ننگے پاؤں طے کیا ہے۔ انہیں تو بس یہ نظر آتا تھا کہ میرے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے میرا بھائی مجھ سے لاتعلق نظر آتا ہے اور لاتعلق نظر نہ بھی آتا تب بھی وہ کوئی صاحب حیثیت انسان تو تھا نہیں اور یہ کہ ڈاکٹر بننے کے باوجود میں بہرحال ایک درمیانی سی شکل و صورت کی بے حد عام سی لڑکی تھی۔

میرے لیے آنے والا سب سے پہلا رشتہ میرے ایک کولیگ اور سابقہ کلاس فیلو ڈاکٹر ارسلان کا تھا۔ درمیانی قامت اور مناسب سی شکل و صورت کا ارسلان بے حد سنجیدہ اور کم گو انسان تھا۔ دوران تعلیم تو میری اس کے ساتھ شاذو نادر ہی کبھی بات ہوتی تھی مگر جب سے ہم نے اکٹھے سول اسپتال میں جاب شروع کی تھی تو پرانے کلاس فیلوز ہونے کے ناتے اور کچھ اس وجہ سے کہ اکثر ہمارے ڈیوٹی ٹائمنگ بھی ایک جیسے ہی ہوا کرتے تھے ہمارے درمیان کسی حد تک بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی اور پھر جب ایک روز میں نے باتوں باتوں میں ارسلان کو اپنی امی کی خواہش کے بارے میں بتایا تو وہ بے چین سا ہوگیا اور اس روز اس نے میرے سامنے اقرار کرلیا کہ وہ کالج کے دنوں سے ہی مجھے پسند کرتا ہے اور مجھ سے شادی کرنے کا خواہاں ہے۔

میں نے اگرچہ ارسلان کے بارے میں کبھی بھی اس طرح سے نہیں سوچا تھا مگر اس کے منہ سے یہ سب سن کر مجھے قدرتی طور پر بے حد خوشی کا احساس ہوا اس دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی تھا جو میرے بارے میں سوچتا تھا مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا یہ احساس اتنا خوش کن تھا کہ مجھے اپنا وجود ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اس رات میں دیر تک آئینے کے سامنے بیٹھی رہی اور اپنے چہرے کے ایک ایک نقش کو بہت توجہ اور محبت سے دیکھتی رہی میں اگرچہ عام سی شکل و صورت کی مالک تھی مگر اس رات نہ جانے کیوں مجھے اپنا ایک ایک نقش بے حد خاص اور خوبصورت لگ رہا تھا۔

اگلے تین دن تک میں یونہی ہواؤں میں اڑتی رہی مگر تین روز بعد جب ارسلان کی امی اور بہنیں ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے مجھے اور میرے گھر کو دیکھتے ہی ریجکٹ کردیا تو میرے دل کی خوشی لمحوں میں اڑن چھو ہوگئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں دیر تک گم سم سی بیٹھی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے میرے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ ارسلان ان لوگوں کو ان کی ناپسندیدگی کے باوجود منالے گا۔ اس کی امی اور بہنیں نہ سہی مگر وہ تو مجھے پسند کرتا ہے اس خیال نے میرے دل کو تھوڑی سی تقویت پہنچائی تھی مگر اگلے روز اسپتال میں جب میں نے ارسلان کو خود سے نظریں چراتے دیکھا تو میں اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اس سے اس کے رویے کی تبدیلی کا سبب بھی نہ پوچھ سکی اور پھر جب ارسلان کی شادی ڈاکٹر سدرہ سے ہوئی تو میں بالکل ہی ڈھے گئی۔

ڈاکٹر سدرہ مجھ سے ایک سال بڑی اور مجھ سے بھی زیادہ معمولی شکل کی مالک تھی مگر اس کا پلس پوائنٹ اس کے باپ اور بھائیوں کی وہ دولت تھی جو میرے اور میرے خاندان کے پاس نہیں تھی اس روز مجھے دولت کی ضرورت اور قدر قیمت کا صحیح معنوں میں احساس ہوا میں دن رات مشقت کرکے ڈاکٹر بن گئی تھی مجھے اچھی جاب مل گئی تھی میں نے پرائیویٹ بھی تھوڑا بہت کام شروع کردیا تھا اور ماہانہ اتنا کمانے لگی تھی کہ اپنی تمام ضروریات بخوبی پوری کرسکتی تھی اپنی پسند کے کپڑے اور جوتے خرید سکتی تھی اپنی مرضی کا کھا سکتی تھی مگر ان سب چیزوں سے مجھے معاشرے میں وہ عزت اور وہ وقار نہیں مل سکتا تھا جس کے لیے میں نے اتنی اذیتیں اٹھائی تھیں۔

ارسلان کے بعد بھی میرے لیے کئی رشتے آئے مگر ان میں سے جو اچھے اور پڑھے لکھے لڑکوں کے رشتے تھے انہوں نے ہمارے گھر کے در و دیوار سے لپٹی مفلسی کو دیکھ کر دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا اور جنہوں نے مجھے اور میرے گھر کو پسند کیا وہ کسی طرح بھی میرے معیار کے لوگ نہیں تھے وہ سب ویسے ہی رشتے تھے جس طرح کے لڑکوں سے میری دونوں میٹرک پاس بہنوں کی شادیاں ہوئی تھیں تو پھر اگر مجھے انہی کی طرح رہنا تھا ویسی ہی زندگی گزارنا تھی تو مجھے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تھک ہار کر میں نے شادی کرنے سے ہی انکار کردیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں اس نام نہاد معاشرتی نظام کے آگے ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔

میرے شادی سے انکار کے فیصلے کو سن کر امی جان مزید خاموش تو ضرور ہوگئی تھیں مگر انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اور میرے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ انہوں نے مجھ پر کوئی پریشر ڈال کر میرا فیصلہ تبدیل کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ امی جان کو میری شادی کروانے کی کس قدر شدید خواہش ہے مگر میں ان کی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر تھی میری فطرت کچھ اس طرح کی تھی کہ میں دب کر اور مزاج کے خلاف کوئی سمجھوتہ کرکے رہ ہی نہیں سکتی تھی ورنہ شاید امی جان کی خاطر میں یہ بھی کر گزرتی۔ جو زباں سے تو کچھ نہیں کہتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں ہر روز میرے لیے ایک ہی سوال ہوتا تھا جس سے میں روز ہی نظریں چرالیتی تھی۔ اور پھر یہ نظریں چرانے کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا امی جان بھی ایک رات چپ چاپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کی موت نے مجھے مزید تنہا اور اکیلا کردیا میں نے مصروف رہنے کے لیے ایک دوسری جگہ بھی جاب شروع کردی۔ اب میں اچھا خاصا کمانے لگی تھی اور شاید اسی وجہ سے میرے بھائی بھابی اور بہنوں کا رویہ بھی میرے ساتھ اچھا ہوگیا تھا۔ اگرچہ میں ان لوگوں کے ساتھ اب بھی گھلتی ملتی نہیں تھی مگر اب میں ان کی کسی نہ کسی حد تک مالی مدد کرنے لگی تھی۔

امی جان کی وفات کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے جب مجھے بہت اچھی سیلری پیکج کے ساتھ سعودی عرب میں جاب مل گئی اور میں سب کچھ چھوڑ کر وہاں روانہ ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

پڑھائی میں شروع ہی سے میرا دل نہیں لگتا تھا۔ کتاب کھولتے ہی مجھ پر اکتاہٹ طاری ہوجایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات گھنٹوں کتاب کھول کر بیٹھے رہنے کے باوجود میں کچھ بھی پڑھ نہیں پاتا تھا۔ اس لیے ہر کلاس میں میں بس مارے باندھے پاس ہوجایا کرتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں اچھی کارکردگی دکھانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ مگر چونکہ مجھے پڑھنے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی اور پھر میں کوئی بہت ذہین بھی نہیں تھا اس لیے ہمیشہ اوسط درجے بلکہ شاید اوسط سے بھی کچھ نچلے درجے کا طالب علم ہی رہا مگر اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے میں پڑھائی کو کبھی چھوڑنے کا سوچ بھی نہ سکا کیونکہ اس کے علاوہ میری پاس آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آخر کار

کسی نہ کسی طرح روپیٹ کر میں نے پہلے بی کام اور پھر ایم کام کی ڈگری حاصل کر ہی لی۔ مگر معاشرے میں کوئی مقام پانے کے لیے اور اپنی زندگی کو اچھی طرح سے گزارنے کے لیے یہ ڈگری کافی ثابت نہیں ہو سکی۔

آٹھ ماہ تک ہر طرح کی کوشش کرنے کے بعد بھی مجھے کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل سکی تو مجبوراً خالو جان کو میرے لیے کوشش کرنا پڑی اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح مجھے ایک پرائیویٹ بینک میں ملازمت دلوادی جو میرے مزاج کے مطابق تو ہرگز نہیں تھی مگر سال بھر سے جو میں جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا اس سے مجھے اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ جیسی میری قابلیت ہے اور جس طرح میں نے ڈگری لی ہے مجھے اس سے بہتر ملازمت ملنا تقریباً" ناممکن ہی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے وہ ملازمت کرلی مگر جب میں نے بینک جانا شروع کیا تو مجھے صحیح معنوں میں دانتوں پسینہ آگیا۔ بے تحاشا کام لمبی ٹائمنگ اور بات بہ بات پڑنے والی جھڑکیوں نے مجھے ملازمت تو کیا زندگی سے ہی بے زار کرنا شروع کردیا۔ میرے سارے خواب شیشے کے کھلونوں کی طرح بکھر گئے تھے اور مجھ میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ میں ان ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں کو چن سکوں۔ میں اتنا دکھی اور بے زار ہو چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگتا تھا۔ میں زندگی سے کیا چاہتا تھا اور زندگی مجھے کیا دے رہی تھی۔ میں جیسے تقدیر کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح تھا ایک ایسا کھلونا جو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ان دنوں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز سے ایک عجیب سی چڑ محسوس ہونے لگی تھی۔ میں بس یہ چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی خزانہ میرے ہاتھ لگ جائے اور میں وہ سب حاصل کرلوں جس کے لیے میں اتنے برسوں سے ترستا آرہا ہوں۔

اور پھر شاید قدرت کو مجھ پر رحم آگیا تھا کہ ایک روز بالکل اچانک ہی میرے سامنے ڈاکٹر مومنہ کی شکل میں ایک خزانہ آگیا۔

☼ ☼ ☼
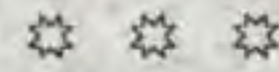
سعودی عرب میں میں نے چار سال کام کیا پھر مجھے برطانیہ جانے کا موقع مل گیا تو میں وہاں چلی گئی اور اگلے سات برس تک میں نے وہاں کام کیا اور بے تحاشا روپیہ کمایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں پورے گیارہ برس کے بعد اپنے وطن واپس لوٹی تو اتنی دولت مند ہو چکی تھی کہ میرے اپنے بھائی، بہن اور دیگر رشتہ دار تک مجھ سے مرعوب رہنے لگے تھے۔ میں نے جتنا روپیہ کمایا تھا۔ اس میں سے بیشتر کہیں نہ کہیں انویسٹ کرتی گئی تھی جواب مجھے کئی گنا ہو کر واپس مل رہا تھا۔ میں جتنی دولت کمانے کا عزم کرکے ملک سے باہر گئی تھی اس سے کہیں زیادہ کمارہی تھی۔ اور میرے پاس بلاشبہ روپے کی ریل پیل ہو چکی تھی۔ مگر میں نے اپنی زندگی کے گیارہ قیمتی سال اس دولت کے حصول میں گنوادیئے تھے۔ اب میری عمر بتیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ اور میرے حساب سے اب میری شادی کا کوئی چانس نہیں بچا تھا۔ اس لیے اب میں اس بارے میں کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچتی تھی بلکہ اس بارے میں سوچنا تو میں نے اس وقت چھوڑ دیا تھا جب اپنے دل پر بے وقعتی ناقدری کے ڈھیروں ڈھیر زخم لے کر میں نے اپنا ملک چھوڑا تھا پچھلے گیارہ سالوں میں بھی اگرچہ کچھ لوگ تھے جو مجھ سے شادی کرنے کے خواہاں نظر آئے تھے مگر مجھے کسی کو بھی آزمانے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور میں اپنی آنکھیں بند کیے بس اپنے متعین کیے ہوئے راستے پر چلتی رہی تھی۔ مگر پاکستان آنے کے بعد جب اپنے بھائی اور اپنی بہنوں کے بچوں کو دیکھتی تو کبھی کبھی میرے اندر یہ خواہش مچلنے لگتی تھی کہ کاش ان بچوں کے بیچ میں میرے اپنے بچے بھی ہوتے۔ مگر میں اپنی اس خواہش کو سختی سے کچل دیا کرتی تھی۔

اس دنیا میں کچھ بھی پانے کے لیے ہر انسان کو اس کی ایک قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ میں نے دولت حاصل کرلی تھی تو اس کی قیمت بھی تو مجھے ہی چکانا تھی نا۔ اور شاید اس کی قیمت یہی تھی کہ میں فطری زندگی سے دور رہوں اور تنہا رہوں۔ سو میں یہ قیمت چکا رہی تھی۔

واپس آنے کے بعد میں چند روز ہی اپنے بھائی کے گھر ٹھہری تھی پھر میں نے شہر کے پوش علاقے میں ایک شاندار کوٹھی خرید لی اور وہاں منتقل ہو گئی۔ کوٹھی کے نچلے پورشن کو میں نے اپنے کلینک کا درجہ دیا تھا۔ اور روز شام کو دو گھنٹے وہاں بیٹھا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے ہسپتال کی تعمیر بھی شروع کروادی تھی۔ اور شہر کے دو مہنگے ہسپتالوں میں ہفتے میں تین تین دن کے لیے جانے لگی تھی ہر طرف سے مجھے بے تحاشا آمدنی ہو رہی تھی۔ جو رقم میں نے مختلف نوعیت کے کاروبار میں لگا رکھی تھی وہ بھی دن دوگنی اور رات چوگنی ہو کر بڑھ رہی تھی۔ اور اب میرے اپنے بھائی اور بہنوں سے بھی اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ میں اکثر ہی ان لوگوں سے ملنے چلی جایا کرتی تھی اور وہ لوگ بھی باقاعدگی سے میرے گھر آتے رہتے تھے۔ اب چونکہ میں ان لوگوں کو قیمتی تحائف دے سکتی تھی اور جب بھی جس کو جتنی رقم کی ضرورت ہوتی میں بغیر کوئی سوال کیے ان لوگوں کو دے دیا کرتی تھی اس لیے اب میں ان سب کی چھوٹی لاڈلی بہن تھی۔ جس میں بظاہر ان سب کی جان تھی ان کے بچے بھی میرے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ اور مجھے ان سب کا یوں میرا خیال رکھنا اچھا لگتا تھا اس لیے میں نے کبھی کسی کے سامنے ماضی کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی خود ان تلخ دنوں کو سوچتی تھی جو بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہاں کبھی کبھی مجھے امی جان کا خیال بے چین کردیا کرتا تھا اور مجھے ان کی آخری خواہش یاد آنے لگتی تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنی موت سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے میرا ہاتھ تھام کر کیا تھا۔

"مومنہ! تم شادی ضرور کرنا۔ جب بھی جیسے بھی آدمی سے کرو مگر یہ کام ضرور کرنا۔"

انہوں نے بہت مدھم سرگوشی ——— میں مجھے کہا تھا۔ تب تو میں نے روتے ہوئے اثبات میں سر بھی ہلا دیا تھا مگر دل سے میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور بعد میں بھی میں اپنے اس عزم پر قائم رہی تھی کہ مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے مگر اب جب سے میں پاکستان آئی تھی نہ جانے کیوں مجھے وہ رہ رہ کر امی کی خواہش یاد آرہی تھی۔ جو ہر بار ہی مجھے بے چین کردیا کرتی تھی۔ مگر میں اپنی جھیل جیسی پرسکون زندگی میں کوئی تلاطم نہیں چاہتی تھی اس لیے کوشش کرکے اس طرح کے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا کرتی تھی۔ اور شاید میں عمر بھر ایسا ہی کرتی رہتی اگر میری زندگی میں وہ شخص نہ چلا آتا جس نے اس پرسکون جھیل میں ایسا کنکر پھینکا کہ پھر اس جھیل کے پرسکون پانیوں میں پھیلنے والے بھنوروں کو روکنا میرے بس میں ہی نہ رہا۔

☼ ☼ ☼
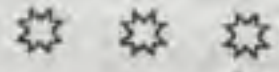
خالو کے ایک بڑے بھائی ——— اس گاؤں میں رہتے تھے جہاں ہمارا گھر تھا۔ ان کے گھر ہمارا بہت زیادہ آنا جانا تو نہیں تھا مگر خالہ اکثر ہی ان کے گھر چلی جایا کرتی تھیں کیونکہ اپنے جیٹھ کی دونوں بہوؤں سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ البتہ میں ان کے گھر بمشکل دو چار مرتبہ ہی گیا تھا کیونکہ وہاں میری دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا تایا جان، خالو سے کئی سال بڑے تھے اور ان کے سبھی بچوں کی شادیاں میرے اسکول کے زمانے میں ہی ہو گئی تھیں اس لیے میری وہاں کسی سے دوستی تو کیا معمولی سی بے تکلفی بھی نہیں تھی مگر اس روز مجھے خالہ کے اصرار پر ان کے ساتھ وہاں جانا پڑا کیونکہ گھر میں میرے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اس وقت وہاں جاسکتیں اور انہیں وہاں کوئی ضروری کام تھا اس لیے مجھے ان کے ساتھ جانے کے لئے راضی ہونا ہی پڑا۔

ان کا گھر چونکہ گاؤں کے آخری سرے پر تھا اس لیے میں خالہ کو اپنی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر وہاں لے گیا۔ تایا کے گھر کے دروازے پر جب میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہاں دیوار کے ساتھ کھڑی شاندار بی ایم

ڈبلیو نے ایک لمحے میں میری توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ مجھے اتنی شاندار اور قیمتی کار وہاں دیکھ کر بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ تایا کے مالی حالات ہم سے قدرے بہتر تھے مگر اتنے اچھے بھی نہیں تھے کہ بی ایم ڈبلیو رکھنے والے لوگوں کا ان کے گھر آنا جانا ہو۔

حیرت زدہ سا میں خالہ کے ساتھ گھر کے اندر آیا تو حیرت کا دوسرا جھٹکا مجھے وہاں ایک کرسی پر بیٹھی گندمی رنگت والی دبلی پتلی خاتون کا دیکھ کر لگا اس لیے نہیں کہ اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا بلکہ اس لیے کہ وہ قیمتی لباس اور ہیروں کا اتنا شاندار زیور پہنے ہوئے تھی۔ جو ہمارے خاندان کی عورتوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اگرچہ اس کی شکل و صورت میں کوئی خاص بات نہیں تھی مگر اس کے قیمتی لباس زیورات اور اس کے رکھ رکھاؤ نے اسے بے حد شاندار اور منفرد شخصیت بنادیا تھا۔

میں دل ہی دل میں اس سے بری طرح سے مرعوب ہوچکا تھا مگر میں نے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہاں موجود تایا کی چھوٹی بہو نے اس کا تعارف ہم سے کروایا وہ اس کی چھوٹی بہن تھی اور ڈاکٹر تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ پچھلے کچھ عرصے سے خالہ' تایا کی بہو کی چھوٹی بہن کا بارہا تذکرہ کرچکی تھیں۔ جو گیارہ سال باہر گزار کر واپس پاکستان آئی تھی اور بہت دولت مند ہوچکی تھی۔ تب تو میں نے ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ میرے ذہن میں جب بھی اس کا کوئی نقشہ بنا وہ تایا کی چھوٹی بہو جیسا ہی بنا تھا۔ عمر رسیدہ' معمولی شکل کی مالک اور بے حد عام سی شخصیت' مگر ڈاکٹر مومنہ تو میرے اندازوں سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اس کی عمر بے شک زیادہ تھی خصوصاً" مجھ سے تو وہ یقیناً" کئی سال بڑی تھی مگر دبلی پتلی جسامت اور اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ اتنی زیادہ عمر کی لگ نہیں رہی تھی جتنی عمر کی وہ تھی۔ پھر بے تحاشا دولت نے اس کی شخصیت میں جو تمکنت پیدا کردی تھی۔ وہ بھی اسے بہت خاص بنا رہی تھی۔

ہمارے وہاں آنے کے بعد وہ بس تھوڑی دیر ہی رکی تھی پھر وہاں سے رخصت ہوگئی۔ مگر وہ جتنا وقت بھی ہمارے سامنے رہی میں نے اس کو کئی مرتبہ تعریفی اور ستائشی نظروں سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میری شکل و صورت اور پرسنالٹی اتنی ہی شاندار تھی کہ پہلی بار ملنے والے حیرت زدہ اور ستائشی نظروں سے مجھے بار بار دیکھا ہی کرتے تھے مگر مومنہ کا یوں اپنی طرف ۔۔۔ دیکھنا میرے لیے خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے یوں اپنی طرف دیکھنے سے مجھے فخر کی بجائے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا اور مسرت کا یہ احساس اس کے جانے کے بعد بلکہ رات گئے تک میرے ساتھ رہا تھا۔ میں سارا وقت مومنہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور رات کو سونے سے پہلے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں کسی بھی طرح مومنہ سے شادی ضرور کروں گا۔ دولت جائیداد اور اپنی من پسند آسائشیں حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ بے شک وہ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی تھی مگر اس سے شادی ہوجانے کی صورت میں مجھے جو کچھ حاصل ہوسکتا تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں عمروں اور شکل و صورت کے فرق کو بخوشی بھولنے پر تیار تھا۔

اگلی صبح ہی میں نے کسی نہ کسی طرح تایا کی بہو سے مومنہ کا ایڈریس اور فون نمبر معلوم کرایا۔ اور اسی شام اس سے ملنے کے لیے اس کے شاندار کلینک میں جا پہنچا۔ میں جو بازی کھیلنے جارہا تھا۔ اسے جیتنے کے لیے ضروری تھا کہ جتنی جلدی ہوسکے میں اپنا پتہ پھینک دوں۔ اور میں نے یہی کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تابش کو میں نے پہلی بار اپنی بڑی بہن کے گھر میں دیکھا۔ وہ اس کی چچی ساس کا بھانجا تھا۔ اور اپنے ماں باپ کے انتقال کے بعد خالہ کے پاس ہی رہ رہا تھا۔ میں غائبانہ طور پر اس سے واقف تھی۔ کچھ ہفتے پہلے ہی میری بہن نے باتوں باتوں میں اس کا تذکرہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کی چچی ساس جلد ہی تابش کی شادی اپنی

چھوٹی بہن سے کرنے والی ہیں۔ تب تو میں نے قدرتی طور پر اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ کیونکہ نہ میں تابش کو جانتی تھی اور نہ ہی اس کی خالہ کی بیٹی کو۔ مگر اس روز جب میں نے پہلی بار تابش کو روبرو دیکھا تو مجھ پر ایک عجیب سی خود ترسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

وہ بلا کا خوبصورت اور وجیہہ تھا میں نے اس سے پہلے اتنا خوبصورت مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میری نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ اور مجھے رہ رہ کر اس لڑکی کی قسمت پر رشک آرہا تھا جسے اتنا شاندار شریک سفر ملنے والا تھا۔ ساتھ ہی مجھے اپنا آپ بہت کم مایہ لگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کاش کوئی اتنا ہی شاندار شخص مجھے بھی ملا ہوتا تو زندگی کتنی مکمل اور خوبصورت ہوتی۔ میرے دماغ پر اس روز عجیب و غریب سی سوچیں طاری تھیں جنہوں نے گھر آنے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اتنے سالوں سے تھپک تھپک کر سلائے گئے میرے ارمان اس روز اچانک ہی ایک بار پھر سے جاگنے لگے تھے۔ حالانکہ وجہ کچھ بھی نہیں تھی۔ تابش اگر بہت خوبصورت تھا اور اس کی کسی لڑکی سے شادی ہو رہی تھی تو اس سے میرے جینے مرنے پر بھلا کیا فرق پڑتا تھا مگر میں جانے کیوں بار بار اس کو سوچے جارہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی مگر اللہ کا شکر ہے کہ میری یہ کیفیت بس چند گھنٹوں تک رہی تھی۔

شام کا وقت تو میرا یوں بھی بے حد مصروف گزرا کرتا تھا۔ اس لیے کلینک جاکر میرے ذہن سے اس کا خیال بتدریج محو ہوتا گیا۔ اور اگلی صبح تک میں اسے تقریباً" فراموش کرچکی تھی۔ مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس شام وہ مجھ سے ملنے چلا آیا۔ میں تب کلینک سے اٹھنے ہی والی تھی جب مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ پہلے تو مجھے اس کے آنے پر شدید قسم کی حیرت ہوئی پھر خیال آیا کہ شاید اسے کسی مریض کو دکھانا ہوگا یا کوئی اور اس طرح کی بات ہوگی۔ اور میرے ساتھ چونکہ ان لوگوں کی دور پرے کی ہی سہی مگر رشتے داری تو ہے اس لیے وہ میرے پاس چلا آیا۔ جب تک پیون نے مجھ سے اجازت لینے کے بعد اسے اندر نہیں بھیج دیا میرے دماغ میں یونہی طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں جیسے روشنی سی پھیل گئی۔ بلو جینز اور لائننگ والی آف وہائٹ شرٹ میں وہ بلا کا خوبصورت لگ رہا تھا مجھے اعتراف ہے کہ اسے سامنے پاکر میں اپنی تمام تر مضبوطی اور اعتماد کے باوجود ایک پل کے لیے نروس ہوگئی تھی اور ایسا شاید اس کی بے مثال خوبصورتی کی وجہ سے تھا۔ بہر حال جیسے تیسے میں نے خود کو کمپوز کرکے بیٹھنے کے لیے کہا۔

”کیسے آنا ہوا تابش صاحب“

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے بڑی تہذیب سے اس سے سوال کیا تھا اس نے فوراً" جواب دینے کی بجائے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی بے حد خوبصورت آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر بڑے سکون سے بولا۔

”مومنہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں“

میرے قریب جیسے کوئی دھماکہ ہوا تھا۔ میں ساکت بیٹھی تحیر زدہ سی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

مجھے یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی کہ مومنہ کے سامنے اگر شادی کی پیشکش میں نے فوراً" نہ رکھی تو بعد میں میرے لیے اتنی ہمت کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا اس لیے اس شام اس کے کلینک میں جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے وہاں بیٹھنے کے محض تین منٹ بعد ہی اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کردیا میری بات سن کر وہ گویا سکتے میں آگئی تھی۔ اس کے تو سان و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس سے ایسی بات بھی کہہ سکتا ہوں اور وہ بھی اتنی اچانک کتنی ہی دیر تک وہ خاموش بیٹھی حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی بھی تو اس کی آواز سے بے یقینی مترشح تھی۔

”تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو“

اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
"میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں"
"تمہیں پتا ہے میں عمر میں تم سے کتنی بڑی ہوں؟"
اس نے سب سے پہلے وہی اعتراض کیا تھا جس کی میں توقع کر رہا تھا اس لیے میں مسکرا کر آرام سے بولا۔
"جب عمر کی پروا مجھے نہیں ہے تو آپ کیوں کر رہی ہیں؟"
چاہنے کے باوجود میں اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کر پایا تھا جس کی وجہ اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہونے سے بڑھ کر اس کی شخصیت کا رعب تھا جو مجھ پر کافی اثر انداز ہو رہا تھا۔ مگر میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے دل کی مرعوبیت میرے چہرے پر نہ آسکے اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا اس لیے مومنہ نے مجھ سے نہ تو کوئی سخت لفظ کہا اور نہ ہی کسی ناگواری کا اظہار کیا بلکہ اس کے برعکس اس نے بڑی نرمی سے مجھ سے معذرت کی تھی۔
"میں معافی چاہتی ہوں تابش اگر ایسا ہونا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ امید ہے کہ تم اس بارے میں دوبارہ کوئی بات نہیں کرو گے۔" اس نے بڑے ناصحانہ اور مدبرانہ انداز سے کہا تھا مگر مجھے ــــ اس کا انداز برا لگا اور نہ ہی میں مایوس ہوا۔ اسے ہسپتال جانا تھا وہ اٹھی تو میں بھی اٹھ کر آگیا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور اگلے ایک ماہ تک اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ کبھی اس کے کلینک جاتا کبھی گھر اور فون تو روز ہی کیا کرتا تھا۔ میرے اس قدر حوصلے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مومنہ نے مسلسل انکار کرنے کے باوجود ایک بار بھی مجھ سے سختی سے بات نہیں کی تھی اور نہ ہی مجھ سے ملنے سے انکار کیا تھا۔ البتہ اس نے شاید اپنی بہن کو بتادیا تھا۔ اور اس کی بہن سے بات میری خالہ تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے ایک رات خالہ نے مجھ سے اس بارے میں باز پرس کی اور مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ میری شادی مرینہ سے کرنا چاہتی تھیں۔ مگر میں مرینہ سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ خوبصورت اور سگھڑ لڑکی تھی۔ میں اس سے بہت مانوس بھی تھا۔ مگر اس سے شادی کرنے کا مطلب تھا کہ مسائل کا ایک انبار اپنے سر پر لاد لیا جائے۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا اور مرینہ سے شادی کی صورت میں ظاہر ہے کہ مجھے اپنے لیے الگ گھر کا بندوبست کرنا پڑتا میں ساری عمر تو خالو جان کے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا اور اگر میں ایسا کرتا تو کچھ دوسرے مسائل بھی لازمی پیدا ہوتے اس لیے میں خالہ جان کے آنسوؤں اور التجاؤں کو نظرانداز کر کے چپ چاپ ان کے سامنے سے اٹھ آیا مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں مرینہ سے شادی کر کے دربدر بھٹکتا پھروں اور ساری عمر ترس ترس کر گزاروں میں ایسا اسی صورت میں کر سکتا تھا اگر مجھے مرینہ سے محبت ہوتی مگر مجھے اس سے محبت نہیں تھی اور محبت تو مجھے مومنہ سعید سے بھی نہیں تھی جس کو اپنے ساتھ شادی کرنے کے لیے میں پچھلے ایک ماہ سے رضامند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
میں نے کہا نا کہ میں ایک خود غرض انسان تھا۔

☼ ☼ ☼

تابش بلاشبہ بہت خوبصورت تھا کسی خواب کی طرح کسی تصور جیسا۔ اور مجھے پہلی نظر میں وہ بہت اچھا بھی لگا تھا بلکہ اسے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سے احساس زیاں نے بھی بڑی دیر تک اپنی لپیٹ میں لیے رکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود جب اس نے مجھے شادی کی پیشکش کی تو میں سخت حیران ہوئی۔ یہ بات ایک بار بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی اسے دیکھ کر میں جس احساس زیاں کا شکار ہوئی تھی اس کی وجہ میری یہ سوچ تھی کہ کاش مجھے صحیح وقت پر اسی طرح کا ہم سفر ملا ہوتا ورنہ میں نے تو یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خود سے سات آٹھ سال چھوٹے شخص کے ساتھ شادی

کرلوں۔ اس لیے میں نے اسے فوراً" ہی انکار کردیا۔ میرا خیال تھا کہ میرے انکار کے بعد وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا مگر اس نے تو گویا میرا پیچھا ہی لے لیا تھا۔ ہر روز فون کرتا بار بار ملنے کے لیے چلا آتا۔
میں اگرچہ اس کو مسلسل انکار کر رہی تھی مگر اس کے لیے میرے لہجے میں سختی ایک بار بھی نہیں آئی تھی اب غور کرتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ شاید میرے لاشعور میں بھی اس وقت یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ میری شادی تابش سے ہو جائے اس لیے تو میں اس سے کبھی سختی سے پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ بیس بائیں دن گزرنے کے بعد میں نے عالیہ باجی کو ساری صورت حال بتادی تھی۔ تابش ان کا سسرالی عزیز تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ کل کو کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جائے۔ عالیہ باجی میری بات سن کر حیرت زدہ سی ہو گئیں۔
"کیا واقعی تابش نے تم سے ایسی بات کی ہے؟"۔
کئی لمحوں کے بعد وہ بولیں تو ان کے لہجے میں بے یقینی تھی اور چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے جنہیں میں کوئی معنی نہ پہنا سکی اور خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اسے صاف انکار کردو بھلا تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ ہے۔ کئی سال چھوٹا ہے تم سے اور ویسے بھی چچی اس کی شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہتی ہیں۔"
انہوں نے فوراً" ہی دو ٹوک انداز میں کہا تھا اگرچہ ان کے کہے بغیر بھی میں تابش کو صاف انکار ہی کر رہی تھی مگر نہ جانے کیوں ان کے منہ سے یہ سب سن کر مجھے اچھا نہیں لگا۔ اور میرا ان سے مزید کوئی بات کرنے کو دل نہیں چاہا۔ حالانکہ وہ مجھ سے ابھی باتیں کرنا چاہتی تھیں مگر میں ضروری کام کا کہہ کر ان کے گھر سے جلد لوٹ آئی۔ میرے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آپڑا تھا اور مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگلے کئی روز میرے اس کیفیت میں گزرے تو میں گھبرا سی گئی اور چند روز کے لیے بھائی کے گھر جا کر رہنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ وہاں ان کے بچوں کے ساتھ میرا دل کافی بہل جایا کرتا تھا اور اب تو بھابی بھی مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی تھیں۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ اچانک ہی کیا اور بغیر کوئی پیشگی اطلاع دیئے بھائی کے گھر پہنچ گئی۔
بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے اپنی کار باہر پارک کرنے کے بعد میں بے دھڑک اندر چلی آئی اندر کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور آوازوں سے میں نے فوراً" ہی اندازہ لگالیا کہ میری دونوں بہنیں بھی آئی ہوئی ہیں۔ میں یکدم ہی خود کو ہلکا پھلکا اور خوش محسوس کرنے لگی تھی یوں جیسے صحرا میں چلتے چلتے کوئی مسافر سائے تلے پہنچ جائے یا کسی بچھڑے ہوئے کو اچانک اس کے اپنے مل جائیں اور اس کے وجود سے لپٹی تنہائی کی گرد پل بھر میں غائب ہو جائے۔ مگر میری یہ خواہش زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی تھی اب میں برآمدے تک پہنچ چکی تھی اور اندر سے آتی آوازوں کو بخوبی سن سکتی تھی۔ وہ یقیناً" عالیہ باجی تھیں جو میرے بارے میں بات کر رہی تھیں۔
"کچھ بھی ہو جائے ہمیں مومنہ کو اس شادی سے روکنا ہو گا۔ اس کا اور اس لڑکے کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔"
اگرچہ ان کے الفاظ کم و بیش وہی تھے جو کچھ دن پہلے انہوں نے میرے سامنے کہے تھے۔ مگر آج ان کا لہجہ مختلف تھا۔ آج ان کے لہجے میں ایک عجیب سا تنفر اور غصہ تھا جس نے پل بھر کے لیے مجھے سن کر دیا۔
"اور کیا مومنہ کی بھلا اب کوئی شادی کی عمر رہی ہے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھی ہے اور شادی کرنے کا شوق چڑھا ہے"۔
یہ میری دوسری بہن شائستہ تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میری سگی بہن میرے بارے میں اس طرح سے بات کر رہی ہے۔ بے شک میری ان دونوں سے کبھی بھی دوستی نہیں رہی تھی مگر میں ان کی بہن تو

تھی نا۔ پھر وہ کس دل سے میری تحقیر کر رہی تھیں۔ کیا ان کو ایک بار بھی یہ خیال نہیں تھا کہ میرا ان سے خون کا رشتہ ہے۔

"ارے وہ لڑکا مومنہ کی دولت کے پیچھے ہے۔ اور یہ بی بی خود کو قلوپطرہ سمجھ رہی ہیں۔"

بھابی بھلا کسی سے کیوں پیچھے رہتیں۔ انہوں نے بھی اپنی زبان سے زہر اگلنا ضروری سمجھا تھا۔ ان کے لہجے میرے لیے وہی تحقیر اور نفرت تھی جو میں اپنے نوجوانی کے اولین دور سے محسوس کرتی آئی تھی مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے میں نے ان کا یہ لہجہ کیسے بھلا دیا تھا ان کی شیریں بیانی کو کیسے ان کی اصل سمجھ لیا تھا۔ ان کے دل میں تو آج بھی میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی وہ تو آج بھی مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتی تھیں جتنی ان کے انداز میں میرے لیے تب ہوا کرتی تھی جب میں نے ان کی اور بھائی کی نافرمانی کر کے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے پر اصرار کیا تھا۔

"دیکھو بھئی سیدھی بات ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ مومنہ کے پاس جو کچھ بھی ہے اور جتنا بھی وہ مزید کمائے گی وہ کل کو ہمارے ہی بچوں کے کام آئے گا۔ لیکن آج اگر وہ شادی کر لیتی ہے تو ہمارا یہ خواب خواب ہی رہ جائے گا۔ اس لیے اس وقت تو ہمیں کچھ ایسا کرنا ہے کہ کسی بھی طرح اسے اس شادی سے باز رکھیں۔ اسے اپنائیت اور پیار سے سمجھاؤ کسی بھی طرح سے اس لڑکے کے خلاف مومنہ کے دل میں زہر بھر دو۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور میرے خیال سے دوبارہ وہ شادی کا نام بھی نہیں لے گی۔"

یہ میرا اکلوتا بھائی تھا۔ اس قدر بے رحم، شقی القلب اور لالچی میرا دل شدت سے چاہا کہ میں اندر جاؤں اور وہاں بیٹھے لوگوں میں سے ایک ایک کا منہ نوچ لوں انہیں آئینہ دکھاؤں اور ان کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں مگر میں چاہ کے بھی ایسا نہ کر سکی پتا نہیں ایسی کون سی چیز تھی جس نے میرے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ میں اگلے کئی منٹ تک وہیں ساکت کھڑی رہی اور آنسو میرا چہرہ بھگوتے رہے پھر میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور خاموشی سے وہاں سے پلٹ آئی۔

مین روڈ پر پہنچ کر میں نے اپنی کار سڑک کے کنارے روکی۔ اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کیا اور پچھلی سیٹ سے منرل واٹر کی بوتل اٹھا کر ڈھیر سارا پانی پیا۔ جب میرے حواس قابو میں آ گئے تو زندگی میں پہلی بار میں نے تابش کو خود کال کی دوسری طرف سے پہلی ہی بیل پر میری کال ریسو کر لی گئی۔

"تابش! میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں"

دوسری طرف سے تابش کی آواز سنتے ہی میں نے کہہ دیا تھا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد تابش نے چہک کر پوچھا تھا۔

"ہاں اور میں چاہتی ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائے۔"

میں نے سکون سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اور اپنی کار اسٹارٹ کرنے لگی مجھے خود پر حیرت ہو رہی تھی تابش سے صرف ایک منٹ بات کی تھی اور میرا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ غم غصہ اور دکھ جس نے کچھ دیر پہلے مجھے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا یکایک ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اور میں بڑے سکون سے کار چلاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف رواں تھی۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کے مان جانے کا اگرچہ میرے دل کو پہلے سے یقین تھا مگر پھر بھی جب اس نے فون کر کے مجھے یہ خوشخبری سنائی تو کتنی ہی دیر تک مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔ اور جب میں خود کو باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ واقعی ایسا ہو چکا ہے تو میرا دل چاہا کہ میں خوشی سے بھنگڑے ڈالوں اور ایک ایک شخص کو پکڑ پکڑ کر بتاؤں کو میں کس قدر خوش اور مسرور ہوں۔ لیکن مجھے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس روز جو بھی مجھ سے ملا اسے میری بے پایاں مسرت کا خود بخود احساس ہو گیا۔ اور گھر کے لوگوں کو تو پتا ہی تھا کہ ان دنوں میرے حواس پر مومنہ ہی چھائی ہوئی ہے۔ اس لیے میری خوشی اور غم دونوں کی وجہ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہاں مجھ سے کسی نے پوچھا نہیں کہ میں کیوں اس قدر خوش دکھائی دے رہا ہوں۔

خالہ تو ان دنوں مجھ سے ویسے ہی ناراض تھیں اور ضرورتاً بھی بات نہیں کرتی تھیں۔ باقی لوگوں کے موڈ بھی زیادہ اچھے نہ تھے اگرچہ باقی لوگ خالہ کی طرح مجھ سے اعلانیہ ناراض تو نہیں تھے مگر پھر بھی کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ کیونکہ ان کے ہر طرح سے سمجھانے بجھانے کے باوجود میں مومنہ سے ہی شادی کرنے پر مصر رہا تھا۔ اس لیے اب وہ مجھے سمجھانا ترک کر کے مجھ سے ایک طرح سے لاتعلق ہو گئے تھے۔

صرف ایک خالو جان تھے جنہوں نے شروع دن سے نہ تو اس معاملے میں کوئی رائے دی تھی اور نہ ہی ان کا رویہ مجھ سے بدلا تھا۔ اور باقی لوگوں کے رویے کی مجھے بھی کوئی پروا نہیں تھی۔

ان دنوں میں نے اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ کہ صبح سویرے بغیر ناشتا کیے گھر سے چلا جاتا اور رات گئے باہر سے کھانا کھا کر گھر گھستا۔ اور اشد ضرورت کے سوا کسی کو بھی مخاطب نہیں کرتا تھا۔ مگر اب صورت حال مختلف تھی مومنہ نے کہا تھا کہ میں اپنی خالہ اور خالو کو اس کے بھائی کے پاس رشتے کے لیے بھیجوں اس لیے مجھے خالہ سے نا صرف یہ بات کرنی تھی بلکہ منوانا بھی تھی۔ مگر میں نے خالہ سے جیسے ہی یہ بات کی انہوں نے چھکوں پھکوں رونا شروع کر دیا۔ اس روز نجمہ باجی بھی آئی ہوئی تھیں اور خالہ کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ خالہ کو یوں روتا دیکھ کر انہوں نے ایک ملامتی نظر مجھ پر ڈالی اور خالہ کو چپ کروانے لگیں۔

"امی! آپ مان لیں نا اس کی بات۔ جب یہ خوش ہے تو آپ کیوں ضد کر رہی ہیں۔"

باجی نجمہ نے خالہ کو گلے لگاتے ہوئے بہت نرمی سے سمجھایا تھا اور کم از کم یہ میرے سامنے تو پہلی بار ہو رہا تھا کہ کسی نے میری حمایت کی ہے۔ اس لیے مجھے بھی تھوڑا سا حوصلہ ہو گیا۔ اور میں خالہ کو منانے کی کوشش کرنے لگا مگر جب وہ میری کسی بھی بات کا جواب دینے کی بجائے بس روتی ہی رہیں تو مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"ٹھیک ہے خالہ اگر آپ مومنہ کے بھائی کے پاس میرا رشتہ لے کر نہیں جانا چاہتیں تو آپ کی مرضی مگر مجھے شادی اسی سے ہی کرنا ہے چاہے آپ رضامند ہوں یا نہ ہوں۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا آپ نہ جائیں۔" بہت اکتا کر میں نے کہا تھا۔ خالہ کا اتنا شدید ردعمل میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ میری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تابش! ہم کل ہی مومنہ کے بھائی سے بات کرنے جائیں گے۔"

خالو اچانک ہی اندر آئے تھے اور پہلی بار اس موضوع پر کچھ بولے تھے۔ حالانکہ اتنے دنوں سے گھر میں یہ موضوع زیر بحث تھا مگر وہ سب کچھ سن کر بھی یوں رہتے تھے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ان کا یہ رویہ کسی ایک معاملے میں نہیں تھا وہ ہمیشہ ہی کسی کے بھی معاملے میں دخل دینے سے پرہیز کیا کرتے تھے تاوقتیکہ کوئی شخص خود ان سے رائے مانگے ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے ان کے اور باقی گھر والوں کے درمیان ایک جھجک سی مانع رہا کرتی تھی۔ اور اسی جھجک کی وجہ سے میں اب تک مومنہ کے بارے میں ان سے بات نہیں کر پایا تھا۔

"مومنہ بھی ہماری بچیوں جیسی ہی ہے۔ اب اس کے بارے میں کوئی بھی منفی انداز سے بات نہ کرے۔ میں کل ہی اس کے بھائی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر آؤں گا۔"

خالو کا انداز ہمیشہ کی طرح دوٹوک تھا۔ اور وہاں کسی

میں ہمت نہیں تھی کہ ان کے فیصلے کے آگے کچھ بولے اس لیے سبھی خاموش ہو گئے تھے حتیٰ کہ خالہ کے بہتے آنسو بھی تھم گئے تھے۔ خالو اب انہیں سمجھا رہے تھے اور میں بے حد مطمئن سا باہر نکل آیا خالو کے اس معاملے میں پڑتے ہی میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا اب میرے سر پر کوئی ذمہ داری نہیں رہی تھی، اب جو بھی کرنا تھا خالو جان نے خود ہی کر لینا تھا۔ اور یہی ہوا تھا میری شادی کے دن تک انہوں نے نا صرف سارے معاملے خوش اسلوبی سے سنبھالے رکھے تھے بلکہ انہی کی وجہ سے گھر کے تمام لوگوں کا رویہ بھی مجھ سے پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اور وہ میری خوشی میں خوش نظر آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼
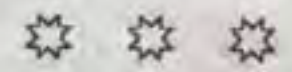
میرے لیے تابش کا رشتہ آیا تو میری بھائی بھائی اور بہنوں نے یکساں واویلا کیا۔ وہ سب بس یہ چاہتے تھے کہ میں یہ خیال اپنے دل سے نکال دوں اور پہلے کی طرح اپنی زندگی گزارتی رہوں اور میں اگر ایک روز پہلے ان کی باتیں نہ سن چکی ہوتی تو شاید ان کی باتوں پر نئے سرے سے سوچنے بیٹھ جاتی مگر اب ایسا نہیں تھا میں فیصلہ کر چکی تھی اور میرا اسے بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس لیے میں تابش کی خالہ اور خالو کے آنے سے پہلے ہی بھائی کے گھر بھی آگئی تھی اور میں نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ بھی کر دیا تھا میرے وہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے کے اندر ہی میری بہنیں بھی وہاں آگئیں اور وہ چاروں مجھے گھیر کر سمجھانے بیٹھ گئے۔ مجھے اس شادی سے روکنے کے لیے انہوں نے دلائل کا ایک انبار میرے سامنے لگا دیا۔ مگر جب میں ٹس سے مس نہ ہوئی تو عالیہ باجی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو مومنہ! اس لڑکے کو تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ صرف تمہاری دولت کی وجہ سے تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ورنہ خود سوچو تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ بنتا ہے۔"

ان کا لہجہ اتنا ہی تحقیر بھرا تھا جتنا ایک روز پہلے میرے بارے میں باتیں کرتے ہوئے تھا۔ مگر آج ان کے اس لہجے نے مجھے کل کی طرح سن نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی ان کے انداز پر میری آنکھوں میں آنسو آئے تھے اپنے خونی رشتوں کی بے مروتی پر مجھے جتنا رونا تھا میں ایک روز پہلے ہی رو چکی تھی۔ اب ان کے اپنے بارے میں کسی بھی طرح سے بات کرنے یا کچھ بھی کہنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے عالیہ باجی کے اس تحقیر آمیز انداز کے باوجود بالکل پرسکون بیٹھی رہی۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ میری دولت کی وجہ سے مجھ سے شادی کر رہا ہے اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔"

میں بولی تو میرا لہجہ بالکل صاف اور آواز ہموار تھی۔

"مگر جب کل کو اس کی لالچی طبیعت کا تمہیں ادراک ہو گا تو تم پچھتاؤ گی"

شائستہ باجی نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

"میں نہیں پچھتاؤں گی۔ کیونکہ میں پہلے سے جانتی ہوں کہ تابش کو مجھ میں کشش صرف میری دولت کی وجہ سے محسوس ہو رہی ہے۔ مگر ہم جس سے بھی شادی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کی کسی نہ کسی خوبی سے متاثر ہو کر ہی کرتے ہیں۔ اور اگر تابش کو دولت میری خوبی لگ رہی ہے۔ تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور بہتر ہے کہ آپ لوگ بھی اب کوئی اعتراض نہ کریں۔" بات کرتے کرتے آخر میں میرا لہجہ اچھا خاصا کھردار ہو گیا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ان لوگوں نے مزید کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تابش کے گھر والے آئے تو ان سے بھی بڑے اچھے طریقے سے بات کی اور اس روز میری شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ مجھے ان کے اس طرز عمل پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے کہ میں ہر حال میں تابش سے شادی کر لوں گی اس لیے اب مجھ سے مخالفت مول لے کر وہ اس تھوڑے بہت مفاد سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے جو ان کو مجھ سے حاصل ہونے کی توقع تھی۔

شادی کی تاریخ ایک ماہ بعد کی رکھی گئی تھی۔ اس

ایک ماہ میں میں نے اپنے۔ اور تابش کے لیے خوب شاپنگ کی۔ اور بے دریغ دولت خرچ کرتی رہی میرا گھر پہلے سے سجا سجایا اور ہر طرح کی سہولیات سے مزین تھا مگر میں پھر بھی گھر کی از سر نو آرائش پر رقم خرچ کرتی رہی۔ میری بہنیں اور بھابیاں بھی اکثر آجایا کرتی تھیں۔ اور مجھے یوں تیاریاں کرتے دیکھ کر بظاہر خوشی کا اظہار کرنے کے باوجود کوئی نہ کوئی ایسی چبھتی ہوئی بات ضرور کر دیا کرتی تھیں جو مجھے کئی کئی روز تک بے چین رکھا کرتی تھی۔ کیونکہ اندر سے میں بھی شدید قسم کے احساس عدم تحفظ کا شکار تھی۔ اپنے سے کئی برس چھوٹے اور اپنے سے کئی گنا خوبصورت شخص سے شادی کرنے کا میں فیصلہ تو کر بیٹھی تھی مگر اب فیصلے کے نتائج کیا نکلنے والے تھے میں اس بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ جو جوا میں کھیلنے جا رہی ہوں اس میں میرے ہاتھ کچھ آئے گا بھی یا میں وہ بھی گنوا بیٹھوں گی جو میرے پاس اس وقت موجود تھا۔ طرح طرح کی سوچیں اور وسوسے مجھے پریشان کرتے رہتے تھے اور شاید انہیں سوچوں اور وسوسوں سے بچنے کے لیے ہی میں اپنا دھیان شادی کی تیاریوں پر لگائے رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کے ساتھ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی میں گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا میں نے جتنے بھی خواب اپنی زندگی میں دیکھے تھے اس کی تعبیر ملنے کا وقت آگیا تھا۔ میں تصور ہی تصور میں کئی مرتبہ خود کو مومنہ کی شاندار کوٹھی میں ٹہلتے ہوئے دیکھتا جہاں نوکروں کی ایک فوج میرے اشارہ ابرو کی منتظر ہوا کرتی تھی۔ بہترین ملبوسات اعلا درجے کے کھانے اور قیمتی کاریں۔ مجھے دن رات للچائے رکھتی تھیں اگرچہ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مومنہ سے شادی کرنے کے فیصلے کے بعد خاندان کے اکثر افراد مجھے لالچی سمجھنے لگیں گے۔ مگر مجھے ان لوگوں کے خیالات یا ان کے تبصروں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں ان سب کی طرح ایک ایک خواہش کو ترستے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اس لیے مجھے جیسے ہی اپنی منزل مقصود تک کا شارٹ کٹ نظر آیا میں نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔ اب کوئی مجھے لالچی کہے یا خود غرض میری بلا سے۔ میں تو بس اپنی آئندہ زندگی کے خوبصورت اور سہانے خوابوں میں ہی خوش رہنے لگا تھا۔

باقی لوگ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد اپنے اپنے جیون ساتھی کے بارے میں سوچتے ہیں مگر میں باقی ہر چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا سوائے مومنہ کے۔ ویسے بھی مومنہ کے بارے میں کیا سوچتا؟ میں نے تو کبھی پورے دھیان سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میرے لیے تو وہ بس آسائشوں بھری زندگی گزارنے کا لائسنس تھی۔ اس لیے میں اس کو نہیں بلکہ اس کی وجہ سے عنقریب حاصل ہونے والی آسائشوں کا تصور کر کے خوش ہوتا رہتا تھا۔ مگر پھر ایک عجیب بات ہوئی جوں جوں شادی کے دن نزدیک آتے گئے میرے دل و دماغ پر اپنے ہونے والے جیون ساتھی کا خیال چھانے لگا۔ اب میں لاکھ سر جھٹکتا اپنے آپ کو دوسری سوچوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا مگر پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے خیالات کی رو بھٹک جاتی اور میں مومنہ کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اور شاید انہی خیالات اور سوچوں کا ہی اثر تھا کہ اپنی شادی کی رات جب میں اپنے حجلہ عروسی کی طرف جا رہا تھا تو میرا دل ایک بالکل نئی اور انجانی سے لے پر دھڑک رہا تھا۔ آج سے پہلے میں نے کبھی اس لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی کبھی کسی لڑکی نے میرے حواسوں پر قبضہ کیا تھا۔ میں تو ہمیشہ سے صرف دولت کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ صنف نازک کے بارے میں سوچنے کا تو مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا مگر شادی کی رات جب میں مومنہ کا گھونگٹ اٹھا رہا تھا تو میرا سارے کا سارا دھیان اس پر تھا۔ باقی ہر بات میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ مومنہ کے قریب جانے کے

لیے شاید مجھے خود پر جبر کرنا پڑے گا اور میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھا مگر شادی کی رات میری اپنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی جسے میں بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا ہاں اتنا ضرور تھا کہ میں خود کو بے حد خوش محسوس کر رہا تھا۔

میں۔۔۔ اس کا گھونگھٹ اٹھا رہا تھا مگر اس نے اپنا سر اتنا زیادہ جھکایا ہوا تھا کہ مجھے اس کی پیشانی اور پیشانی پر سجے جھومر اور ٹیکے کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اس انداز پر میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ پھر میں نے اپنی جیب سے وہ انگوٹھی برآمد کی جو میں نے اس کے لیے خریدی تھی اور اس کا مہندی اور چوڑیوں سے سجا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ بے حد سرد ہو رہا تھا۔ اور اس میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی مجھے بے اختیار ہی اس پر پیار آنے لگا اور میں نے انگوٹھی پہنانے کی بجائے اس کا ہاتھ چوم لیا میرے اس انداز پر اس نے بے اختیار ہی اپنا سر اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا مگر جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو ایک پل کے لیے مبہوت ہی رہ گیا وہ اتنی خوبصورت بھی لگ سکتی ہے میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اسے انگوٹھی پہنانا بھی بھول گیا تھا۔ بس ساکت بیٹھا ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ میرے اس انداز پر وہ شرما گئی۔ اور اس کے شرمانے کی ادا نے اس کے حسن کو جیسے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ میں نے بے خودی کے عالم میں اس کا ہاتھ تھاما اور اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا۔

اس وقت میں خود کو کسی ٹرانس میں محسوس کر رہا تھا مجھے مال و دولت روپیہ پیسہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس وقت میرے دل و دماغ پر صرف اور صرف مومنہ کا قبضہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ میری شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح تھی۔ اور اتنی خوبصورت تھی کہ مجھے خود ہی اپنے نصیب پر رشک آئے جا رہا تھا۔ وہ سارے ڈر خوف اور وسوسے جنہوں نے مجھے پچھلے پورے مہینے سے پاگل کر رکھا تھا ایک ہی رات میں کہیں غائب ہو گئے تھے۔ بلکہ اپنے ساتھ وہ میری زندگی بھر کی محرومیوں کو بھی کہیں دور لے گئے تھے میں خود کو اتنا پر اعتماد محسوس کر رہی تھی جتنا میں نے پوری زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ تابش کا ساتھ اس کا گزشتہ رات کا والہانہ انداز اس کی محبت یہ سب مجھے جیسے آسمانوں پر اڑائے لے جا رہے تھے۔

میں بے تحاشا خوش تھی تابش نے صرف میرے اندیشے میں ہی نہیں دور کیے تھے۔ بلکہ اپنی محبت اور اپنائیت سے وہ اعتماد بھی بخشا تھا۔ جس کے سہارے اب میں زندگی کی ہر آزمائش کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ میں خود کو بے حد معتبر محسوس کر رہی تھی۔ اب میرا بھی کوئی اپنا تھا جس سے میں اپنے سارے دکھ سکھ شیئر کر سکتی تھی۔

تابش کے ساتھ نے میری خاموش اور ویران زندگی کو رنگوں اور روشنیوں سے بھر دیا تھا۔ میری بہنوں اور بھابی نے اس کے حوالے سے مجھے جس جس اندیشے سے ڈرایا تھا۔ میں اب ان اندیشوں کے متعلق سوچتی تک نہ تھی۔ وہ لوگ کہتی تھیں کہ تابش نے دولت کی وجہ سے مجھ سے شادی کی ہے اور تب میں صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی تھی کہ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تب تو یہ صرف ایک جواب ہوتا تھا مگر اب مجھے احساس ہوتا تھا کہ تابش کے ساتھ اور اس کی محبت کے مقابلے میں تو یہ دولت میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا تو دل چاہتا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس پر اپنی تمام دولت لٹا دوں۔ اس کا صرف میرے سامنے ہونا مجھے ایسی خوشی سے ہمکنار کرتا تھا۔ جس کا ذائقہ میں نے آج تک نہیں چکھا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتا تو مجھے اپنی سماعتوں پر رشک آنے لگتا۔ وہ میرے چہرے پر محبت بھری ایک نظر ڈال لیتا تو خوشی سے میرے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

اس کی وجہ سے میں نے زندگی میں پہلی بار اپنا خیال رکھنا شروع کیا تھا میں باقاعدگی سے جم اور پارلر جانے لگی تھی۔ اپنے لیے پہلی بار پورے شوق اور دل سے شاپنگ کرنے لگی تھی۔ اور اپنی شخصیت میں آنے والے نکھار کو پوری طرح سے محسوس کرنے لگی تھی۔

صرف میں ہی نہیں میری شخصیت میں آنے والی مثبت تبدیلیوں کو باقی لوگ بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ اور یقینی طور پر بے حد حیران بھی تھے۔ انہوں نے جو کچھ میرے اور تابش کے رشتے کے حوالے سے سوچا تھا۔ اور جن جن باتوں سے مجھے ڈرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اصل صورت حال اس سے بہت مختلف نکلی تھی۔ میں تابش کا ساتھ پا کر بے حد خوش اور مطمئن نظر آنے لگی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس شادی کے بعد میری بہنوں بھائی اور بھابی کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اور میں واضح طور پر محسوس کرنے لگی تھی کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ان کے انداز میں اب جو خوشامد اور چاپلوسی ہوتی ہے۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوا کرتی تھی حالانکہ میں سمجھ رہی تھی کہ ان سب کی مخالفت مول لے کر میں جو شادی کر رہی ہوں اس کے بعد تو وہ میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہوں۔ مگر اس کے برعکس وہ نا صرف اکثر مجھ سے فون پر بات کرتے تھے بلکہ ہفتے میں ایک دو دفعہ میرے گھر بھی ضرور آیا کرتے تھے۔ اور باقاعدہ اصرار کر کے مجھے اور تابش کو اپنے گھر بلاتے اور ہماری خوب آؤ بھگت کرتے تھے۔ ان کی اتنی ساری مہربانیاں حیران کرنے کے ساتھ مجھے بہت خوش بھی کرتی تھیں اور میں بھی جواباً" ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور ان کا خیال رکھنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ ان پر اور ان کے بچوں پر بے تحاشا روپیہ لٹایا جائے۔ اور میں ایسا اب مجبوری سے نہیں اپنی خوشی سے کرتی تھی۔ اللہ نے مجھے اتنی ڈھیروں خوشیاں عطا کر دی تھیں میرے نامکمل وجود کو تکمیل دے دی تھی۔

میں ان دونوں اتنی خوش تھی کہ مجھے کائنات کی ہر چیز خوبصورت لگنے لگی تھی۔ ہر رشتہ اچھا لگتا تھا ان لوگوں پر بھی پیار آنے لگا تھا جن سے مجھے زندگی بھر دکھ ہی ملے تھے۔

اپنے گھر والوں سے اچھا سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ میں تابش کی خالہ اور ان کے گھرانے کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اتنے سالوں تک تابش کا اتنی محبت سے خیال رکھا اور جب تابش نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا تو انہوں نے اس معاملے میں روڑے نہیں اٹکائے اس لیے مجھے وہ سب بھی بہت عزیز ہو گئے تھے اور میں ہر ہفتے تابش کے ساتھ اس کی خالہ کی گھر جاتی تھی اور ان لوگوں سے خوب گھل مل کر باتیں کرتیں ۔حالانکہ تابش اکثر وہاں جانے سے ہچکچاہٹ سی محسوس کرتا تھا مگر میں چاہتی تھی کہ اس کا رشتہ اپنے لوگوں سے ہمیشہ مضبوط رہے۔ اس لیے میں تابش کو ساتھ لے کر گاہے بگاہے اس کی خالہ کے گھر چلی جاتی تھی اور ان لوگوں کو بھی بصد اصرار اپنے گھر بلاتی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تابش بے شک منہ سے کچھ نہ کہے مگر میرا اس کی خالہ کے گھرانے کو اہمیت دینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مومنہ سے شادی کر کے مجھے وہ سب کچھ مل گیا تھا۔ جس کی میں نے عمر بھر آرزو کی تھی۔ عالیشان گھر' قیمتی کاریں اور نوٹوں سے ہمہ وقت بھرا رہنے والا والٹ' اب میں جو چاہتا وہ خرید سکتا تھا اور جیسے چاہتا روپے خرچ کر سکتا تھا۔ اگرچہ ابتدا میں اپنے اور مومنہ کے جوائنٹ اکاؤنٹ سے بڑی بڑی رقمیں نکالتے ہوئے مجھے تھوڑی سی ہچکچاہٹ بھی ہوتی تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی بازپرس نہ کرے مگر پھر جب میں نے دیکھا کہ میں اکاؤنٹ سے کتنی ہی بڑی رقم ۔۔۔ نکلواؤں وہ مجھ سے کچھ پوچھنا تو درکنار اس بارے میں کچھ کہتی تک نہیں تو میں بالکل بے دھڑک ہو کر رقمیں نکلوانے لگا اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنے لگا۔

شادی کے چند ماہ بعد ہی میں نے اپنی جاب یہ کہہ کر چھوڑ دی کہ میں اب اپنا کوئی بزنس کرنا چاہتا ہوں وہ تب بھی بالکل نارمل رہی۔ اس نے مجھے اس ضمن میں کوئی مشورہ دیا اور نہ ہی بزنس کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ بلکہ جب میں نے گتے کی ایک چلتی ہوئی چھوٹی سی فیکٹری خریدنے کی بات کی تو اس نے بلا جھجک مجھے میری مطلوبہ رقم فراہم کردی حالانکہ وہ اتنی خطیر رقم تھی کہ مومنہ سے اتنی رقم کا ذکر کرنے سے پہلے میں تین روز تک اپنے ذہن میں ان فقروں کو ترتیب دیتا رہا تھا جو مجھے مومنہ کے سامنے بول کر اپنی مطلوبہ رقم حاصل کرنا تھی مگر اس وقت میں صحیح معنوں میں شاکڈ رہ گیا جب اس نے میرے سرسری ذکر کرنے پر ہی مجھے اتنی بڑی رقم یوں تھمادی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اس کے اس عمل نے مجھے گویا اس کا گرویدہ کر کے رکھ دیا۔

وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میرا دل چاہنے لگا کہ اس کے دامن میں زمانے بھر کی خوشیاں بھر دوں۔ اور مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ خوش اس بات سے ہوتی ہے کہ میں اسے وقت دوں اور اس کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جاؤں اس لیے ان دنوں اپنے نئے نئے کام کی شدید مصروفیات کے باوجود میں اس کو پوری توجہ دینے کی کوشش کرتا تھا آخر وہ میرے لیے خزانے کی وہ کنجی تھی جس نے مجھ پر آسائشوں اور خوشیوں کے تمام تر دروازے کھول دیے تھے۔

بزنس شروع کرنے کے بعد بھی میں نے کئی بار اس سے بڑی بڑی رقوم کا مطالبہ کیا۔ جو اس نے ہر بار بلا جھجک پورا کردیا۔ میں چونکہ اس فیلڈ میں بالکل اناڑی تھا۔ اس لیے مجھے قدم جماتے جماتے ساڑھے تین سال لگ گئے درمیان میں کئی بار لڑکھڑایا کئی بار گرتے گرتے بچا مگر ساڑھے تین برس کے بعد میرا بزنس نا صرف جم گیا بلکہ روز افزوں ترقی بھی کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے ڈھائی سال کے بعد اللہ نے مجھے ایک صحت مند اور بے حد خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ جو ہو بہو تابش جیسا تھا۔ میرے لیے یہ معجزے سے بھی کچھ بڑھ کر تھا۔ یہ وہ خواب تھا جسے دیکھنے کی میں نے کبھی جرات ہی نہیں کی تھی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی ماں بن سکتی ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام عالیشان رکھا۔ میں اسے پاکر اس قدر خوش تھی کہ مجھے اپنی پچھلی زندگی کی کوئی محرومی بھولے سے بھی یاد نہیں آتی تھی۔ عالیشان کے آنے کے بعد تابش کے لیے میری محبت کچھ اور گہری ہوگئی تھی آخر یہ وہی تو تھا جس کی وجہ سے میری زندگی میں خوشیاں آئی تھیں اور میری ذات مکمل ہوئی تھی۔ میں پہلے سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھنے لگی تھی۔ ان دنوں میں جیسے کسی خواب نگری کا حصہ بن گئی تھی۔ مجھے میرے اللہ نے ہر چیز دے دی تھی۔ بے تحاشا دولت گھر شوہر اولاد آخر اس سے زیادہ کوئی اپنے لیے کیا چاہ سکتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے اپنی ہی خوش قسمتی خوفزدہ کردیتی۔ اور میں گھبرا سی جاتی۔ کہ کہیں میری خوشیوں بھری زندگی کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ہر لحاظ سے مکمل اور خوبصورت زندگی نے مجھے وہمی سا بنا دیا تھا۔ یا پھر شاید یہ میری چھٹی حس تھی جو آنے والے کسی منحوس لمحے کی آہٹ سن کر مجھے خبردار کر رہی تھی اس وہم کا شکار میں پہلی بار تب ہوئی جب عالیشان کی پیدائش کے تقریباً" ایک سال بعد مجھے تابش کے رویے میں تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ عجیب کھویا کھویا اور پریشان سا رہنے لگا تھا۔ راتوں کو بہت دیر سے گھر آتا اور اکثر آتے ہی سو جایا کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر اس نے جواب میں یوں چپ سادھے رکھی کہ میں خود ہی شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی اور خود کو طرح طرح کی تاویلوں سے بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس کے بزنس میں کوئی پرابلم ہوگا"

"اس کا اس وقت بات کرنے کا موڈ نہیں ہوگا"

"وہ کچھ وقت صرف اپنے ساتھ خاموشی سے گزارنا چاہتا ہوگا"

میں طرح طرح کے کھلونوں سے خود کو بہلاتی مگر تابش کی چپ نے مجھے اندر سے بے حد پریشان کردیا تھا۔ مجھے کسی پہلو قرار نہیں تھا خوف اندیشوں اور وسوسوں نے میری خواب نگری کو جیسے ویران کر کے رکھ دیا تھا۔ میں ایک بار پھر بے حد پریشان اداس اور تنہا ہوگئی تھی۔ مجھے بھری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا تھا جس سے میں اپنے اندر پلتے ان اندیشوں اور خوف کے بارے میں بات کر سکوں۔ بعض اوقات اپنی اس کمزوری پر مجھے خود پر حیرت بھی ہوتی۔ کیونکہ تابش کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرتے وقت میں نے اس امکان کو بھی ذہن میں رکھا تھا کہ اگر شادی کے چند سال بعد اس نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھام لیا تو کیا ہوگا۔ تب تو میرا یہی خیال تھا کہ میں اپنے اس پرانے انداز سے زندگی گزارنے لگوں گی جس انداز سے شادی سے پہلے گزرتی آئی تھی مگر اب میں ایسا سوچنے بھی لگتی تو میری سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ تابش کے ساتھ گزرے خوشیوں بھرے ساڑھے تین سال اتنے مکمل اور خوبصورت تھے کہ اب مجھے اپنی پچھلی زندگی میں جانے کا خیال بھی سزائے موت کے مترادف لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کے ساتھ میری زندگی کے ساڑھے تین سال انتہائی خوشگوار گزرے۔ ان ساڑھے تین سالوں نے مجھے بہت کچھ دیا۔ اپنا جما جمایا بزنس، معاشرے میں باعزت مقام اور سب سے بڑھ کر خود اعتمادی جس نے میری پرسنالٹی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ان سب کامیابیوں کے پیچھے ایک ہی نام تھا۔ ڈاکٹر مومنہ۔ ان ساڑھے تین سالوں میں اس نے میرا بے تحاشا خیال رکھا۔ اور کبھی بھی مجھ سے بحث یا بدتمیزی نہیں کی بلکہ اکثر تو میرے ساتھ اس کا رویہ اتنا عقیدت بھرا ہوتا کہ میں خود کو کوئی بہت برتر مخلوق سمجھنے پر مجبور ہوجاتا۔ اس کا یہ عقیدت بھرا انداز مجھے بے حد اچھا لگتا تھا۔ اس کی نرم مزاجی، حد سے زیادہ خیال رکھنے والی عادت اور پھر ہمارا بیٹا عالیشان تابش، یہ سب چیزیں شاید عمر بھر کے لیے مجھے اس سے باندھ دیتیں اگر بیچ میں ملیحہ رفیق نہ آجاتی۔

ملیحہ میرے بزنس پارٹنر تنویر کی کزن تھی اور زرعی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہی تھی اس سے میری ملاقات اتفاقاً" ہی ہوئی تھی میں اس روز تنویر اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بزنس لنچ کے لیے کینال روڈ پر عثمانیہ ہوٹل میں گیا ہوا تھا۔ وہیں ملیحہ بھی اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ موجود تھی۔ میں اور تنویر ساتھ ہی ہوٹل میں گئے تھے اس لیے ملیحہ کو دیکھ کر تنویر علیک سلیک کے لیے رکا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا اور تنویر نے ہی ملیحہ کے ساتھ میرا تعارف کروایا تھا۔ میں اس گلابی رنگت اور جادو بھری آنکھوں والی بے حد حسین لڑکی کو دیکھ کر مبہوت سا ہوگیا۔ وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین اور بولڈ بھی تھی یہ اندازہ مجھے اس سے چند منٹ گفتگو کر کے ہی ہوگیا تھا۔

وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی مگر ایسا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس سے پہلی ملاقات نے ہی مجھ پر جادو کردیا ہو بلکہ میں تو اسے شام تک بھول بھی چکا تھا۔ مگر اسی رات جب اس نے مجھے میرے سیل پر فون کیا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ میرے اندازے اور توقع سے بڑھ کر بولڈ لڑکی تھی اس نے نہ صرف ملاقات کے پہلے ہی روز مجھے فون کردیا تھا بلکہ اسی روز میرے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کردیا تھا۔ اور میرے لیے اس کی پسندیدگی میں یہ جان کر بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ میں شادی شدہ اور ایک بیٹے کا باپ ہوں۔ وہ ہنوز بے حد والہانہ بلکہ محبوبانہ انداز سے مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ میں نے اپنی پچھلی زندگی میں کبھی کوئی اتنی فرینک نیچر کی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اور یہ شاید اس کا اس قدر فرینک اور بولڈ ہونا ہی تھا جو مجھے دنوں میں اس کے اتنا نزدیک لے گیا کہ میں خود حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ یکایک ہی مجھے ساری دنیا سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ میں اور وہ ہر روز ملنے لگے تھے اس کی کمپنی اس کی باتیں اس قدر دلچسپ ہوا کرتی تھیں کہ اس کی قربت میں

میں دنیا کی ہر چیز کو بھول جایا کرتا تھا۔ ان دنوں مجھے ہمہ وقت اس کا خیال رہنے لگا تھا۔ یہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کسی لڑکی سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ تب سے صرف اور صرف دولت آرام آسائشات سے ہی محبت کرتا آیا تھا۔ مگر اب ایک لڑکی میری زندگی میں آچکی تھی اور میں اس پر جی بھر کر دولت اور محبت لٹا رہا تھا۔ ان دنوں میرا اپنے گھر سے دل بالکل اچاٹ ہو گیا تھا اور میں وہاں صرف سونے کے لیے جایا کرتا تھا۔

میں رات گئے گھر لوٹتا تو مومنہ اکثر میرے انتظار میں جاگ رہی ہوتی مگر میں اسے مخاطب تک نہیں کرتا تھا۔ ان دنوں مجھے مومنہ سے شدید قسم کی بے زاری محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے جتنے بھی جتن کرتی اتنی ہی میری بے زاری بڑھتی جاتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے دھواں بنا کر اڑا دوں وہ میری زندگی میں کہیں نہ ہو۔ اور ایسی خواہش کرتے ہوئے میں یہ بات بالکل بھول جایا کرتا تھا کہ یہ وہی مومنہ تھی جس سے شادی کرنے کے لیے چار برس پہلے میں مرا جا رہا تھا اور آج میں جو کچھ بھی تھا اس کی وجہ سے تھا۔ میری خود غرضی نے میری آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دی تھی کہ مجھے اپنی ذات اور اپنی خوشیوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ مومنہ میرے اس بدلے ہوئے رویے کی وجہ سے پریشان ضرور تھی مگر اس نے ایک بار بھی مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں ایک عجیب سا خوف تھا جو اس کی آنکھوں میں مستقل ٹھہر کر رہ گیا تھا مگر مجھے اس کے خوف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ مومنہ تو ایک طرف ان دنوں تو مجھے اپنے اکلوتے بیٹے میں بھی کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ در حقیقت مجھے ملیحہ کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بزنس سے بھی میری توجہ ہٹ چکی تھی اور ادھر سے بھی مجھے نقصان پر نقصان ہو رہا تھا مگر مجھے ملیحہ کے سوا کسی بھی بارے میں سوچنے کا ہوش نہیں تھا۔

میں شدید قسم کے ادھیڑبن میں مصروف تھا مجھے کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا جس کے ذریعے میں مومنہ کو اپنی زندگی سے غائب کر کے اس کی جگہ ملیحہ کو دے دوں۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں کئی بار کوشش کرنے کے باوجود مومنہ کو ملیحہ کے بارے میں نہیں بتا سکا تھا۔ مگر پھر جب ایک روز ملیحہ نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے گھر والے اس کی کہیں اور منگنی کر رہے ہیں تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور میں نے ہر لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مومنہ کو اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کا اعلان کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"میں تم سے تنگ آگیا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں ملیحہ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آخر تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔" اس کے لہجے میں بے زاری، نفرت، غصہ، ہر وہ چیز تھی جس کے اندیشوں نے میری کئی راتوں سے نیند اڑائی ہوئی تھی۔ اس کے انداز میں میرے لیے بیگانگی اور ——— آئے ہوئے تو بہت دن ہو چکے تھے۔ مگر میں پھر بھی اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلاتی رہی تھی کہ شاید سب کچھ ٹھیک ہو جائے شاید ایک بار پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ مگر آج میری خوش گمانیوں کے تمام محل ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے مسمار ہو رہے تھے۔ فیصلے کی گھڑی آچکی تھی۔ اور میں کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ بس آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لیے بے بسی سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے سننے کے باوجود میری سماعتیں سمجھنے سے انکاری تھیں۔ گو کہ تابش کے بدلے ہوئے رویے سے میں کئی روز سے بہت پریشان تھی۔ اور یہ دھچکا شدید ہونے کے باوجود میرے لیے اچانک نہیں تھا مگر پھر بھی میں خود کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ تابش میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر تھا وہ چلا جاتا تو میری تو زندگی ہی ختم ہو جاتی۔ عجیب سا خالی پن تھا جو میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اور میں چاہنے کے باوجود کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔ بس ٹکر ٹکر اس کا

خوبصورت چہرہ دیکھے جا رہی تھی جس پر اس وقت میرے لیے کسی بھی قسم کی اپنائیت نہیں تھی۔

"میں یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں" پہلے سے بھی بڑھ کر بے زاری ——— لہجے میں سمو کر وہ بولا تو میں جیسے چونک کر حواسوں میں آگئی۔ وہ اب کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا میں دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگی۔

"تابش! تابش پلیز رک جاؤ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ" میں بلند آواز سے روتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی مگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا اور اپنا پاؤں پہلی سیڑھی پر رکھ دیا۔

"تابش! تم چلے گئے تو میں زندہ کیسے رہوں گی میں مر جاؤں گی تابش!"

میں نے بے اختیار ہی اس کی قمیض کا کالر پیچھے سے پکڑ کر اسے روکنا چاہا تھا۔

"تو مر جاؤ تم میں کیا کروں"

وہ جھنجلا کر مڑا اور ایک جھٹکے سے اپنا کالر چھڑا کر اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ مگر میں اس اچانک جھٹکے سے سنبھل نہ پائی اور سیڑھیوں پر لڑھکتی چلی گئی۔

"مومنہ" وہ بے اختیار چیخا تھا میری آنکھوں کے آگے گہرا سیاہ اندھیرا چھا رہا تھا جب میں نے اسے دیوانہ وار بھاگ کر اپنی طرف آتے دیکھا مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں ہر احساس سے عاری ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں تیسری سیڑھی پر تھا جب میں نے اسے سیڑھیوں پر سے تیزی سے لڑھکتے دیکھا۔ ایک پل کے لیے تو میرے اعصاب سن ہو کر رہ گئے اپنی شرٹ کا کالر اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے میں دھیان ہی نہیں کر سکا تھا کہ وہ سیڑھیوں کے کنارے پر کھڑی ہے اور یوں اچانک لگنے والے جھٹکے کے بعد اس کے لیے توازن برقرار رکھنا ناممکن حد تک مشکل ہے۔

"مومنہ!" میں نے خود کو چیختے سنا اور تیزی سے اس کی

طرف لپکا وہ تب تک بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہی اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگا اس وقت میرے اعصاب مکمل طور پر جواب دے چکے تھے اور مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ تو ملازموں نے اسے خون میں لت پت دیکھ کر فوراً" ہسپتال پہنچایا ورنہ میں تو شاید وہیں اس کا سر گود میں رکھے چلاتا رہتا۔

اسے فوراً" آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تھا اس کے سر پر بہت گہری چوٹ آئی تھی۔ آپریشن کرنے سے پہلے ڈاکٹر نے مجھ سے فارم پر سائن کروائے تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا مجھے ایک پل کے لیے یوں لگا کہ جیسے میں نے مومنہ کے ڈیتھ وارنٹ پر سائن کر دیے ہوں۔

"ڈاکٹر صاحب! وہ بچ تو جائے گی نا"

ڈاکٹر مرتضیٰ کا ہاتھ پکڑ کر میں نے بہت بے چارگی سے پوچھا تھا انہوں نے میرے کندھے پر تسلی آمیز انداز میں تھپکی دی اور بولے۔

"آپ دعا کریں تابش صاحب! دعا میں بہت تاثیر ہوتی ہے۔" مجھے دلاسا دے کر وہ آپریشن تھیٹر کی طرف مڑ گئے اور میں سن سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے مجھے واضح طور پر کچھ نہیں کہا تھا مگر ان لوگوں کی آپس کی سرگوشیوں اور وہاں کے حالات سے مجھے خود ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر مومنہ کی زندگی کے لیے زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ مجھے اپنا دل سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور میں لڑکھڑا کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کا آپریشن پورے ڈھائی گھنٹے چلا تھا اور وہ ڈھائی گھنٹے میں نے آپریشن تھیٹر کے باہر کاریڈور میں ٹہل ٹہل کر کس طرح گزارے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم سے دھیرے دھیرے جان نکل رہی ہو میرے اندر اتنی گھٹن تھی کہ مجھے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے مومنہ کے سوا ایک پل کے لیے بھی کسی کا خیال نہیں آیا تھا نہ مجھے ملیحہ رفیق یاد آئی نہ اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف میرا دھیان گیا اور نہ ہی مجھے کروڑوں روپے کی جائیداد کا خیال آیا جس کی مومنہ مالک تھی اور اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو اس جائیداد کا بڑا حصہ مجھے ہی ملنا تھا میں جو ساری زندگی دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا آیا تھا اب میرے لیے کروڑوں کی جائیداد بھی بے معنی تھی۔ اس وقت مجھے صرف مومنہ چاہیے تھی اس کا ساتھ چاہیے تھا میں بچوں کی طرح بلک بلک کر اللہ سے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

انہی ڈھائی گھنٹوں میں مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ میں تو مومنہ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں اتنی محبت کہ اگر اسے میری زندگی سے نکال دیا جائے تو میرے پاس تو کچھ بچے گا ہی نہیں میں تو خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ میں نے اس سے شادی صرف اور صرف دولت اور آسائشوں کے حصول کے لیے کی تھی اور میرے گمان میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں ایک دن اس کی محبت میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ مگر اب ایسا ہو چکا تھا اور یہ محبت مجھے اس کی کسی کوالٹی کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اس لیے کہ اس کی بدولت میں نے زندگی میں پہلی بار ان آسائشوں کو حاصل کیا تھا۔ جن کے لیے میں ہمیشہ سے ترستا آیا تھا۔ مجھے تو اس محبت سے محبت ہوئی تھی جو وہ مجھ سے کرتی تھی۔ بغیر کچھ کہے بغیر کچھ جتائے بالکل خاموش اور بے غرضی سے۔ میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی کا بھی وہ اپنی جان سے بڑھ کر خیال رکھتی رہی تھی۔ اور جواب میں اس نے کبھی کوئی صلہ نہیں مانگا میری توجہ اسے خوش کرتی تھی مگر اس نے کبھی زبردستی میری توجہ بھی حاصل نہیں کی تھی بلکہ میں خود اس کو جتنی بھی توجہ دے دیا کرتا وہ اس پر قانع اور خوش رہتی تھی۔

ان ڈھائی گھنٹوں میں مجھے رہ رہ کر اس کی وہ بے تحاشا محبت یاد آتی رہی جو پچھلے ساڑھے تین سالوں میں بارش کی طرح مجھ پر برسی تھی۔ میں اس کا محنت سے کمایا ہوا روپیہ پانی کی طرح بہاتا رہا تھا مگر اس نے ایک بار بھی زبان تو کیا اپنے کسی عمل سے بھی یہ بات نہیں جتائی تھی۔ نہ ہی اس نے کسی بھی موقع پر خود کو مجھ سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ڈاکٹر مومنہ کی حالت اب خطرے سے باہر ہے تابش صاحب! آپ چھ گھنٹے بعد ان سے مل سکتے ہیں"

میں اپنے سود و زیاں کے حساب میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ مجھے ڈاکٹر مرتضیٰ کے باہر آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی اور جب انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے یہ مژدہ جانفزا سنایا تو میں چند لمحوں کے لیے حیرت اور بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا جو کامیابی کی خوشی سے دمک رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں جہاں کھڑا تھا وہیں سجدہ ریز ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ان سارے واقعات کو اب آٹھ برس گزر چکے ہیں اور میں اب دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں ہوں میرا گھر خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ ہے۔ تابش واقعی مجھ سے دل سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی محبت کی تابناکی نے میری پوری زندگی کو روشن کر دیا ہے۔ اس کی اپنائیت اور توجہ نے میرے چہرے کو ایسی چمک بخش دی ہے کہ میری بہنیں اور بھابی رشک سے میرا چہرہ دیکھتی ہیں اور میری کولیگز ہنس کر کہتی ہیں۔

"یہ تو سنا تھا کہ وقت کچھ لوگوں پر ٹھہر جاتا ہے۔ مگر وقت کا پہیہ الٹی طرف بھی چلتا ہے ایسا ہوتے صرف تمہارے ساتھ ہی دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر گزرتا سال تمہارے چہرے پر کوئی نقش چھوڑنے کی بجائے کسی نقش کو مٹا کر جاتا ہے۔"

ایسی باتیں سن کر میرا دل خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے مگر میں اپنے اندر تفاخر نہیں پیدا ہونے دیتی بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر عاجزی اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

تابش کا کاروبار اب بہت پھیل چکا ہے اور وہ مجھ سے بھی زیادہ کمانے لگا ہے۔ مگر اب اس میں بہت سی مثبت تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ وہ بہت نرم مزاج ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں ایک عجیب سی انکساری پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ ہر ویک اینڈ بہت خوشی سے اپنی خالہ کے گھر گزارتا ہے۔ ورنہ پہلے وہ مارے باندھے ہی وہاں جایا کرتا تھا میرے اور اس کے بیچ محبت کے ساتھ دوستی کا رشتہ بھی پیدا ہو چکا ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ کبھی کبھار وہ مجھے چھیڑنے کے لیے کہتا ہے۔

"مومی! تمہیں پتا ہے میں نے تم سے شادی صرف تمہاری دولت کے لیے کی تھی"

تب میں ہنس کر کہتی ہوں۔

"جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں دوبارہ موقع دیا جائے تو تم محبت کی وجہ سے مجھ سے شادی کرو گے"

اور ہر بار وہ مسکرا کر میری تائید کرتا ہے۔

☼ ☼

سدرۃ المنتہیٰ

فون کی بیل متواتر بج رہی تھی، وہ کچن سے نکل کر اردگرد نظر دوڑاتے فون اسٹینڈ کی جانب بڑھی اور ریسیور اٹھایا۔

"کیا ہے ؟اس نمبر پر کیوں فون کیا ہے۔" آواز دبی دبی سی تھی۔

"تم نے سیل فون بند رکھا ہے۔۔۔ مجبوراً" اس پر کرنا پڑا۔" دوسری طرف بے چارگی سے وضاحت ہوئی۔

"کچھ سمجھ نہیں آرہا کیا کروں۔۔۔" ادھر اس سے زیادہ بے چارگی کا عالم تھا۔

"سوچ لو۔۔۔ میں نہیں چاہتا تم کبھی پچھتاؤ۔۔۔ فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا میری فکر چھوڑ دو مجھے بھول سکتی ہو تو۔" بات ادھوری چھوڑی گئی۔

"مجھے وقت دو عمران سوچنے کے لیے۔" وہ دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہیں کوئی دیکھ نہ لے مخصوصاً" صنوبر۔

"کتنا وقت دوں۔۔۔ پتا بھی ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ تم کل مایوں بیٹھ رہی ہو اس کے بعد کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ پر۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتی اور۔" لمبی سانس بھر کے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جو فیصلہ کرنا ہے آج رات کرنا ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔۔۔ پھر مجھے بتانا۔ آج رات تمہارا جواب رات بارہ بجے تک جو ہوگا وہ آخری ہوگا۔ ہاں یا نہ۔"

"اگر نہ ہوا تو؟" وہ اسے آزمانا چاہتی تھی۔

"تو میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں گا، اور پھر کسی موڑ پر تمہاری زندگی میں نہیں جھانکوں گا۔۔۔ تم ٹینشن فری رہنا۔۔۔ اگر تم دوسری زندگی سچائی سے شروع کرنا چاہو تو میں تمہیں کبھی پریشان نہیں کروں گا۔" لہجے میں نرمی تھی سچائی تھی دکھ تھا۔

وہ پگھل سی گئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے عمران۔۔۔ میں تمہارے بغیر کسی اور کے ساتھ۔۔۔ نہیں یہ دھوکا ہوگا اپنے، تمہارے اور تیسرے بندے کے ساتھ بھی۔"

"میں چاہتا ہوں جو بھی فیصلہ تم کرو۔ اس پر خوش رہو۔ ہر طرح سے دیکھ لو۔ سوچ لو، میں تمہیں مجبور کرنا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ابھی شام کے چھ بج رہے ہیں۔ میں رات بارہ بجے تمہیں جواب دوں گی آخری جواب۔۔۔"

"میں انتظار کروں گا۔" عجیب بے قراری تھی اس کے لہجے میں۔

"اب رکھتی ہوں۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔"

"تم بھی رکھنا۔۔۔"

فون رکھ کر وہ کمرے میں آگئی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اندر دھکیلا۔ صنوبر اسے دیکھ کر رکی۔

"مجھے پتا ہے تم اس سے فون پر بات کر رہی تھیں۔" وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے پتا ہے اسی کا فون تھا اسی لیے میں باہر نہیں آئی، پتا تھا تم اٹھالو گی۔۔۔ پر بے فکر رہو میں نے سنا

نہیں۔ تم نے کیا بات کی پر اتنا اندازہ ہے تم نے اسے بتا دیا ہوگا اپنے فیصلے کے بارے میں اور اسے سمجھا دیا ہو تاکہ آئندہ تمہیں تنگ نہ کرے۔"

"اپنے نہیں گھر والوں کے فیصلے کے بارے میں اور اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کبھی جان بوجھ کر مجھے تنگ نہیں کیا۔"

"جانتی ہوں۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں اب بھی تنگ نہیں کرے گا۔" وہ اس کا دل رکھ رہی تھی۔

اسے ہنسی آگئی۔

"ہاں۔۔۔ جانتی ہو تم۔۔۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔۔۔ جبھی اس کے ساتھ یہ سلوک کیا۔" اس کے لہجے میں طنز بھی تھا اور دکھ بھی۔

"مجھے افسوس ہے منیعہ۔" وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی تھی اس کا ہاتھ تھام کر۔

"تمہیں صرف افسوس ہے۔ میری پوری زندگی داؤ پر لگ گئی۔" اس نے ہاتھ چھڑایا لہجہ وہی تھا۔

"ایسا نہیں ہے سنبعہ..... پر اماں ابا بھی تمہارے لیے برا نہیں سوچ سکتے۔ مانتی ہوں عمران زیادہ اچھا ہے۔ پر وہ بھی اچھا ہے جسے اماں ابا نے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔"

"عمران میں کیا برائی تھی صنوبر..... وہ خوب صورت ہے' پڑھا لکھا ہے' عزت دار ہے' پیسہ ہے اس کے پاس..... برائی صرف یہ تھی کہ میں نے خود اسے پسند کیا تھا.....؟" اس کے آنسو اب بھی رکے نہ تھے۔

"نہیں سنی بات یہ نہیں..... بات ہے عزت کی وہ تمہیں عزت کے ساتھ بیاہ کر لے جاتا؟"

"وہ مجھے عزت کے ساتھ ہی لے جانا چاہ رہا تھا۔ عزت کا مطلب اگر نکاح نہیں ہے اور یہ ہے کہ پورا گھر ساتھ آجائے۔ تو یہ غلط ہے۔ نکاح ایک کے ساتھ ہوتا ہے پورے گھر کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ماں باپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے پاس آرہا تھا۔ اس نے ہر شرط مان لی پھر بھی' پھر بھی میرے ماں باپ کو میری خوشیوں کا کوئی خیال نہ آیا۔ اپنی جھوٹی انا کے لیے سب کچھ ختم کر دیا۔"

"میں سمجھتی ہوں سنی۔ پر اب تو تمہیں خوش رہنا پڑے گا۔ کل تمہارا مایوں ہے ساتھ میں نکاح دو دن بعد تمہاری رخصتی ہے۔ اب وقت نہیں ہے۔ ایسی باتوں کے لیے۔" وہ اسے ہر حال میں تیار کرنا چاہتی تھی۔

"میں خوش نہیں رہ سکتی اس کے ساتھ' جس کے ساتھ زبردستی باندھ رہے ہیں....."

"تو چلو صبر ہی کرلو۔"

"وہی کر رہی ہوں۔ اب تک وہی کیا ہے۔"

"میں دعا کروں گی تمہارے لیے۔" صنوبر نے اسے ساتھ لگالیا۔

"مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔" وہ سہولت سے الگ ہوئی۔

"تمہیں دعا سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟" اسے تعجب ہوا۔

"مجھے اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ جیسے پتھر تھی۔

"میری بات مانو پلیز..... " وہ التجا کرنے لگی۔ "اپنے آپ کو سنبھالو سنی۔"

"تمہاری بات ہمیشہ مانی ہے..... تم نے کہا اس سے فون پر بات کرنا چھوڑ دو' میں نے چھوڑ دی تم نے کہا ملنا چھوڑ دو' میں نے چھوڑ دیا تم نے کہا اسے کہو رشتہ لے کر آئے۔ وہ آیا تم نے کہا وہ تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ دے۔ اس نے چھوڑ دیا۔ پھر بھی تمہیں اس کی محبت کا یقین نہ آیا..... عجیب لڑکی ہو تم عجیب بہن ہو..... جسے بہن کی خوشیوں کی پروا نہیں ہے۔"

"یقین کرو سنی۔ کبھی تمہارے لیے برا نہیں چاہا..... جو کہا تمہارے بھلے کے لیے کہا سب کی خوشی میں تمہارا اپنا فائدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے مان لیا۔ لیکن میری خوشی وہ کہاں ہیں..... بتاؤ۔"

تم ماں باپ کی خوشی کا خیال رکھ لو' اللہ تمہارے نصیب میں خوشی لکھ دے گا۔"

"بہلاؤ مت مجھے صنوبر۔" وہ بے زاری سے اٹھی۔ اسے مزید بحث کا کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"سمجھا رہی ہوں..... دیکھو وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اپنے ماں باپ کے فیصلے کو مان لو۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ کیا کر رہی ہوں اب..... مان تو لیا ہے۔"

"تسلیم نہیں کیا تم نے یہ فیصلہ....." وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

"وقت سب کچھ منوا لیتا ہو" وہ اسے بہلانا چاہ رہی تھی۔

"وقت نہیں ضد اور انا کہو۔ زبردستی کہو یاد رکھو صنوبر ہم کسی کو قید کریں تو وہ مجبوری میں چپ تو ضرور ہو گا پر خوش نہیں ہو گا۔"

"نہیں سمجھتی ہوں سنبعہ پر۔"

"تم کچھ نہیں سمجھتیں..... بہتر ہے کہ اب اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرو۔" وہ کاٹ دار انداز میں

کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"چلو چلو نہیں کرتے....." صنوبر نے افسوس سے اسے جاتا دیکھا۔ وہ دونوں طرف سے مجبور تھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اس کے کپڑے رکھ دیے پریس کر کے....." اماں ابھی اندر آئی تھیں۔ اسے مصروف دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"ہاں کر دیے....." وہ سنبعہ کی طرف دیکھ کر باہر نکل گئی۔

"تم نے دیکھا اس کا موڈ اور رویہ..... اس کا ابا بہت غصہ کر رہا ہے اسے سمجھاؤ اپنے رویے کو درست کرلے..... نکاح کے وقت کوئی گڑبڑ ہوئی تو اچھا نہیں ہو گا۔ تمہارا ابا تو طوفان کھڑا کرے گا۔ وہ دروازے کے پاس ہو کر صنوبر کو سمجھانے لگیں۔

"کچھ نہیں ہو گا..... بے چاری چپ تو ہے اماں..... وقت کے ساتھ ساتھ رویہ درست ہو جائے گا۔" صنوبر لاپروائی دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"ارے اس کا یہ حال اس کے سسرالیوں نے دیکھ لیا تو باتیں کریں گے۔ تم اس کا حلیہ تو ٹھیک کرو۔"

"اچھا کرتی ہوں کچھ۔ آپ جائیں باقی کام دیکھ لیں۔ میں سمجھا لوں گی اسے آپ بھی اتنی جلد بازی سے کام نہ لیں۔ کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ مان تو گئی ہے..... اب کیا کرے اور۔"

"ارے مان گئی ہے تو خوش بھی رہے منہ سجا رکھا ہے۔ حد ہے بھئی' ہمارے زمانے میں تو لڑکی اف تک نہ کرتی تھی جو ماں باپ نے کیا سوچ سمجھ کر کیا۔ اس نے تو سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔

وہ اندر بیٹھی اپنی ماں بہن کی گفتگو سن کر دکھی ہو گئی۔ ایک ہی احساس تھا کہ اس کی قربانی کا کوئی خیال نہیں کسی کو احساس نہیں ہے۔ اسے اپنی ماں کی سوچ پر سب سے زیادہ دکھ تھا۔ وہ سوچتی رہی پر اب سوچنے کے لیے باقی کیا بچا تھا۔

☼ ☼ ☼

صنوبر سو چکی تھی اور وہ کسی روبوٹ کی طرح بیٹھی تھی۔ بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے..... اسے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کرنے کے لیے بیس منٹ ملے تھے..... جو فیصلہ اس سے سالوں میں نہ ہو سکا..... وہ بیس منٹ کے اندر اندر کیسے کرے گی۔

"ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جس سے ہمارے ماں باپ کی عزت پر حرف آئے یا پھر ہمارا اعتبار ان کے دلوں سے اٹھ جائے..... اپنا اور میرا سوچنا۔" صنوبر کی ہدایتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

"کسی کا مت سوچو اپنا سوچو..... صرف اپنا' جس میں تمہاری خوشی ہو..... زندگی تمہاری ہے تمہیں گزارنی ہے۔" دل اس وقت یہی جواب دے رہا تھا۔

"چلو بھاگ چلیں..... " عمران کی کبھی مذاق میں کہی گئی بات یاد آئی۔

"اچھے گھر کی لڑکیاں ہی بھاگتی ہیں..... جنہیں حق نہیں ملتا..... چور مجبور ہو کر چوری کرتا ہے۔" عمران کے لفظ اسے یاد تھے۔

"پر میں تمہیں نہیں بھگاؤں گا بے فکر رہو..... میں اپنے ماں باپ کو تمہارے پاس لاؤں گا' ہر حال میں۔"

اسے پتا تھا عمران نے بہت کوشش کی تھی اپنے ماں باپ کو منانے کی' پر وہ اپنی حیثیت سے نیچے معیار پر رشتہ کرنے کے لیے رضامند نہ تھے۔ پھر وہ روٹھ کر آ گیا اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ لیکن بدلے میں اسے کیا ملا یہاں سے' ذلت' پھٹکار' بے عزتی۔ کس طرح اس کے باپ نے بے عزت کر کے دھتکارا تھا عمران کو اسے یاد تھا۔

شرط بظاہر یہ تھی کہ اس کے ماں باپ عزت کے ساتھ رشتہ لے کر آئیں پر اسے اپنے باپ کی ذہنیت کا

پتا تھا۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اس کی بیٹی کی شادی اپنی پسند سے ہو۔

اس کے بعد اس نے عمران سے بات کرنا چھوڑ دی ' اس کو فون کرنا چھوڑا وہ واقعی اسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی اگر گھر والے اسے وقت دے دیتے انہوں نے زبردستی کر کے فوری طور پر منگنی کرا دی۔ ہفتے کے اندر نکاح طے کر دیا۔ اسے نہ سنبھلنے کا موقع دیا گیا نہ ہی سمجھنے کا۔" اوپر سے پریشر۔ اسے اپنے ماں باپ کی بے صبری پر بے انتہا دکھ تھا۔

وہ کیا کہتی چپ تھی پر سوچ تو سکتی تھی۔ کل اس شخص کے گھر میں بھی اسے ہر حال میں گزارا کرنا ہے ۔۔۔ کسی بھی خراب صورت حال میں اس کو قصوروار ٹھہرایا جائے گا ماں باپ بھی اسے ہی برا بھلا کہیں گے۔

وہ دل برداشتہ سی ہو گئی تھی ۔۔۔ اس کا دل چاہ رہا تھا خود کو ہی ختم کر لے۔ گھڑی بارہ بجا رہی تھی اسے آخری جواب لکھنا تھا۔

اب اس کے پاس اک لمحہ تک نہ تھا۔ ایک لمحے میں اس نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جاگ رہے ہو عمران ۔۔۔" ممی کمرے میں آ کر پوچھنے لگیں۔

"جی ۔۔۔" وہ کھویا کھویا سا بولا۔

" جاؤ ۔۔۔ صبح اپنے پاپا کے ساتھ آفس بھی جانا ہے ' اور ہاں ملازم دودھ رکھ گیا ہے پی لینا سونے سے پہلے" وہ جاتے جاتے ہدایت دینا نہ بھولیں۔

"جی بہتر ۔۔۔" وہ اتنا کہہ سکا۔ جبکہ کہنا چاہا تھا کہ یہ کیسی فکر ہے کہ خوشی بھی اپنی مرضی کی دی جائے اولاد کو۔" وہ تلخی سے لب کاٹ کر سوچتا رہا۔

"تمہارا باپ اکیلا بزنس سنبھالتا ہے ۔۔۔ تم بڑے ہو جاؤ تو ان کا ہاتھ بٹانا۔" ممی کی کبھی بہت پہلے کی کہی گئی بات یاد آئی۔

"تم اپنے باپ کا واحد سہارا ہو ۔۔۔ اکلوتی اولاد ۔۔۔ ہم تمہاری شادی بہت سوچ سمجھ کر کریں گے۔ تمہارے لیے اپنے سرکل سے لڑکی لائیں گے۔"

"مجھے نہیں چاہیے پیسہ ' مجھے بس خوشی چاہیے دل کی ۔۔۔ آپ کو کیا پتا ممی ۔۔۔ کاش آپ سمجھ سکتیں ۔۔۔ کاش آپ لوگ میری خوشی کے لیے مان جاتے تو آج مجھے ایک شریف لڑکی کو گھر سے بھگانا نہ پڑتا۔"

"عمران ضد چھوڑ دو ۔۔۔ تم گئے تو تمہارے پاپا تمہیں جائیداد سے عاق کر دیں گے ۔۔۔ اپنے فیوچر کا سوچو ۔۔۔ چھوڑو فضول کی ضد باز آ جاؤ۔" یہ اس کی ماں تھی۔ اسے بے حد دکھ ہوا۔

"دولت ۔۔۔ یا محبت ؟" سوال مشکل تھا۔ محبت ہمیشہ بازی لے جاتی ہے ہر جذبے پر ۔۔۔ ہر احساس پر اس نے بھی محبت کا انتخاب کیا تھا۔

"میں اسے کچھ نہ دے سکوں گا ۔۔۔ سوائے محبت کے ۔۔۔ میں یہ سب چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پھر مجھے اس کے لیے محنت کرنی ہو گی ۔۔۔ کمانا ہو گا ۔۔۔ دھکے کھانے ہوں گے پر خوش رہوں گا ہاں میں اس کے ساتھ ہر حال میں خوش رہ سکتا ہوں ۔۔۔ ہر حال میں۔"

بارہ بج چکے تھے ۔۔۔ اس نے سیل اٹھایا۔ ٹیکسٹ لکھا ' مجھے تمہارے فیصلے کا انتظار ہے۔

فیصلے کا کڑا مرحلہ اس پر ڈال کر اب وہ منتظر تھا۔

"اپنی ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پیچھے آ رہی ہوں ۔۔۔" ٹیکسٹ آ گیا تھا۔

"بھروسہ رکھنا میں بھی سب ٹھکرا کر چلا ہوں۔"

اس نے جواب لمحے کی دیر کیے بغیر ٹائپ کیا۔

"میں تمہیں خوش رکھوں گا۔ ہر حال میں۔"

"میں تمہارے ساتھ خوش رہوں گی۔ ہر حال میں۔"

"گھر سے کچھ نہ لینا زیور اپنی بہن کے لیے رکھنا۔ میرے پاس کچھ رقم ہے۔"

"خالی ہاتھ آؤں گی۔"

"مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے سنیعہ ۔۔۔ خوش ہو نا؟"

"ہاں ۔۔۔"

"تو پھر سو جاؤ ابھی ۔۔۔ ٹھیک دو بجے میں تمہیں فون کروں گا نکل آنا۔"

"ٹھیک دو بجے ۔۔۔" ریلائی فاسٹ تھا۔

اس نے لمبی سانس لے کر دو بجے کا الارم سیٹ کیا اور لیٹ گیا فیصلہ ہو چکا تھا اب مزید سوچنا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے تھے۔ سیل فون اس کے سرہانے رکھا تھا۔ جسے ٹھیک دو بجے بجنا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات نے دو بجا دیے تھے ' وال کلاک کی گھنٹی بجی ' سیل فون نے الارم بجایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی ' سیل کا الارم بند کیا ' بیڈ سے نیچے اتری ' چھوٹا سا سفری بیگ اٹھایا ' اسے ٹیکسٹ لکھا اور احتیاط سے نظر بچا کر باہر نکل آئی۔

نکلتے وقت وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہ رہی تھی نہ ہی اس نے آخری بار کسی کو جی بھر کے دیکھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی یہ خواہش پوری نہ کر سکی ' اس وہم میں کہ کہیں پھر کوئی سوچ ' چہرہ ۔۔۔ بات جملہ ' خیال اس کے قدم نہ روک دے۔

وہ آخری نظر گھر کے سفید گیٹ پر ڈال کر چہرہ ڈھانپے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گلی سے نکلی تھی مین روڈ پر ہی اسے عمران کی گاڑی نظر آئی تھی ' وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے روک رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی سے نیچے اترا ' دروازہ کھولا اس کے لیے ۔۔۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ مطمئن سا ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

پورے سفر میں چند رسمی جملوں کے علاوہ ان کی کوئی بات نہ ہوئی تھی دونوں پراسرار سی خاموشی میں گھرے تھے۔

جیسے ابھی کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ اسے کہاں لے کر جا رہا ہے ' پر پوچھ نہ سکی۔ وہ اسے بتانا چاہ رہا تھا پر بتا نہیں پا رہا تھا۔

چار گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد گاڑی کسی بوسیدہ گھر کے سامنے رکی تھی۔ وہ اپنے شہر سے باہر کسی دور دراز علاقے میں تھے۔

عمران نے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ بغیر اک لفظ کہے اس کے ساتھ اس بوسیدہ چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئی جہاں چند لوگ پہلے سے موجود تھے۔

وہ نہیں جانتی تھی یہ کون لوگ ہیں۔

عمران نے اسے کمرے میں جانے کا کہا تھا ۔۔۔ پھر ایک گھنٹے میں ' وہ گواہوں اور مولوی کے ساتھ اندر آیا تھا ۔۔۔ اسی وقت ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں عمران ان لوگوں کو گیٹ تک چھوڑ کر اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا اور ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے لگے تھے دونوں۔

نکاح کے فوراً بعد اس کے دل کو اطمینان سا ہو گیا تھا۔ یہ اس کی نئی زندگی کی شروعات تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت پر لگا کر اڑا تھا ' پہلے پہل زندگی بہت مشکل تھی ' پر ایک عزم تھا دونوں اک دوسرے کو محبت کا دلاسا دے کر بہتری کی امید پر بڑی سے بڑی مشکل حل کر لیتے تھے۔

پر اب جیسے لگتا تھا انتظار زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔ دو بچوں کے بعد زندگی محبت کے سراب سے نکل کر حقیقت میں آ گئی تھی۔ اب محبت کا راگ الاپنے کا وقت تھا نہ ہی موڈ ' دو بچے ۔۔۔ مسائل غربت ۔۔۔ تنگی ' پریشانی ' بڑھتے ہوئے اخراجات اور مہنگائی اس کے ساتھ ہی دونوں کے مزاجوں میں تلخی در آئی۔ وہ اسے گھر کا سکون محبت توجہ دے پا رہی تھی نہ ہی وہ اس کی بنیادی ضروریات پوری کر پا رہا تھا۔

زندگی ایک مشکل دوراہے پر آ کر رک سی گئی تھی ' دونوں لہجے کی تلخی کو دبانا بھول گئے تھے۔ محبت نگر میں روایتی زندگی چل رہی تھی۔ یہ مکان وقت کے ساتھ ساتھ اور بوسیدہ ہوا جا رہا تھا اور مرمت کا کوئی آسرا نہ تھا۔ بچوں کے اخراجات بڑھ رہے تھے دونوں کو اسکول میں داخل کروانا تھا۔ وہ اس سے لڑ لڑ کر تھک

چکی تھی اور وہ ملازمت ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔
گھر میں حسب معمول جھگڑا شور آوازیں زوروں پر تھیں۔ وہ اسے بے روزگاری' کاہلی' سستی کے طعنے دے رہی تھی اور وہ اسے پھوہڑپن' بدتمیز ناشکری کے طعنے دے رہا تھا۔
اس نے دکھ سے اس لڑکی کو دیکھا۔ جو کبھی جان دیتی تھی اس پر جس نے اس کو آنکھوں پر بٹھائے رکھا تھا۔ اب کیسے جاہلانہ رویے سے پیش آرہی تھی۔ طعنے دیتی لڑتی جھگڑتی برتن پٹختی بدتمیز عورت.....
"افسوس کہ میں نے تمہاری خاطر پیسہ چھوڑا' گھر چھوڑا' عیش و آرام چھوڑا' سڑک پر آگیا محلوں سے کیسی ناشکری کی ہے تم نے میری۔" وہ دکھ سے سوچے گیا۔
"کاش کہ وقت واپس آجائے اور میں اپنے ماں باپ کے پاس جاسکوں۔ کاش میں تم جیسی عورت کے لیے اتنا سب نہ کرتا۔" اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔
اس نے اس شخص کا طرز عمل دیکھا بات سنی اور جیسے پتھر کی ہوگئی۔
کہاں..... وہ خوب صورت' پڑھا لکھا..... سلجھا ہوا نوجوان..... کہاں اس کالڑتا جھگڑتا عام سا کالونی کے مزدوروں جیسے پھٹی قمیص والا تیز اور جاہل مرد۔
کتنا بڑا فرق تھا۔ اس عمران اور اس شخص میں' وہ دکھی ہوگئی۔ تو اس شخص کی خاطر اس نے گھر چھوڑا تھا۔ ماں باپ کی عزت کا نہیں سوچا۔ بہن کا نصیب خراب کیا۔ وہ خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھی۔
کاش میں نے تم جیسے گھٹیا مرد کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہ لگائی ہوتی۔ وہ یہ سب بڑی آسانی سے کہہ گئی۔
دونوں کا شور پچھتاوے کے کاش میں دب گیا۔ بچے زور زور سے چیخیں مار مار کر رو رہے تھے اور ان کے ماں باپ اور زور سے ایک دوسرے کو کوس رہے تھے۔
زندگی کسی جھنجھٹ سے کم نہ تھی۔ ایک کاش کو وہ بری طرح پیٹ رہے تھے۔
کاش وقت ہوتا۔
کاش سوچ لیا ہوتا۔

کاش وقت رک جاتا اور بھی کتنے کاش تھے۔ جن کا حساب کتاب لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

☼ ☼ ☼

چیخیں..... لڑائی جھگڑا بچوں کے رونے کی آوازیں شور گھڑی دو بجا رہی ہے۔ وال کلاک نے گھنٹی بجائی سیل فون کا الارم متواتر بج رہا تھا۔
وہ دونوں اپنے اپنے بستر پر۔ اپنے اپنے گھروں میں پسینے میں شرابور ہانپتے ہوئے بیدار ہوئے۔ پہلی نظر گھڑی پر پڑی' ہڑبڑا کر اٹھے۔ گھڑی دو بجا رہی تھی۔ دونوں نے بغور اپنے ارد گرد دیکھا۔
یہ عمران کا ہی کمرہ تھا وہی چیزیں گاڑی کی چابی' والٹ' ڈریسنگ' میز' اے سی' ہیٹر' فرنیچر سب کچھ وہی تھا۔
منیعہ نے پاس سوتی صنوبر کو دیکھا..... وال کلاک سنگھار میز' پلنگ' استری شدہ کپڑے' الماری سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا دو گھنٹے پہلے چھوڑ کر وہ سوئی تھی۔
تو وہ دونوں گھر پر تھے ابھی..... اور یہ خواب تھا۔
دونوں نے لمبی لمبی سانس لی..... پانی کے دو گھونٹ لیے سیل فون اٹھایا۔ میسج ٹائپ کیا۔
ابھی وقت ہے کہنے کے لیے یہی بہت تھا۔ دونوں نے دل پر پتھر رکھ کر سیل فون آف کیا۔ سم نکال کر ڈسٹ بن میں پھینکی۔ خالی موبائل سرہانے رکھا لیٹ گئے۔
گھڑی دو سے آگے رینگنے لگی۔ سیل فون کی مخصوص بیل ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھی۔ بات محبت کے خواب نگر سے نکل کر حقیقت کی وادی میں آگئی تھی۔ سچائی تلخ تھی۔ پر خواب اس سے زیادہ تلخ تھا۔
کلینڈر کی تاریخ دو سے تین پر آئی تھی' اور گھڑی تین تک سفر کر رہی تھی۔ دو بجے کا مشکل ترین وقت خواب کی نذر ہو چکا تھا۔

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی.... مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے.... اور ایسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے.... رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے.... اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے.... اب آگے پڑھیں۔

۳۳

تینتیسویں قسط

زوبیہ کے اضطرابی انداز میں جھنجلاہٹ شامل ہو گئی۔

"آپ کی بد قسمتی سے وہ لڑکا زندہ ہے اور اس نے اپنا بیان بھی دے دیا ہے۔" انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا اور زوبیہ کو سوالیہ انداز میں خود کو دیکھتا دیکھ کر وضاحت کرنے لگا۔

"اس کا کہنا ہے کہ آپ نے اسے سوئمنگ پول میں دھکا دیا تھا اور جب وہ تیر کر اوپر آنے لگا تو آپ خود بھی سوئمنگ پول میں کود گئیں آپ کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے آپ ڈوبتی چلی گئیں مگر آپ نے ڈوبتے وقت بھی اس لڑکے کا پاؤں پکڑ لیا تاکہ وہ بھی آپ کے ساتھ پانی کی تہ میں دم توڑ دے۔ اس نے جب اپنا پیر چھڑوانے کی کوشش کی تب آپ کا سر دیوار سے ٹکرایا اور آپ چوٹ لگنے کی وجہ سے اور سانس رکنے کی وجہ سے بے دم ہو گئیں۔ اس کے پاؤں پر آپ کی گرفت ڈھیلی پڑی تو وہ فوراً" باہر آ گیا۔" زوبیہ ششدر سی انسپکٹر کو دیکھتی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اسے کیا کہنا چاہیے آخر کافی دیر بعد وہ بلال اختر اور عائشہ اختر سے ملنے میں کامیاب ہوئی تو اس کے رہے سہے حوصلے بھی جواب دے گئے۔

بلال اختر تو اس قدر غصے میں تھے کہ زوبیہ ان کے سامنے کچھ بول ہی نہ سکی جبکہ عائشہ اختر خاموشی سے ٹشو سے آنکھوں کے بار بار نم ہوتے کنارے پونچھے جا رہی تھیں۔

"تمہیں اندازہ ہے تم کتنی بری طرح پھنس گئی ہو۔ اتنی مشکلوں سے میں نے تمہیں رخسار والے کیس سے بچایا تھا اور اب پھر تم نے ایک شخص کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس بار جس لڑکے کو تم نے اپنے دماغی فتور کا نشانہ بنایا ہے وہ کسی معمولی آدمی کا بیٹا نہیں ہے' وہ تمہیں اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گا' تم پر اب قتل کا مقدمہ بنے گا۔ تمہارے سر کی چوٹ ٹھیک ہونے تک تمہیں اسپتال میں رکھا جائے گا اس کے بعد تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔" بلال اختر بولتے بولتے ہانپنے لگے زوبیہ نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے وہ گم سم سی انہیں دیکھے گئی۔

عائشہ اختر کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی مگر زوبیہ کا زرد ہوتا چہرہ دیکھ کر وہ اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگیں۔

"دیکھو بیٹا! ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو مگر تمہاری بات ناقابل یقین ہے وہاں تمہارے علاوہ بھی لوگ موجود تھے' انہوں نے خود تمہیں اس لڑکے کو دھکا دیتے دیکھا ہے یہاں تک کہ ......" عائشہ اختر کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ زوبیہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

ان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اگلی بات کہنے کے لیے خود انہیں بھی بہت ہمت کرنی پڑ رہی ہو۔

"وہ جو لڑکا ہے خرم' اس نے بھی تمہارے خلاف بیان دیا ہے۔" زوبیہ کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیلتی چلی گئیں وہ منہ کھولے انہیں دیکھ رہی تھی جو کہہ رہی تھیں۔

"سوئمنگ پول میں تمہیں بچانے کے لیے وہی کودا تھا تم اس لڑکے کا پاؤں مضبوطی سے پکڑ کے بیٹھی تھیں جیسے اسے مار دینا چاہتی ہو بھلے خود تمہیں کیوں نہ مرنا پڑے۔"

زوبیہ کو حیرت سے گنگ دیکھ کر بلال اختر بھی چبا چبا کر کہنے لگے۔

"اس کا کہنا ہے تمہاری باڈی لینگویج سے ایسا بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ تم سوئمنگ نہیں جانتیں اور اس گھبراہٹ یا وحشت میں تم نے اس کے پاؤں کو پکڑ لیا ہے بلکہ تمہارا انداز ایسا تھا جیسے تم اس کے مرنے کے انتظار میں بیٹھی ہو کہ جب اس کا سانس رک جائے تب اوپر آجاؤ۔" بلال اختر کی حالت عجیب ہو رہی تھی کبھی انہیں سخت غصہ آرہا تھا تو کبھی ان کا لہجہ غم سے چور ہو رہا تھا زوبیہ کو ششدر دیکھ کر وہ یاسیت بھرے لہجے میں کہنے لگے۔

"کتنا میں نے چاہا کہ تمہارا یہ پاگل پن دنیا سے مخفی رہے لیکن تمہاری حرکتیں بڑھتی ہی چلی گئیں پہلے اپنے کالج میں تم نے اپنے پاگل پن کو جی بھر کر اچھالا اور اب میرے پورے سرکل میں تمہاری نفسیاتی بیماری ڈسکس کی جائے گی۔ جب تمہیں کورٹ میں پیش کیا جائے گا تب تم وہاں بھی ایسا ہی مریضانہ بیان دو گی' جیسا ابھی پولیس کو دیا ہے۔ جس سے تم باآسانی کورٹ میں پاگل ثابت ہو جاؤ گی اور تمہیں پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔"

زوبیہ کو اپنا پورا وجود سن ہوتا محسوس ہوا پاگل خانے کے نام پر اس کے کان ایسے سائیں سائیں کرنے لگے' جیسے اپنی رگوں میں دوڑتے خون کی آواز اسے خود سنائی دے رہی ہو۔

پاگل خانے جانے کے خیال سے ہی اس کا دل بند ہونے لگا تھا اس پر بلال اختر کی باتیں بھی کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے اعصاب پر برس رہی تھیں' جو مزید کہہ رہے تھے۔

"ایک بار پاگل خانے جانے کے بعد تمہارے رہے سہے حواس بھی چھن جائیں گے اور تم مکمل طور پر پاگل ہو جاؤ گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" عائشہ اختر جو بغور ان کی باتیں سن رہی تھیں ایک دم دہل کر بولیں اور بلال اختر پر بگڑنے لگیں۔

"آپ تو بالکل ہی مایوس ہو گئے ہیں بلال' آخر ایسا بھی کیا ہو گیا ہے وہ لڑکا مر تو نہیں گیا نا۔ اتنے بڑے بڑے وکیل آپ کے دوست ہیں وہ اس واقع کو ایک حادثہ ثابت کر دیں گے۔ کچھ نہیں ہو گا ہماری بیٹی کو' کوئی اسے پاگل خانے نہیں بھیج سکتا۔ ہم کورٹ میں ثابت کر دیں گے کہ زوبیہ غلطی سے اس لڑکے سے ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ پانی میں گر گئی تھی۔ اسے تیرنا نہیں آتا اس لیے اس نے گھبراہٹ میں اس لڑکے کا پاؤں پکڑ لیا۔

اچھا اور بڑا وکیل کورٹ میں خرم کو ایسے گھیرے گا کہ وہ کنفیوز ہو کر اپنے بیان سے پیچھے ہٹ جائے گا۔" عائشہ اختر نے بے اختیار زوبیہ کو بھینچ لیا تھا اور ہیجانی انداز میں بلال اختر سے زیادہ وہ خود کو تسلی دے رہی تھیں۔

زوبیہ کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر وہ ان سے لپٹ کر بے آواز رونے لگی۔ بلال اختر کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں وہ خاموشی سے عائشہ اختر کو دیکھتے رہے ان کی یہ تسلیاں اور دلاسے خود عائشہ اختر کو بھی مطمئن نہیں کر رہے تھے تو بلال اختر کو بھلا کیا کرتے۔

☼ ☼ ☼

کہتے ہیں سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن خرم کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آنکھوں دیکھی حقیقت پر یقین نا کرنے کے لیے خود کو کون سی تاویل دی جائے۔

اتنا وقت گزر جانے اور اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اس کا ذہن ابھی تک اس پارٹی میں سوئمنگ پول کے پاس ہوئے حادثے میں اٹکا تھا۔

اپنے ڈیڈی اور ممی کے ساتھ زوبیہ کے والدین کو کھڑا دیکھ کر وہ اتنا بے زار ہوا تھا کہ پارٹی ہال سے باہر نکل کر سوئمنگ پول والے ایریے میں آبیٹھا تھا۔

ٹیبل پر دونوں پاؤں رکھے وہ اپنا ذہن بٹانے کی کوشش کر رہا تھا جب زوبیہ کو وہاں آتا دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹک گیا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ وہ اسے تلاش کرتی ہوئی یہاں آئی ہے مگر اس کے ایک ہی جگہ آکر کھڑے رہنے پر خرم کو اندازہ ہوا کہ وہ بھی پارٹی سے فرار حاصل کر کے یہاں آئی ہے۔

وہ سوئمنگ پول کے پانی کو بڑے پرسکون انداز میں دیکھ رہی تھی جیسے جو بھی جنگ اس کے دماغ میں چل رہی تھی باہر آکر وہ ختم ہو گئی ہو۔

لیکن اس کے چہرے پر پھیلا اطمینان، بہت جلد اضطراب میں تبدیل ہو گیا وہ سوئمنگ پول کے دوسری جانب دیکھتے ہوئے بری طرح ہراساں ہو گئی تھی۔

خرم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو سامنے حمید کو کسی سے موبائل پر ہم کلام دیکھ کر خرم ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

زوبیہ حمید کو ہی دیکھ رہی تھی اور اسے ہی دیکھ کر خوف زدہ ہوئی تھی مگر پھر ایک عجیب بات ہوئی بجائے اس کے کہ زوبیہ اسے دیکھ کر خوف زدہ انداز میں چیختی وہ اس کی طرف دوڑ پڑی۔

خرم بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا زوبیہ حمید کے پیچھے آکر ایک دم رک گئی اس کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے وہ حمید کی پشت کو ایسے گھور رہی تھی جیسے وہ اپنے سامنے کے منظر کو نہیں بلکہ ذہن کے پردے پر چلتی کسی اور فلم کو دیکھ رہی ہو۔

خرم سانس روکے زوبیہ کے سپاٹ چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ اگلا پل اس کا دل دہلا گیا۔

زوبیہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر حمید کو پانی میں دھکا دے دیا۔ حمید اس افتاد پر بالکل بھی سنبھل نہیں سکا وہ فون پر بات کرتے میں ہی پانی میں جا گرا۔

خرم بے اختیار حمید کی طرف دوڑا تب تک زوبیہ بھی اس کے پیچھے پانی میں کود چکی تھی۔

خرم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ خود بھی سوئمنگ پول میں کود گیا لیکن ہر اگلا منظر پچھلے منظر کے مقابلے میں اسے مزید حیران کر رہا تھا۔

اندر سوئمنگ پول کی جھلملاتی روشنی میں زوبیہ، حمید کا پاؤں پکڑے زمین پر بیٹھی تھی اور حمید جان توڑ کوشش کر کے پانی سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اوپر آکر سانس لے سکے مگر زوبیہ اسے اتنی مہلت دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔

وہ پرسکون چہرے کے ساتھ حمید کو تڑپتا دیکھ رہی تھی کہ اس کا سانس رک جائے اور وہ مر جائے مگر تب ہی مزاحمت کرتے حمید نے اپنا پاؤں چھڑوا لیا اور وہ جھٹکا لگنے کی وجہ سے دیوار سے جا ٹکرائی۔

خرم اس وقت تو اسے پکڑ کر جیسے تیسے اوپر لے آیا مگر تب سے اب تک اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔

اسے خود پر حیرانی ہو رہی تھی وہ زوبیہ سے ملنے سے پہلے اس کی ذہنی بیماری کے متعلق جانتا تھا پھر بھی اس نے زوبیہ کی بکواس پر توجہ دی اور اتنی دی کہ جا کے اس کے ساتھ حمید کے فارم ہاؤس پر۔۔۔ ایک گڑھا بھی کھود آیا وہ کیوں ایک پاگل لڑکی کی بڑبڑ کو اتنی اہمیت دیتا رہا۔ جو کچھ پارٹی میں ہوا اگر وہ سب خرم نہ دیکھتا تو وہ شائستہ خالہ کی روح اور حمید کے متعلق کہی زوبیہ کی باتوں کا پس منظر تلاش کرنے میں آج بھی سرگرداں ہوتا۔

بے شک ان سب باتوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھا زوبیہ کو اپنے ساتھ یونیورسٹی لے جانے پر اسے شدید پچھتاوا تھا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ حمید کے فارم ہاؤس پر جا کر کسی کی قبر تلاش کرنا شروع کر دے۔

وکی کے گھر پارٹی میں آنے کے باوجود اسے یہ نہیں پتا تھا کہ پہلے ان کے گھر منعقد ہونے والی کسی تقریب میں وہ شامل ہوئی ہے یا نہیں بالکل ایسے ہی وہ حمید کے فارم ہاؤس پر بھی کبھی گئی ہوگی مگر اسے یاد ہی نہیں ہوگا کہ اس نے یہ جگہ کبھی دیکھی ہے یا نہیں بس ایک نقشہ اس کے ذہن میں تھا جو اس نے خرم کے سامنے کھینچ دیا اور خرم اس ایک بات کے پیچھے اتنی دور چلا گیا جتنا وہ سوچ رہا تھا اتنا ہی اسے پچھتاوا ہو رہا تھا۔

اس نے حماقت کی حد کر دی تھی۔

تب ہی جب پولیس نے اس کا بیان لیا تو اس نے ایک لفظ بھی جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا اور من و عن سچ بیان

کر دیا حالانکہ اسے اچھی طرح علم تھا اس کی یہ گواہی زوبیہ کے خلاف جائے گی اسے جیل ہو سکتی ہے۔

مگر وہ جھوٹ بول کر ایک ایسی مریضہ کو نہیں بچا سکتا تھا جس کا آزادانہ گھومنا لوگوں کے لیے خطرناک ہو اور جو اپنے خیالی تراشے پیکر کے باعث کبھی بھی کسی پر حملہ کر سکتی ہو۔

اس کی باتوں پر بھروسہ کر کے جتنی بے وقوفی کا وہ ثبوت دے چکا تھا اس کے بعد اب مزید کسی احمقانہ فعل کی کوئی گنجائش نہیں تھی اسی لیے اسے اس بات کی بھی فکر نہیں ہوئی کہ حمید پر ہوئے حملے کی خبر اخبار کی سرخیوں میں بھی شامل ہو گئی اور وکی کے گھر کی پارٹی میں یونیورسٹی کے جو دوسرے لوگ موجود تھے انہوں نے پورا واقعہ فوراً ہی یونیورسٹی میں بھی نشر کر دیا۔

یونیورسٹی میں یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی یعنی کہ خرم کی گرل فرینڈ (ان سب کی نظر میں وہ خرم کی گرل فرینڈ ہی تھی) نے خرم کے ہی دوست پر جان لیوا حملہ کیا جس پر خرم نے اسے بچایا۔ ڈی آئی جی صاحب نے تو اسی وقت موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا وہ جلد از جلد زوبیہ کو منظر سے ہٹا دینا چاہتے تھے بلال اختر نے بھی ایمبولینس کا انتظار کرنے کے بجائے اسے گاڑی میں ہسپتال لے جانا بہتر سمجھا۔

مگر حمید کے والدین نے وہاں ایک واویلا مچا دیا تھا حالانکہ حمید دو چار گہرے سانس کھینچ کر بہتر بھی ہو گیا تھا مگر جو ہوا تھا وہ اتنا معمولی واقعہ نہیں تھا کہ حالات بھی فوراً قابو میں آجاتے۔

سب ہی اس اچانک افتاد پر بوکھلا گئے تھے اور اسی بوکھلاہٹ میں ہارون نے بین کرتی حمید کی والدہ کے سامنے غلطی سے کہہ دیا کہ زوبیہ نے جان بوجھ کر یہ سب نہیں کیا وہ ایک ذہنی مریضہ ہے۔

بس پھر کیا تھا حمید کے والد تو اس کے پیچھے لگ گئے کہ وہ یہ کیسے جانتا ہے تب ہارون کو مجبوراً خرم کا نام لینا پڑا۔ خرم نے کوشش تو بہت کی یہ چھپانے کی کہ زوبیہ حمید کو اپنی شائستہ خالہ کی موت کا ذمہ دار سمجھتی ہے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

خرم کو ٹال مٹول کرتا دیکھ کر انہوں نے نادر سے مدد طلب کی اور نادر نے انہیں سب سچ سچ بتا دیا۔

زوبیہ کا پاگل پن۔

زوبیہ کا حمید کو دیکھ کر یونیورسٹی میں بے ہوش ہو جانا۔

اس نے سب ایک ہی سانس میں کہہ دیا پھر تو جیسے حمید کے والدین کو پتنگے لگ گئے۔

عائشہ اختر اور بلال اختر تب تک وہاں سے جا چکے تھے انہیں اس ساری گفتگو کا کوئی علم نہیں تھا۔

لیکن حمید کے والدین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت ان دونوں کا گریبان پکڑ کر ان سے پوچھیں کہ جب ان کی بیٹی اتنی خطرناک پاگل ہے تو وہ اسے لے کر اس طرح محفلوں میں کیوں آتے ہیں کیوں دوسروں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں وغیرہ۔

یہ سارا ہنگامہ وکی اور حمید کے سامنے ہوا تھا وہ دونوں ہی کافی تھے یہ سب یونیورسٹی میں نشر کرنے کے لیے اس پر وکی کے کچھ کزنز جو یونیورسٹی میں ہی پڑھتے تھے پوری کہانی مرچ مسالے کے ساتھ یونیورسٹی میں پھیلانے کی مہم میں لگ گئے۔

خرم سے متعلق کوئی خبر کتنی تیزی سے مشہور ہوتی ہے یہ کسی کے لیے بھی نئی بات نہیں تھی اور یہاں تو خبر بھی ایسی تھی جو سب کو متجسس کر دے۔

کمل اور سنبل تک جب یہ بات پہنچی تو وہ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھتی رہ گئیں مخبر کے سامنے ان دونوں نے اپنی رائے دینے سے گریز کیا کیونکہ کمل کے تبصرے بھی اسی تیزی سے یونیورسٹی میں گردش کرتے جتنا تہلکہ یہ خبر مچا رہی تھی البتہ تنہائی ملتے پر کمل کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"پتا نہیں یہ سب خرم کا کیا دھرا ہے یا واقعی یہ سب زوبیہ نے اپنی نفسیاتی بیماری کے سبب کیا ہے۔"
"خرم کا اس معاملے میں کیا ہاتھ ہو سکتا ہے۔" سنبل نے حیرانی سے نمل کو دیکھا تو نمل کہنے لگی۔
"یار دیکھو نا جب زوبیہ اسکول میں ہوا کرتی تھی تب تو وہ اتنی خطرناک پاگل نہیں تھی کہ کسی پر جان لیوا حملہ کردے۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی بیماری بڑھ گئی ہو ایسی اسپلٹ پرسنالٹی کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جب ان پر دوسری شخصیت حاوی ہونے لگتی ہے تب وہ اپنا آپ بھول جاتے ہیں پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ دوسری شخصیت ان پر ہر وقت سوار رہنے لگتی ہے۔
اسکول کے زمانے میں اس پر دورے زیادہ وقفے سے پڑتے ہوں گے اب وقت گزرنے کے ساتھ دوروں کا دورانیہ بڑھتا جا رہا ہوگا۔ ہر بات کے پیچھے خرم کو ذمہ دار سمجھنا تو کچھ مناسب نہیں۔" سنبل بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی تب ہی نمل بھی صفائی دینے لگی۔
"میں ہر بات کے پیچھے اسے کوئی زبردستی ذمہ دار نہیں سمجھتی بلکہ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ہر جگہ اسی کا قصور نظر آنے لگتا ہے۔
اب دیکھو نا زوبیہ کو اس نے مجھے جلانے کے لیے گرل فرینڈ ظاہر کیا تھا میں تو جلی نہیں ہو سکتا ہے زوبیہ اس کے گلے پڑنے لگی ہو تو خرم نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ ایک نیا ڈرامہ رچایا ہو حمید خود ہی سوئمنگ پول میں گر گیا ہو اور ان دونوں نے الزام زوبیہ پر رکھ......" نمل ایک تواتر سے بول رہی تھی کہ ایک دم اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔ خرم جو ان کی گفتگو کے چند الفاظ کان میں پڑ جانے پر ان کے پیچھے سے گزرتے وقت رک گیا تھا ایک دم اس کے سامنے آکھڑا ہوا دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے وہ اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔
"اب کہو جو کہنا ہے۔"
نمل کچھ سٹپٹا سی گئی اس کے اس انداز پر۔
کتنے دنوں سے اس نے نمل سے بات کرنی یہاں تک کہ اس کی طرف دیکھنا تک چھوڑ دیا تھا اور اب آج اچانک وہ اس کے روبرو آکھڑا ہوا تھا وہ بھی ایسے تیور لیے جیسے بہت سنجیدہ گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا ہو ورنہ وہ ہمیشہ شوخ انداز میں بات کرتا تھا۔
"سوئمنگ پول میں گرنے کے بعد زوبیہ کے سر میں چوٹ لگی تھی جس کے باعث وہ پچھلے تین دنوں سے ہسپتال میں ہے یہ چوٹ ٹھیک ہونے کے بعد وہ گھر جائے گی پاگل خانے جائے گی یا جیل جائے گی کسی کو کچھ نہیں پتا ہے۔ کیا کسی لڑکی سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں اتنی بڑی سازش کروں گا؟" خرم ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سرد سے لہجے میں پوچھنے لگا۔
پہلی بار نمل کو احساس ہوا اس کی شوخی کا دوبدو جواب دینا زیادہ آسان تھا بہ نسبت اس کے اس سپاٹ رویے کے۔
لیکن وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا تب ہی نمل کو جواب نہ معلوم ہونے پر بھی اس کے سامنے اعتراف کرنا پڑا کیونکہ انکار کرنے کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ اس پر اپنا بھروسہ ظاہر کر رہی ہے جبکہ سچ یہ تھا کہ وہ کچھ تامل کا شکار ہو گئی تھی لیکن اپنی کشمکش پوشیدہ رکھتے ہوئے وہ خود اعتماد نظر آنا چاہتی تھی اس لیے بڑے یقین سے بولی۔
"ہاں کر سکتے ہو محض اتنی بڑی سازش ہی نہیں تم اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ اس سے بڑی کوئی سازش بھی۔" سنبل نے اپنی مسکراہٹ کو روکنے کے لیے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔
وہ جانتی تھی نمل یہ صرف خرم کو تپانے کے لیے کہہ رہی ہے ورنہ وہ اتنی جارحانہ سوچ کی مالک ہرگز نہیں ہے

بلکہ جس معاملے کا پتا نہ ہو اس میں اپنی رائے ظاہر کرنا نمل کی عادت نہیں تھی کسی حادثے پر ممکنات کا اندازہ لگانا ایک الگ بات ہے اور ان اندازوں پر ڈٹے رہنا اور ان کے سو فیصد درست ہونے پر بضد رہنا ایک الگ بات۔
مگر خرم کو اس کی سوچ کے متعلق بھلا کیا علم وہ تو نمل کے جواب پر سلگ کر رہ گیا مجال ہے جو کبھی اس لڑکی نے کوئی سیدھی بات کی ہو۔ جب سے وہ نمل سے ملا تھا پہلے دن سے ان کا یہی اختلاف چل رہا تھا۔
جب پیلس ہوٹل میں وہ اس کی ٹیبل پر اس کی مدد کرنے اور اس کا بل پے کرنے آیا تھا تب بھی اگر وہ اس پر شک ہونے کے باوجود خاموشی سے اس کے پیسے لے لیتی اور معاملے کو رفع دفع کر دیتی تو آج وہ اسے نیچا دکھانے کی کوشش میں ایک نفسیاتی مریضہ کو یوں اسکینڈلائز نہ کرتا اور نہ ہی ضمیر کی ملامت کا سامنا کرنا پڑتا۔
مگر تب سے آج تک نمل نے کبھی بات ختم کرنے کے لیے مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور اس کا کھرا سچ خرم کو تپا کر رکھ دیتا تھا۔
ابھی بھی وہ دانت پر دانت جمائے اسے دیکھ رہا تھا کہ لاپروائی سے کہتے ہوئے وہ کترا کر نکل گئی۔
"اگر تم خود کو بہتر طریقے سے جانتے ہو تو تمہیں دوسروں سے اپنے بارے میں رائے لینے کی ضرورت نہیں۔"

☼ ☼ ☼

جب سے رومیلہ نے الیان سے بات کی تھی اسے الیان کے رویے میں واضح طور پر فرق محسوس ہوا تھا حالانکہ بظاہر سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا بلکہ گاؤں سے واپس آنے کے بعد وہ دونوں ایک کمرے میں نہیں رہ رہے تھے لہٰذا ان دونوں کے بیچ وہ مختصر سی گفتگو بھی نہیں ہوتی تھی جو گاؤں میں ایک ہی کمرہ ہونے کے باعث ہو جاتی تھی پھر بھی الیان کے رویے میں وہ محسوس کی جانے والی نفرت نہیں تھی اور یہ بات رومیلہ کے لیے بڑی حوصلہ مند تھی۔
اسے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ الیان اس کی گفتگو سن چکا ہے اس لیے وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ الیان نے اس کے کہے پر یقین کر لیا ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کر دے گی اسے ساری زندگی رومیلہ کو برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف کچھ مہینے ماحول سازگار ہونے تک وہ اسے اپنے گھر میں رہنے دے پھر وہ خود ہی چلی جائے گی۔
الیان نے اس کی بات نا صرف مان لی تھی بلکہ شاید اپنے گھر والوں کو بھی کچھ سمجھایا تھا ریاض غفار کا رویہ اچھا تھا نہ برا وہ سارے معاملے سے بالکل لاتعلق بنے ہوئے تھے اور کیونکہ رومیلہ ان سے نفرت کی امید لگائے بیٹھی تھی لہٰذا اسے تو ان کی یہ بے گانگی ہی غنیمت لگتی تھی۔
البتہ شگفتہ غفار کا رویہ ہنوز تھا ان کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی برہمی چھلکنے لگتی ان کی آنکھوں سے ایسے کراہیت چھلکتی تھی کہ رومیلہ ان کی جانب دیکھنے سے بلکہ ان کے سامنے آنے سے ہی گریز کرتی تھی جو کہ اتنا مشکل امر بھی نہیں تھا۔
شگفتہ غفار کا سرکل کچھ ایسا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد عموماً وہ بازار یا کسی گیٹ ٹوگیدر میں چلی جاتیں دوپہر میں گھر آتیں تو کھانا وغیرہ کھا کر اپنے کمرے میں سونے چلی جاتیں صرف شام چھ بجے سے رات کے کھانے تک وہ گھر میں نظر آتی تھیں جس وقت الیان اور ریاض غفار بھی آجاتے تھے چنانچہ اس وقت میں رومیلہ اپنے کمرے میں ہی رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔
وہ نہیں چاہتی تھی کہ شگفتہ غفار کی موجودگی میں الیان کے سامنے بھی جائے اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ الیان کو اس کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتی ہیں۔
ایک دن الیان کو آفس جانے میں ذرا دیر ہو گئی وہ جب تک تیار ہو کر کمرے سے نکلا ناشتا کرنے کا وقت نہیں

بجا تھا رومیلہ اپنی چائے بنا کر کچن میں کچھ دیکھنے گئی تھی الیان ہاتھ میں بریف کیس لیے میز کے قریب آگیا اور گرم گرم چائے ٹیبل پر رکھی دیکھ کر اسے اٹھا کر کھڑے کھڑے ہی دو سپ لے لیے شگفتہ غفار نے جب دیکھا کہ وہ رومیلہ کی چائے پی رہا ہے تو بھنا اٹھیں۔
"الیان یہ کیا کر رہے ہو یہ تمہاری چائے نہیں ہے ٹھہرو میں تمہاری چائے بنواتی ہوں۔"
"نہیں نہیں میرے پاس ٹائم نہیں ہے میں جا رہا ہوں۔" الیان نے پورا کپ پیا بھی نہیں اور پیالی پرچ میں واپس رکھ دی مگر شگفتہ غفار کو تو آگ لگ گئی تھی۔
"ٹائم نہیں ہے تو یہ چائے پینے کی کیا ضرورت تھی۔"
"کیوں کیا اس چائے میں زہر ملا تھا۔" الیان نے لاپروائی سے کہا۔
"اللہ نہ کرے کیا بکواس کر رہے ہو مگر یہ تمہاری چائے نہیں تھی۔"
"سو واٹ جس کی بھی تھی وہ دوسرا کپ بنا لے میں آفس جا کر باقاعدہ ناشتا کرلوں گا یہ دو گھونٹ تو بس نیند بھگانے کے لیے ہیں اوکے اللہ حافظ۔" الیان تیزی سے بولتا یہ جا وہ جا۔
مگر شگفتہ غفار کے سینے پر سانپ لوٹتے رہے انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے رومیلہ کو اس کپ میں سے چائے پیتے دیکھا تھا حالانکہ اس نے بھی ایک گھونٹ بھرا تھا وہ ٹوسٹر میں ٹوسٹ ڈال کر آئی تھی جنہیں اخبار اٹھا کر سرخیاں دیکھنے کے چکر میں وہ بالکل فراموش کر بیٹھی تھی للہٰذا یاد آنے پر وہ چائے ایسے ہی چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔
کچن ڈائننگ روم سے بالکل ملا ہوا تھا ان دونوں کے مابین ہوئی گفتگو رومیلہ آرام سے سن رہی تھی اور اس کا پس منظر بھی سمجھ رہی تھی پھر بھی اگر کوئی کسر باقی تھی تو کچن سے واپس آنے پر شگفتہ غفار نے پوری کر دی۔
"پتا نہیں کیسے کیسے بے غیرت لوگ ہوتے ہیں دنیا میں 'کسی کے گھر بیٹھ کر مفت کا کھاتے پیتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی' ہر چیز اس استحقاق سے استعمال کرتے ہیں جیسے گھر میں ہر چیز ان ہی کی تو لائی ہوئی ہو۔" شگفتہ غفار ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ایسے چلا رہی تھیں جیسے فون پر کسی سے مخاطب ہوں اور کمرے میں ان کے علاوہ کوئی موجود نہ ہو۔
رومیلہ جہاں تھی وہیں ٹھٹک گئی وہ سانس روکے ان کے زہر میں بجھے الفاظ سنتی رہی جو مزید کہہ رہی تھیں۔
"اصل میں حرام کا کھاتے ہیں نا بچپن سے حلال کبھی پیٹ میں گیا ہی نہیں تو شرم اور غیرت کہاں سے آئے دوسرے کے گھر میں ان ہی کے برتنوں میں مفت کی روٹیاں 'ان ہی کے ڈائننگ ٹیبل پر توڑتے ہوئے مجال ہے جو ذرا بھی شرمندگی ہو۔" شگفتہ غفار یہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔
رومیلہ کو لگ رہا تھا وہ ابھی چکرا کر گر جائے گی۔
اتنی بے عزتی۔
اتنی ذلت
کیا اب اس پر یہ وقت آگیا ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی بھی کسی کی احسان مند ہو کر کھا رہی ہے۔
ٹوسٹ کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں لرزنے لگی تو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے اسے ٹیبل پر رکھ دیا مبادا پلیٹ ہاتھ سے چھوٹنے پر ٹوٹ نہ جائے۔
کسی کے اتنے مہنگے برتنوں کے سیٹ کی پلیٹ اگر اس سے ٹوٹ گئی تو اس نقصان کی تلافی وہ کیسے کرے گی؟
وہ کوئی حرام کھا کر بڑی نہیں ہوئی تھی مگر ابرار بھائی نے اپنے مجرمانہ فعل سے اس کے پورے گھر کو جرائم پیشہ افراد ثابت کر دیا تھا جو حرام کماتے ہیں اور حرام ہی کھاتے ہیں۔

رومیلہ کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا بننے لگا تو وہ سب چیزیں ٹیبل پر ایسے ہی چھوڑ کر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
ان سب کا نظر انداز کرنا ہی اسے سخت توہین آمیز لگتا تھا اور آج اس کے کھانے پینے پر شگفتہ غفار نے جس طرح باتیں سنائی تھیں انہیں سننے کے بعد اس کا ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا تھا۔
رات تک وہ اپنے کمرے میں بند رہی کسی نے بھی آکر اس سے نہیں پوچھا کہ وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ اس نے دوپہر کا کھانا کھایا نہ رات کا اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس گھر کا پانی بھی پیے۔
مگر بھوک پیاس سے رہنا کوئی مسئلے کا حل نہیں تھا وہ تو اگر فاقہ کر کے مر بھی جاتی تب بھی ڈھیٹ اور بے غیرت ہی کہلاتی اسے اپنے دامن پر لگے مجرم پیشہ ہونے کا داغ دھونا تھا نہ کہ کمرے میں بند ہو کر اور کھانا پینا چھوڑ کر اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرنا تھا یا دوسروں کی ہمدردیاں سمیٹنی تھیں۔
آخر رات کے گیارہ بجے جب اسے یقین ہو گیا کہ شگفتہ غفار اپنے کمرے میں سونے چلی گئی ہوں گی اور اب باہر نہیں آئیں گی وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔
اتنی رات گئے اس طرح الیان کے کمرے میں جانا اسے عجیب تو لگ رہا تھا مگر یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی وہ خود کو برحق سمجھتے ہوئے اپنے حوصلے جمع کرتی اس کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی دستک دینے پر الیان کی بڑی فریش آواز سنائی دی گویا وہ ابھی تک سویا نہیں تھا۔
"دروازہ کھلا ہے آجاؤ۔" رومیلہ نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو واقعی دروازہ کھلتا چلا گیا الیان کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا پورے انہماک سے کام میں مشغول تھا۔
کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے دروازے کی سمت دیکھا بھی نہیں اور مصروف سے انداز میں کہنے لگا۔
"میں سرداراں کو چائے کے لیے منع کر کے اوپر آیا تھا لیکن خیر اب تم نے بنا ہی دی ہے تو رکھ دو۔" الیان اسے ہمیشہ گھر کی ملازمہ ہی سمجھتا تھا۔
رومیلہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیا کہے وہ خاموشی سے دروازے میں ہی ایستادہ رہی۔
"ارے میں نے کہا ہے نا چائے رکھ....." الیان نے غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف دیکھا تو حیرت سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"ک.... کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" رومیلہ نے خود اعتماد نظر آنے کی کوشش کی۔ (ناکام)
الیان نے ایک نظر وال کلاک پر ڈالی اور دوسری سوالیہ نظر رومیلہ پر مرکوز کر دی۔
"م... مجھے کچھ بات کرنی ہے۔" رومیلہ اس کے چہرے پر پھیلی رضامندی دیکھتے ہوئے اندر آکر کھڑی ہو گئی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا بات کہاں سے شروع کرے اور اسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر الیان نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"بیٹھ جاؤ اور آرام سے بتاؤ کیا بات ہے۔" الیان کا لہجہ بہت نرم اور پرسکون تھا وہ ایک تشکر بھری نظر اس پر ڈال کر صوفے پر بیٹھ گئی تھوڑا سا اس کا اعتماد بڑھا تھا للہٰذا وہ سب کچھ جلدی سے کہہ دینا چاہتی تھی کہیں الیان کی پیشانی پر بل پڑ گئے تو اس سے بات کرنا دوبھر ہو جائے گا۔
"میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔" رومیلہ کہہ کر خاموش ہو گئی جبکہ الیان اسے ایسے دیکھتا رہا جیسے آگے اس کی بات سننا چاہتا ہو مگر جب وہ بولی ہی نہیں تب الیان کو خود ہی کہنا پڑا۔
"بس اور کچھ نہیں کہنا۔" رومیلہ نے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔
"اچھا۔" الیان نے اپنی روکنگ چیئر کو جھلاتے ہوئے پرسوچ انداز میں اچھا کو کھینچا پھر مزید گویا ہوا۔

"اس سے پہلے کہ میں یہ پوچھوں کہ تم جاب کیوں کرنا چاہتی ہو یہ بتاؤ کہ تم اجازت لے رہی ہو یا فیصلہ سنا رہی ہو۔" رومیلہ کچھ ٹھٹک سی گئی۔

ویسے تو وہ صرف اسے آگاہ کرنے آئی تھی مگر اس کے منہ پر یہ کہنا کچھ مناسب نہ لگا تو وہ مفاہمت کی راہ اپناتے ہوئے بولی۔

"اپنی خواہش ظاہر کر رہی ہوں اور مجھے یقین ہے آپ اس کا احترام کریں گے۔" الیان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"اس خواہش کی وجہ۔"

"میں پورا دن گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں مجھے کوئی مصروفیت چاہیے۔"

"تو اس کے لیے پڑھائی کر لو جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پڑھائی میں جاب کے ساتھ کر لوں گی ویسے بھی میری تعلیم درمیان میں رہ گئی ہے میں اسے بھی دوبارہ شروع کرنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے جاب کرنی ہوگی۔" رومیلہ نے جلدی جلدی کہا۔

"پڑھائی کے ساتھ جاب کرنا آسان کام نہیں ہے اتنی پرابلم فیس کرنے کی کیا ضرورت ہے پہلے پڑھائی ختم کر لو پھر جاب کر لینا جاب بھی اچھی مل جائے گی۔" رومیلہ سر اٹھا کر الیان کی طرف دیکھنے لگی جو پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ رومیلہ نے ایک گہرا سانس کھینچ کر ساری ہمتیں مجتمع کیں اور سب کچھ دو ٹوک کہتے ہوئے بولی۔

"یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ہزار طرح کے خرچ کرنے پڑتے ہیں کم سے کم کرتے کرتے بھی آنے جانے کا کرایہ تو لگ ہی جائے گا۔ کہیں سے کوئی ارننگ کا انتظام ہو تو یہ سارے ایکسپینز پورے ہو سکتے ہیں۔"

الیان کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا اس کے جاب کرنے کی خواہش ظاہر کرنے پر ہی الیان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنا پیسہ کمانا چاہتی ہے مگر وہ اتنا بے دھڑک یہ کہہ دے گی یہ الیان کو امید نہیں تھی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔

اتنے دن ہو گئے تھے ان کی شادی کو۔ وہ اپنے گھر سے اپنا کچھ سامان لے آئی تھی اور اس کے بعد الیان یا اس کے گھر والوں نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے یا نہیں۔

اتنے ہفتوں سے وہ یہاں تھی چھوٹی موٹی چیز کی ضرورت تو اسے پڑ سکتی ہے کیا صرف دو وقت کی روٹی مہیا کر دینے سے انسان کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں ایسے حالات میں انسان کب تک گزارا کر سکتا ہے آخر رومیلہ کو وہی قدم اٹھانا تھا جو وہ اٹھانے جا رہی تھی۔

الیان کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر ہنکارا بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تمہارا جیب خرچ مقرر کر دیتا ہوں صرف کرایہ ہی نہیں تمہیں اور بھی دوسری چیزوں کی ضرورت۔۔۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے میں ہر چیز کے بغیر گزارا کر سکتی ہوں مجھے صرف تھوڑی سی عزت چاہیے جو آپ سے جیب خرچ لینے کی صورت میں بالکل بھی نہیں بچے گی۔ ویسے بھی میرا آپ کے پیسوں پر کوئی حق نہیں۔ جب کوئی رشتہ نہیں کوئی تعلق نہیں تو جیب خرچ کیسا؟

میں اپنا کمانا چاہتی ہوں تاکہ مجھے کسی کے زیر احسان ہونے کا احساس نہ ہو ورنہ اگر مجھے پیسے مانگنے ہی ہوتے تو کیا میں اپنے بابا سے نہیں مانگ سکتی۔" رومیلہ نے الیان کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"تم اپنے بابا سے نہیں مانگ سکتیں کیونکہ ان پر تمہیں ظاہر کرنا ہے کہ تمہیں یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" الیان برجستہ بولا تو چند لمحوں کے لیے اس بار رومیلہ خاموش رہ گئی تب ہی الیان کو کہنا پڑا۔

"اسی لیے کہہ رہا ہوں تمہیں جتنے بھی پیسے چاہئیں میں تمہیں دے دوں گا جاب کر کے کیوں اپنے گھر والوں کو مشکوک کر رہی ہو۔" الیان نے اسے محض اپنے ارادوں سے باز رکھنے کے لیے کہا ورنہ اس کے گھر والوں کے مشکوک ہونے سے زیادہ خود الیان کو اس کا جاب کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"میرے گھر والے مشکوک نہیں ہوں گے بلکہ صرف ناراض ہوں گے کیونکہ میں انہیں بتاؤں گی کہ میں نے جاب شوقیہ کی ہے وہ بھی آپ کے منع کرنے کے باوجود تو وہ مجھے خود سر اور باغی سمجھیں گے اور ان کی یہ رائے آئندہ کے حالات کو سازگار بنانے میں معاون ثابت ہوگی۔" رومیلہ کے لہجے میں حد درجہ لاپروائی تھی۔

اگر الیان نے اسے فون پر نمل سے بات کرتے وقت روتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو وہ اسے بہت بہادر یا شاید بہت ڈھیٹ سمجھ لیتا۔

لیکن اس کی وہ گفتگو اور تاثرات دیکھنے کے بعد الیان کو شدت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے کتنے جتن کر رہی ہے۔

"جب فیصلہ کر چکی ہو تو جاؤ جا کر اخبار میں ویکنسی دیکھو۔" الیان نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے کھردرے سے لہجے میں کہا تو رومیلہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"میں اس طرح جاب نہیں کر سکتی میں چاہتی ہوں آپ خوشی سے مجھے جاب کرنے دیں۔"

"جب کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر میری اجازت کی کیا ضرورت ہے۔" الیان نے تھوڑی دیر پہلے کہی اس کی بات لوٹا دی تو وہ تذبذب کے عالم میں ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی آخر الیان کو ہی کہنا پڑا۔

"دیکھو صاف بات ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم جاب کرو اگر تم جاب پیسوں کے لیے کرنا چاہتی ہو تو پیسے تم جتنے چاہو مجھ سے لے سکتی ہو اور اگر تم جاب وقت گزاری کے لیے کرنا چاہتی ہو تو ۔۔۔ تم اپنی پڑھائی شروع کر سکتی ہو اس کی طرف اگر ذہن راغب نہیں ہو رہا تو گھر کے کام کاج کر لو تمہیں اگر کوکنگ میں دلچسپی۔۔۔"

"آپ کی والدہ کو میرا کچن میں قدم رکھنا بھی پسند نہیں۔" رومیلہ درمیان میں بول پڑی الیان کچھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھانا تو بہت دور کی بات ہے انہیں تو میرا مفت کی روٹیاں توڑنا بھی برا لگتا ہے اب میں فی الحال تو یہ گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی نا اسی لیے میں جاب کرنا چاہتی ہوں میں اپنے پیسوں سے باہر سے ہی کچھ کھا کر آجاؤں گی تو مجھے یہاں کسی کی حقارت بھری نظریں برداشت نہیں کرنی پڑیں گی۔" بلا آخر رومیلہ کا لہجہ بھیگ ہی گیا۔

"کیا کہا ہے ممی نے تم سے۔" الیان نے اپنی بے تحاشا حیرت پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ سب رہنے دیں، میں تو آپ کو یہ بھی نہ بتاتی لیکن آپ کو لگ رہا ہے میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا اور میں وقت گزاری کے لیے جاب کرنا چاہتی ہوں اس لیے یہ سب کہنا پڑا۔" رومیلہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے دھیرے سے بولی تو الیان رسانیت سے کہنے لگا۔

"میں ایسا کچھ نہیں سمجھ رہا میں تو صرف تمہیں بہتر آپشن دے رہا تھا لیکن اب جو بات تم نے بتائی ہے وہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے تم اگر اپنا کما کر اپنا خرچ بھی اٹھاؤ گی تب بھی ممی کو تم سے شکایت ہی رہے گی۔

اس پرابلم کو میں سولو کر دوں گا تم بس یہ جاب والی بات دل سے نکال دو ہاں البتہ اگر پڑھائی شروع کرنا چاہتی ہو تو بے شک کر سکتی ہو بلکہ میرے خیال سے تمہیں شروع کر دینی چاہیے لیکن اس میں بھی تمہیں ایک بات کا دھیان رکھنا ہوگا تم کوئی کرایہ خرچ کر کے بس یا رکشا میں نہیں جاؤ گی تم گھر کی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ جاؤ گی۔

ممی کے رویے کی میں پوری طرح سے ضمانت تو نہیں لے رہا لیکن اتنا یقین رکھو کہ وہ تمہیں مزید کچھ نہیں کہیں گی۔" رومیلہ بے اختیار سر اٹھا کر الیان کی جانب دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں اتنا یقین تھا کہ رومیلہ چند ثانیوں کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی پھر خود ہی اس کی نظریں جھک گئیں جیسے اس نے ہار مان لی ہو۔

اصل میں تو وہ الیان سے بحث نہیں کر سکی ورنہ شگفتہ غفار سے، بہتر رویے کی اسے امید نہیں تھی۔

مگر اس وقت اسے واقعی حیرانی کا سامنا کرنا پڑا جب اگلے دن رات کے کھانے پر ملازم نے اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے بلایا اور ریاض غفار کے طلب کرنے کا پیغام دیا۔

"بڑے صاحب نے مجھے بلایا ہے یعنی ریاض صاحب نے۔" رومیلہ بلا کی حیرت سے پوچھ رہی تھی اس نے پرسوں رات سے کچھ نہیں کھایا تھا بھوک بھلے ہی مر گئی تھی مگر نقاہت، بہت محسوس ہو رہی تھی بلکہ اسے لگ رہا تھا اب اگر مزید کچھ گھنٹے وہ بھوکی رہی تو بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔

بھوک بہت بری چیز ہے انا اور خودداری کی جنگ میں پیٹ کا دوزخ اگر درمیان میں آجائے تو آدھا میدان انسان پہلے ہی ہار چکا ہوتا ہے۔

لہٰذا اس وقت یہ سن کر کہ ریاض غفار خود اسے کھانے پر بلا رہے ہیں وہ فوراً "ڈائننگ ٹیبل پر آگئی اور جب وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہی تھی تب اس نے ریاض غفار کو کہتے سنا۔

"کب سے کھانا نہیں کھایا ہے تم نے؟" رومیلہ بے اختیار گردن گھما کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ج۔۔۔جی۔۔۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے جبکہ ریاض غفار بغور اسے دیکھ رہے تھے اس کے چہرے کی گلابی رنگت میں ہلدی گھلی ہوئی تھی چہرہ بالکل مرجھا کر رہ گیا تھا ریاض غفار نظروں کا زاویہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

شگفتہ غفار اور الیان تو پہلے ہی لاتعلق بنے اپنی اپنی پلیٹوں پر جھکے ہوئے تھے۔ رومیلہ کو بت بنا دیکھ کر ریاض غفار ہی کھسیانی سی آواز میں کہنے لگے۔

"چلو کھانا شروع کرو اور آئندہ کھانے کا وقت ہوتے ہی ڈائننگ ٹیبل پر سب کے ساتھ آجانا گھر کے لوگوں کو مہمانوں کی طرح کھانے کے لیے بلایا نہیں جاتا۔" رومیلہ ابھی بھی بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی جو اس سے نظریں چرائے بات کر رہے تھے جبکہ رومیلہ باقاعدہ منہ کھولے انہیں دیکھے گئی جب انہوں نے مزید کہا۔

"اگر یہ کھانے پسند نہیں ہیں تو خود اپنے آپ کچھ اپنی پسند کا بنا لو ہم بھی وہی ایک سے کھانے کھا کھا کر بور ہو گئے ہیں ہمیں بھی کچھ چینج مل جائے گا۔" کتنی ہی دیر رومیلہ حیرت سے گنگ بیٹھی رہی آخر بڑی مشکل سے اس نے ذہن کو حاضر کرتے ہوئے کھانا پلیٹ میں نکالا اور چھوٹے چھوٹے نوالے لینے لگی۔

اسے کھاتے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ شگفتہ غفار کھانا ختم کر کے اٹھ بھی گئیں ان کے تھوڑی دیر بعد ریاض غفار بھی اٹھ گئے تب الیان نے پہلی بار سر اٹھا کر رومیلہ کی جانب دیکھا۔

"اب ٹھیک ہے؟" اس کے اچانک پوچھنے پر حیرت کی زیادتی سے سن ہوئی رومیلہ اچھل پڑی۔

"آپ نے کیا کیا ہے؟" رومیلہ نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو الیان جو پہلے ہی زیر لب مسکرا رہا تھا ایک دم کھل کر مسکرا دیا۔

"وہ سب چھوڑو اور یہ بتاؤ اب تو تمہیں نہیں لگ رہا کہ تمہیں کسی کی حقارت بھری نظریں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں۔"

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" رومیلہ ابھی بھی کنفیوز تھی اور اس کی حیرانی الیان کی مسکراہٹ کو اور گہرا کر رہی تھی۔

ہو گیا بس۔ تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا یوں سمجھ لو تمہارے بھائی پر ایک الزام اور لگا دیا۔

میں نے ممی ڈیڈی سے کہا آج ابرار کا فون آیا تھا حامد کا نمبر مانگ رہا تھا وہ حامد کے پورے گھر کو اپنے گھر کھانے پر بلانا چاہ رہا ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے پتا نہیں سسرال میں ہماری بیٹیوں کو ٹھیک طرح سے کھانے کو بھی مل رہا ہے یا نہیں ہم بھی دعوت کر کے کچھ کھلا پلا دیں۔" رومیلہ ششدر سی الیان کو دیکھے گئی جو اپنی بات پوری کر کے ہلکے سے ہنس دیا تھا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔

"بے فکر رہو تم پر کوئی بات نہیں آئی ہے' ممی ڈیڈی یہی سمجھ رہے ہیں کہ ابرار انہیں انڈر پریشر رکھنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے اور محض بے پر کی اڑا رہا ہے ورنہ تم پر کھانے پینے پر کوئی پابندی تو ہے نہیں۔" الیان ایسے بول رہا تھا جیسے اپنی بات سے خود ہی بہت محظوظ ہو رہا ہو پھر وہ رکا نہیں اور اسے حیران چھوڑ کر چلتا بنا۔

بنیادی طور پر تو رومیلہ کو اس کی حرکت پسند نہیں آئی چاہیے تھی اس طرح کسی کو بلیک میل کر کے اگر عزت کرائی تو کیا کرائی مگر ابھی جس الیان کو اس نے دیکھا تھا وہ اس الیان سے کس قدر مختلف تھا جسے رومیلہ جانتی تھی اور یہ حیرت اسے اور کسی موضوع پر سوچنے نہیں دے رہی تھی۔

الیان نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور یہ سب کر کے اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا بلکہ اپنے فعل پر وہ بہت مطمئن اور خوش تھا۔

جیسے جیسے وہ شاک سے باہر آتی گئی اسے اپنا آپ ہلکا ہلکا محسوس ہوتا گیا بے اختیار اس کا دل چاہا وہ ابھی الیان کے پیچھے جا کر اس کا شکریہ ادا کرے مگر الیان کا سرشار انداز بتا رہا تھا اس نے یہ سب رومیلہ سے کوئی توصیفی کلمات سننے کے لیے نہیں کیا وہ جو چاہتا تھا وہ ہو چکا تھا تبھی وہ اتنا خوش تھا۔

اس کی بھرپور مسکراہٹ یاد کر کے رومیلہ بھی غیر ارادی طور پر مسکرانے لگی دل کی دھڑکنوں کا نئی تال پر دھڑکنے کا تجربہ بڑا ہی انوکھا اور منفرد تھا اس کے لیے۔۔۔

☼ ☼ ☼
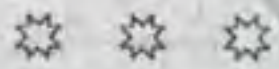
بلال اختر کا یقین بالکل صحیح ثابت ہوا تھا حمید کے والد رخشار کے گھر والوں کی طرح نہیں تھے جو پیسے لے کر خاموش ہو جاتے انہوں نے تو اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے زوبیہ کے خلاف اچھے خاصے چارجز لگا دیے تھے۔

بلال اختر نے ان سے بات کرنی چاہی مگر وہ تو کچھ سننے کے لیے ہی تیار نہیں تھے۔ بلال اختر زوبیہ کو کیس کی کارروائی ہونے تک ضمانت پر گھر لے آنا چاہتے تھے۔

مگر حمید کے والد نے اسے خطرناک پاگل بتاتے ہوئے اسے پولیس کسٹڈی میں رکھنے پر زور دیا تب بلال اختر مجبور ہو گئے جیل جانے سے تو بہتر تھا کہ وہ پاگل خانے چلی جائے حالانکہ ان کا دل کسی طور اسے ذہنی امراض کے مریضوں کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ نہیں تھا مگر صورت حال ان کے قابو سے باہر ہو گئی تھی پھر بھی انہیں امید تھی کہ جب عدالتی کارروائی شروع ہو گی تب وہ زوبیہ کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

پھر بھی یہ سب ایک دن میں ممکن نہیں تھا چنانچہ تب تک زوبیہ کو میڈیکل ہیلپ کے نام پر پاگل خانے میں ہی رہنا تھا بلال اختر نے اس کے آرام کے لیے ہر سہولت فراہم کر دی پھر بھی زوبیہ کو ایک بہت بڑا دھچکا لگا تھا پاگل خانے میں قدم رکھتے ہی' تو گویا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاگل ثابت ہو گئی ہے جب ایک بار اس کے ماتھے پر پاگل خانے کا ٹھپا لگ گیا تو اب بھلا اسے کون نارمل مانے گا۔

لوگ تو پہلے ہی اس کی ذہنی حالت کی طرف سے مشکوک رہتے تھے اب یہاں سے نکلنے کے بعد اسے سب

خطرناک پاگل ہی سمجھیں گے اور پھر پتا نہیں یہاں سے نکلنا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

زندگی میں پہلی بار وہ گھر سے دور ہوئی تھی اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا در و دیوار گرا کر ایک جست میں اپنے گھر پہنچ جائے اور اپنے بستر میں دبک کر سر تک اپنا کمفورٹر اوڑھ لے تاکہ پھر اسے کچھ پتا نہ چلے کہ اس کے کمرے سے باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کون اس کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پاگل خانے صرف فلموں میں دیکھے تھے لیکن جب وہ خود یہاں آئی تو یہاں کا ماحول اسے فلموں سے یکسر مختلف لگا ایک تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بلال اختر نے اس کا انتظام بہت بہترین اسپتال میں کرایا تھا جہاں ہر مریض کا ایک الگ کمرہ تھا اس کے باوجود ایک دوبار اس کے کمرے کے سامنے لگی گرل سے جب اس نے کسی ذہنی مریضہ کو نرس کے ساتھ جاتے یا آتے دیکھا تو وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی ایک چالیس پینتالیس سال کی عورت تو بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی اس کی چال اور حلیے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پچھلے کئی سالوں سے یہاں مقیم ہے اور اس کی ذہنی حالت بہت زیادہ خراب ہے۔

جب وہ یہاں آئی تو ایک دو نرسز نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے اندرونی خوف کے باعث کچھ بولی ہی نہیں مگر یہاں رہتے ہوئے جب اسے کچھ دن گزر گئے تو مسلسل خاموش رہتے رہتے اسے شدید قسم کی گھٹن ہونے لگی تب اس نے ایک نرس سے ہلکی پھلکی باتیں کیں۔

یہاں کا عملہ اس کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا اور پھر اس نرس کا مزاج زوبیہ کو کافی بہتر لگا تبھی زوبیہ نے اس سے اس کا نام وغیرہ پوچھا جواباً" زوبیہ کی توقع کے مطابق اس نے زوبیہ کا انٹرویو نہیں لیا بلکہ ایک دو ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہنے لگی۔

"جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا' میں تبھی سمجھ گئی تھی تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو' بس شاک میں ہو اس لیے اتنی خوف زدہ ہو' جیسے جیسے تم یہاں کی عادی ہو جاؤ گی تمہارا رویہ سارے اسٹاف کے ساتھ نارمل ہو جائے گا۔"

"مجھے یہاں کا عادی نہیں ہونا میں کوئی یہاں ہمیشہ کے لیے تھوڑی آئی ہوں بس ایک بار کیس ختم ہو جائے پھر میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔" زوبیہ فوراً" بولی تو وہ کچھ دیر بغور زوبیہ کو دیکھتے رہنے کے بعد عجیب سے لہجے میں بولی۔

"پرامید رہنا اچھی بات ہے لیکن یہاں تم آس لگا کر غلطی کر رہی ہو۔ کیونکہ جتنی جلدی تم حقیقت کو قبول کر لو گی اتنی ہی تمہیں آسانی ہو گی۔"

"میں سمجھی نہیں۔" زوبیہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایک بار یہاں آنے کے بعد کوئی واپس گھر نہیں جاتا اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔" زوبیہ سن ہوتے وجود کے ساتھ اسے دیکھے گئی پھر لڑکھڑاتے لہجے میں بولی۔

"مم... میں کوئی پاگل تھوڑی ہوں جو پاگل خانے میں رہوں گی... میں تو بالکل ٹھیک ہوں... کیا... کیا تمہیں میں پاگل... لگ رہی ہوں؟"

"نہیں پاگل نہیں۔" وہ فوراً" بولی پھر رسانیت سے کہنے لگی۔

"لیکن ایسی جگہ پر گھر اور گھر والوں سے دور رہتے رہتے انسان گھبرا جاتا ہے وہ ڈپریشن میں الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دیتا ہے پھر اسے یہاں سے شفٹ کرنا پڑتا ہے۔

مینٹل لیول کی بھی اسٹیجز ہوتی ہیں۔

یہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ بہت بہتر ہوتے ہیں جن کی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے انہیں یہاں سے دوسری جگہ شفٹ کر دیتے ہیں۔

تبھی تو میں کہہ رہی ہوں یہاں دل لگانے کی کوشش کرو اگر تم یہاں سے نکلنے کا سوچو گی تو مزید بیمار ہو گی۔"

"دل لگانے کی کوشش۔" زوبیہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے وہ تو یہاں آ کر ہی پریشان ہو گئی تھی اکثر دوسری مریضہ عورتوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں اسے خوف زدہ کر دیتیں اگر اسے اور خطرناک پاگلوں کے ساتھ بھیج دیا تو وہ واقعی پاگل ہو جائے گی۔

"ہاں دل لگانے کی کوشش سے میرا مطلب ہے خوش رہنے کی کوشش کرو' سب سے باتیں کرو اچھی اچھی کتابیں پڑھو نماز کی پابندی کرو اور اپنے لیے دعا ضرور مانگو۔

اگر تمہاری حالت میں بہتری نظر آئی تو تمہارے ساتھ بہت رعایت ہو جائے گی تمہیں اٹینڈنٹ کے ساتھ باہر گارڈن میں جانے اور بیٹھنے کی اجازت مل جائے گی اور بھی دوسری تفریحات میسر آ سکتی ہیں۔" وہ تسلی دے رہی تھی اور زوبیہ کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

گویا اسے کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی ابھی تک تو لوہے کی سلاخوں والے دروازے سے باہر جانے کا اسے خیال نہیں آیا تھا مگر اب یہ جان کر کہ وہ اس ایک کمرے میں قید ہے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

"سسٹر... کیا... کیا میں اپنی ماں سے فون پر بات کر سکتی ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں تمہارا فون پر بات کرنے کا دن اور ٹائم مقرر ہو گا بلکہ تمہارے والد نے تو تمہیں موبائل تک دیا ہے۔ مگر تم پر پولیس کیس چل رہا ہے نا' لہٰذا ابھی تمہیں موبائل دینے کی پرمیشن نہیں ہے۔" نرس اسے ریلیکس کر رہی تھی وہ اتنی ہی ہراساں ہو رہی تھی۔

وہ مما سے فون پر بات صرف مقررہ دن اور وقت پر ہی کر سکتی ہے اور کیس چلنے تک اسے موبائل نہیں مل سکتا پھر یہ کیس کب ختم ہو گا؟ اگر یہ کبھی ختم نہ ہوا تو؟ یا یہ چار پانچ سال تک چلتا رہا تو... ؟

"سسٹر... سسٹر... مجھے... مجھے ایک بات سچ سچ بتائیں یہاں کے ڈاکٹرز کی میرے بارے میں کیا رائے ہے کیا میں سب کو واقعی پاگل لگ رہی ہوں؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے میں نے کہا ہے نا تم بالکل ٹھیک ہو اب تم بالکل ریلیکس ہو جاؤ بلکہ کچھ دیر سو جاؤ تمہیں دوائی کھائے کافی دیر ہو گئی ہے اب تک تمہیں سو جانا چاہیے ورنہ تمہارا سر درد کرنے لگے گا۔" سسٹر اسے بیڈ پر لٹانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اپنا کندھا چھڑواتی اٹھ بیٹھی۔

"مجھے بہلائیں نہیں اور پلیز مجھے ٹالیں بھی نہیں' میں جانتی ہوں آپ سب مجھے پاگل سمجھتے ہیں آپ کا خیال ہے مجھے دورے پڑتے ہیں اسی لیے اب آپ مجھے سلانے پر بضد ہیں کہ میں ہائپر ہو رہی ہوں کسی بھی وقت میں اپنا ذہنی توازن کھو سکتی ہوں اور کسی پر بھی حملہ کر سکتی ہوں حالانکہ میں ایسی نہیں ہوں' پتا نہیں خرم نے میرے خلاف ایسی جھوٹی گواہی کیوں دی میں... میں... خرم سے ملنا چاہتی ہوں مجھے اس سے بات کرنی ہے۔

وہ... وہ... تو شائستہ خالہ کے بارے میں سب جانتا تھا پھر اس نے ایسا بیان کیوں دیا... اس نے تو خود شائستہ خالہ کو دیکھا ہے۔" زوبیہ زار و قطار روتے ہوئے چیخ رہی تھی اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا وہ ابھی خرم سے بات کرنا چاہتی تھی۔

مگر سسٹر نے اس کی بات ہی کب سنی تھی اس کی آواز کا والیم جیسے ہی بڑھنا شروع ہوا اس نے ایک بٹن دبا کر عملے کی دوسری عورتوں کو بلا لیا ان تین عورتوں نے مل کر اسے زبردستی ایک انجکشن لگایا اور وہ صرف دو پل میں بستر پر بے سدھ گر گئی۔

☼ ☼ ☼

رومیلہ دو ایک دن تو بہت خوش رہی کہ شگفتہ غفار نے اسے اپنے گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر سب کے برابر بیٹھنے اور

کھانے کا درجہ دے دیا۔

مگر تیسرے دن اس کی خوشی پر اوس پڑنے لگی بھلے ہی وہ زبان سے طنز کے نشتر نہیں چلا رہی تھیں مگر ان کے دل میں تو ابھی بھی یہی ہو گا نا کہ وہ ان کے گھر مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہے۔

الیان کے منع کر دینے کے بعد وہ دوبارہ جاب کی بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن آخر اس کا حل کیا تھا آج صبح جب وہ باتھ روم سے منہ دھو کر نکلی تو اس کے بیڈ پر بیس ہزار روپے رکھے تھے۔

یہ رقم یقیناً" الیان نے رکھی ہو گی اس طرح الیان سے پیسے لینا بالکل مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

اس نے نوٹ اٹھا کر الماری میں تو رکھ لیے مگر سارا دن اس پر بے زاری چھائی رہی کوئی مصروفیت بھی تو نہیں تھی اس کے پاس کہ اس کا ذہن بٹ جاتا وہ بے دلی سے کبھی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتی کبھی لان میں جا کر پودوں وغیرہ کو دیکھنے لگتی یا ٹی وی لگا کر چینلز چینج کرتی رہتی۔

البتہ شگفتہ غفار کے گھر آتے ہی وہ اپنا کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتی۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ گئی تو وہ سوتی پڑی رہی کوئی جگانے والا نہیں تھا نہ ہی خالی پڑے لق ودق گھر میں کوئی آہٹ — ہوتی تھی کہ اس کی آنکھ کھل جاتی۔

چنانچہ اپنے آپ جب وہ اٹھی تو رات کے دس بج رہے تھے وہ ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتی وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی منہ ہاتھ دھونے کی بھی زحمت نہ کی دس بجے تک تو وہ سب کھانے سے بھی فارغ ہو گئے ہوں گے اور وہ کمرے میں بند پڑی رہی۔

ابھی تین دن پہلے ہی تو ریاض غفار نے کہا تھا کھانے کے وقت خود ہی آجایا کرو مہمانوں کی طرح بلانا اچھا نہیں لگتا اور تین دن بعد ہی وہ ان کی بات نظرانداز کیے کمرے میں پڑی رہی یقیناً" ان لوگوں کو اس کی یہ بے حسی ناگوار گزری ہو گی اس سے پہلے کہ ریاض غفار کمرے میں چلے جاتے وہ انہیں اپنے بے وقت سو جانے کے متعلق بتا کر معذرت کر لینا چاہتی تھی۔

مگر وہ جب ڈائننگ روم میں پہنچی تو ٹیبل بالکل خالی تھی ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔

رومیلہ کچن کی طرف بڑھ گئی تو راستے میں ہی سرداراں مل گئی تب اس نے بتایا کہ ریاض غفار اور شگفتہ غفار تو کسی فنکشن میں گئے ہیں' رات کے ڈیڑھ دو بجے سے پہلے واپسی نہیں ہو گی اور الیان صاحب ابھی آفس سے نہیں آئے۔

"اچھا ٹھیک ہے تم بھی اپنے کمرے میں جاؤ مجھے کھانا کھانا ہو گا تو میں خود لے لوں گی۔" رومیلہ کو تھوڑا سا اطمینان ہوا تھا کہ وہ انہیں فیس کرنے سے بچ گئی۔

لیکن سرداراں کے جاتے ہی اسے بری طرح وحشت ہونے لگی۔

خالی بڑا بڑا سا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا شام میں اتنی دیر اس نے چینلز چینج کیے تھے کہ اب ٹی وی کھولنے کے خیال سے اسے اختلاج ہو رہا تھا۔

وہ لاشعوری طور پر الیان کے آنے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ آئے تو وہ الیان کے دیے پیسے بھی اسے واپس کر دے اور اس سے دو ٹوک بات کرے کہ اسے جاب کرنے کی اجازت دے دیں وہ اس کے پیسوں سے پڑھائی نہیں کرنا چاہتی۔

وہ ادھر سے ادھر پھرتے ہوئے باقاعدہ جملے ترتیب دینے لگی کہ اسے الیان کو کس طرح قائل کرنا ہے اور جب اس نے ساری تیاری کر لی تب اس کی نظر ٹی وی لاؤنج میں رکھے بڑے سے وال یونٹ پر جم گئی۔

اس میں طرح طرح کے بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز رکھے تھے ان ہی کے ساتھ ایک خانے میں شطرنج بھی

تھی۔

کانچ کے خوبصورت سیاہ اور سفید مہروں کو دیکھتی وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی چلی آئی بلا آخر اسے وقت کاٹنے کے لیے مصروفیت مل ہی گئی تھوڑی دیر بعد وہ لاؤنج میں بیٹھی دونوں طرف کی بازی اکیلے کھیلنے میں اتنی منہمک ہو گئی کہ اسے الیان کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

"ہارنے سے ڈرتی ہو کیا جو اکیلے کھیل رہی ہو۔" اس کی آواز پر رومیلہ چونک اٹھی وہ ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے دوسرے ہاتھ سے کوٹ کندھے پر ڈالے ایسے کھڑا تھا جیسے کمرے میں جاتے جاتے رک گیا ہو۔

رومیلہ کا دل چاہا کہہ دے اکیلا انسان ہر کام اکیلے ہی کرتا ہے مگر اس جملے میں بڑی مسکینیت بھری تھی اسے کہنے کا مطلب تھا وہ اس کی ہمدردیاں سمیٹنا چاہتی ہے جبکہ اسے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی تبھی اپنی فطرت کے برعکس محض ڈائیلاگ بولتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں... مغرور ہونے سے ڈرتی ہوں اس لیے اکیلی کھیل رہی ہوں۔" اس کی بات پر الیان کے چہرے پر مخصوص دلفریب مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"کچھ آتا بھی ہے یا بس مہرے آگے کر رہی ہو۔" وہ قریب آکر بساط پر بچھے مہروں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"میدان سے باہر بیٹھ کر کھلاڑیوں کی صلاحیتوں کا اندازہ مت لگائیں یہ سراسر حماقت ہے۔" رومیلہ کی جھنجلاہٹ کہیں تو نکلنی تھی۔

"ہوں گویا میدان میں کودنے کی دعوت دے رہی ہو۔" الیان نے ہاتھ میں پکڑا بریف کیس اور کندھے پر ڈالا کوٹ ایک طرف رکھ دیا اور اس کے عین سامنے آبیٹھا۔

رومیلہ کچھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی اسے نہیں پتا تھا الیان کو شطرنج کا اتنا شوق ہے کہ معمول سے اتنا لیٹ آنے کے باوجود چلتی ہوئی بازی کھیلنے بیٹھ جائے گا درمیان میں...

"کھانا کھائیں گے آپ؟" رومیلہ نے پوچھا۔

"میں تو کھا کر آرہا ہوں ہاں اگر میرے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتیں تو الگ بات ہے' ویسے بھی شطرنج میں مجھے ہرانا آسان کام نہیں ہے۔" الیان کا لہجہ صاف چیلنج کرنے والا تھا۔

"کوئی کام آسان ہوتا ہی کب ہے۔" رومیلہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی اور مہرے سیٹ کرنے ہی لگی تھی کہ الیان بول پڑا۔

"چلو یہ ادھوری بازی ہی پوری کر لیتے ہیں۔" الیان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"نہیں... اگر آپ ہار گئے تو کہیں گے جس طرف سے میں کھیلنے بیٹھا تھا اس کی پوزیشن کمزور تھی۔" رومیلہ نے اعتراض کیا۔

"میں ایسا نہیں کہوں گا کیونکہ میں ہاروں گا ہی نہیں۔" الیان نے اگلا جملہ تھوڑا رک کر کہا پھر اپنی بات پر خود ہی ہنس دیا۔

"باری کس کی ہے؟" الیان نے بغور چیس بورڈ پر پھیلے مہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تو رومیلہ نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کی۔" اس کا دل چاہ رہا تھا وہ الیان سے پوچھے کہ کیا اس کے رویے میں واقعی تبدیلی آگئی ہے یا یہ اس کا وہم ہے۔

شادی کے شروع کے چند دنوں میں الیان اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا کبھی مصلحتاً" بات کرنی پڑتی تو بھی اس کے چہرے پر اتنی بے زاری ہوتی تھی کہ رومیلہ کو شرمندگی ہونے لگتی تھی۔

مگراب وہ نا صرف اس سے بات کررہا ہوتا ہے بلکہ اس کا مزاج بھی بہت دوستانہ ہوتا ہے، بہت خوش مزاجی سے وہ اس کے ساتھ پیش آرہا ہوتا ہے۔ تو آخر اس بدلاؤ کی وجہ کیا ہے؟

وہ تو اسے ابرار بھائی کی طرح دھوکے باز اور فراڈی سمجھتا تھا پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے والدین اور بہن کا رویہ ہنوز ہونے کے باوجود اس کا رویہ اس قدر تغیر کا شکار ہو گیا ہے وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھی وہ جانتی تھی زندگی کوئی رومینٹک افسانہ نہیں تھی جہاں زبردستی کی گئی شادی بھی وقت گزرنے کے ساتھ محبت میں بدل جائے۔

الیان اس کی زلف کا اسیر ہوا تھا نہ اس کی خاموش احتجاج پر شرمندہ، پھر کیوں وہ باقی گھر والوں کی طرح اس سے نفرت نہیں کررہا۔

"کیا بات ہے؟" الیان نے شطرنج پر خوب غور و غوض کرنے کے بعد اپنی طرف سے چال چلی اور جیسے ہی نظر اٹھا کر دیکھا رومیلہ کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔

"آج صبح میرے بیڈ پر پیسے....."

"ہاں میں نے رکھے تھے۔" الیان نے اس کی بات کاٹ دی اور مزید کہنے لگا۔

"میں تمہارے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا مگر ٹائم ہی نہیں مل رہا تھا آج بھی مجھے یقین تھا کہ میں لیٹ آؤں گا تب تک تم اپنے کمرے میں چلی گئی ہو گی، صبح پھر میں جلدی میں نکل جاتا ہوں اس لیے صبح تمہارے کمرے میں رکھ کر چلا گیا تھا۔ تمہیں اگر وہ پیسے کم لگیں تو اور بھی لے سکتی ہو بلکہ....."

"وہ پیسے کم نہیں ہیں، بہت زیادہ ہیں مگر وہ میرے مسئلے کا حل نہیں ہیں، میں آپ کی والدہ کو اپنے یہاں رہنے اور کھانے پینے کا خرچ تو نہیں دے سکتی نا بات تو پھر وہی رہی نا کہ میں مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہوں۔" رومیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم چاہو تم ممی سے کہہ دو کہ تمہیں تمہارے خرچ کے پیسے تمہارے والد دیتے ہیں تم اس میں سے اپنا کھانا پینا کرو گی، لیکن ایک بات یاد رکھنا یہ بات ممی کو بہت بری لگے گی ہاں، تمہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اس لیے تم ان پیسوں کو رکھو اور آرام سے خرچ کرو اگر ممی تم سے کچھ پوچھیں تو کہہ دینا تمہارے والد نے دیے ہیں۔

بلکہ اس صورتِ حال میں تم اپنی پڑھائی بھی آسانی سے اسٹارٹ کر سکتی ہو جو بھی اخراجات ہوں گے میں دے دوں گا اور یہ بات صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گی تم پر ممی کا کوئی احسان نہیں ہو گا۔" الیان سمجھانے والے انداز میں بولا تو رومیلہ برجستہ بولی۔

"لیکن آپ کا تو ہو گا نا۔" الیان چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تو رومیلہ بھی شطرنج کی طرف متوجہ ہو گئی کچھ دیر سوچنے کے بعد جب اس نے اپنا مہرہ آگے بڑھا دیا تب اس نے الیان کو کہتے سنا۔

"شادی چاہے جن حالات میں بھی ہوئی ہو، جب تک تم میرے نکاح میں ہو میری ذمہ داری ہو۔" رومیلہ چونک کر اسے دیکھنے لگی جو رومیلہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری ساری جائز ضرورتیں پوری کرنا میرا فرض ہے اس لیے احسان کے متعلق سوچنا بھی نہیں بلکہ سنجیدگی سے یونیورسٹی جانا شروع کرو، سارا دن گھر میں بے کار بیٹھے رہنے سے بہتر ہے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ اب دیکھو نا ایک دو مہینے بعد جب تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو بقول تمہارے، تمہارے بابا اور بھائی تمہیں خود سر اور ضدی سمجھ کر تم سے ناراض ہو جائیں گے تب تم کیا کرو گی۔" الیان بڑی روانی سے بول رہا تھا۔

رومیلہ گم سم سی اسے دیکھتی رہی ابھی کچھ دیر پہلے الیان نے اسے جو کہا تھا وہ ابھی اس احساس سے باہر بھی

نہیں نکلی تھی کہ الیان نے نکاح ختم ہونے اور یہاں سے چلے جانے کا تذکرہ کر دیا۔

وہ تو جیسے لحہ بھر میں عرش پر پہنچ کر واپس فرش پر آگری تھی۔

"پتا نہیں کل کو بھائی بھابھی کا رویہ کیسا ہو، اپنی پڑھائی ختم کرکے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو تاکہ اب کی بار جب تمہارا گھر بسانے کا وقت آئے تو ابرار نہیں بلکہ تم خود فیصلہ کرو۔" اس پل بیک وقت رومیلہ کو کئی چیزوں کا ادراک ہوا۔

اس نے یہ تو سوچا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی لیکن یہاں سے جانے کے بعد زندگی ختم نہیں ہو گی یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے یہ تو سوچا تھا کہ الیان اسے کبھی بیوی نہیں مانے گا لیکن وہ تو اسے دل و جان سے شوہر مان چکی ہے یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے یہ تو سوچا تھا کہ الیان نے اس کے یہاں سے چلے جانے والی بات پر یقین کر لیا ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکی یا بریرہ کا گھر نہ بچا سکی تب وہ الیان سے آنکھ کیسے ملائے گی یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اسے خاموش دیکھ کر الیان کو لگا وہ کسی سوچ میں گم ہے تب ہی چونکاتے ہوئے بولا۔

"چلو تمہاری باری ہے۔" رومیلہ خالی خالی نظروں سے شطرنج کے مہروں کو دیکھنے لگی جو اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے رومیلہ نے خاموشی سے ایک مہرہ آگے کر دیا تو الیان بے ساختہ بولا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تمہارا "رخ" پٹ جائے گا۔" رومیلہ گہرا سانس کھینچتے ہوئے گیم پر دھیان دینے لگی۔

"پٹتا ہے تو پٹ جائے آپ نے بتایا کیوں۔"

"ایسی غلطیاں کرکے بچوں والا کھیل کھیلنا مجھے پسند نہیں، میں تو سمجھ رہا تھا تمہیں اچھی شطرنج آتی ہو گی تب ہی بیٹھ گیا تھا۔" رومیلہ نے ساری سوچوں کو جھٹکتے ہوئے پوری توجہ شطرنج پر مرکوز کر دی۔

"میں اچھا کھیلوں یا برا لیکن میں کھیل میں کسی کی مدد نہیں لیتی لہٰذا اس "رخ" کو پٹنے دیں۔" الیان نے اس کی بات پر لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور اس کا ایک مہرہ پیٹ کر سائیڈ میں رکھ دیا۔ رومیلہ اب مزید کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے پورے دھیان سے کھیلنے لگی جب ہی تھوڑی دیر بعد اس نے الیان کی غلطی کو پکڑ لیا۔

"اب آپ غلط چال چل رہے ہیں آپ نے گھوڑے کو یہاں رکھ دیا ہے اس سے آپ کا وزیر خطرے میں آگیا ہے۔" رومیلہ نے بڑے جوش سے بتایا تو الیان چونکے بغیر بولا۔

"ارے ہاں یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں، خیر میں بھی تمہاری طرح مدد نہیں لوں گا لہٰذا اس "وزیر" کو پٹنے دو۔"

"آپ وزیر کو پٹنے کے لیے چھوڑ رہے ہیں حالانکہ کہا جاتا ہے وزیر کے پٹنے سے آدھی مات ہو جاتی ہے۔" رومیلہ حیرانی سے بولی۔

"اب جو ہونا تھا سو ہو چکا۔" الیان نے لاپرواہی سے کہا تو رومیلہ مشکوک انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"کہیں آپ اس وزیر کو جان بوجھ کر تو نہیں پٹوا رہے۔" رومیلہ کبھی اسے اور کبھی شطرنج پر بچھے مہروں کو دیکھنے لگی۔

"اس کے پٹنے سے آپ کو کیا فائدہ ہے آپ نے اسے کیوں چلا ہے۔"

"ارے یار تمہیں جو چال چلنی ہے چلو یہ کیوں سوچ رہی ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔" الیان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"اگر یہ پتا چل جائے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں تو میرا کھیل آسان ہو جائے گا نا۔" رومیلہ نے ایک نظر الیان

پر ڈالتے ہوئے بڑے گہرے لہجے میں کہا مگر الیان شاید سمجھا نہیں تب ہی خاموش رہا اور آخر کچھ دیر بعد رومیلہ نے اس کا وزیر پیٹتے ہوئے کہا۔

”سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے اسے کیوں پٹنے دیا بہرحال میں اتنا گولڈن چانس مس نہیں کرسکتی۔“ رومیلہ نے مہرہ چیس بورڈ سے اٹھا کر سائیڈ میں رکھ لیا۔

الیان کچھ دیر صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے آرام دہ حالت میں بیٹھا بورڈ کو دیکھتا رہا پھر سیدھا ہوتے ہوئے اس نے بڑے سکون سے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

”چیک اینڈ میٹ (شہ اور مات)۔“ رومیلہ چونک اٹھی اس کا بادشاہ واقعی خطرے میں آگیا تھا ابھی وہ غور بھی نہیں کرپائی تھی کہ الیان اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

”ارے ارے آپ کہاں جارہے ہیں ایک منٹ مجھے سوچنے تو دیں۔“

”تمہیں جتنی دیر سوچنا ہے سوچو میں ذرا چینج وغیرہ کرلوں مجھے نیٹ پر تھوڑا کام کرنا ہے۔“

”ارے واہ آپ یہاں سے ہٹ گئے تب اگر میں نے کوئی چال سوچی تو آپ یہی کہیں گے نا کہ میں نے بے ایمانی کی ہے۔“ رومیلہ چیس بورڈ کو دیکھتے ہوئے جلدی جلدی بولی تو الیان بے اختیار ہنس دیا۔

”تم کوئی بے ایمانی کرہی نہیں سکتیں۔“ رومیلہ چال سوچنے میں اتنی مصروف تھی کہ اس کے جملے پر دھیان ہی نہ دے سکی جبکہ الیان اپنی جگہ سے ہٹ کر زمین پر رکھا بریف کیس اٹھانے لگا۔

”ارے میں کہہ رہی ہوں نا آپ رکیں تو سہی۔ مجھے سوچنے تو دیں کیا پتا ابھی بھی کوئی راستہ باقی ہو۔“ رومیلہ تیزی سے بولی۔

”سارے راستے بند ہوچکے ہیں دیکھو۔“ الیان نے کوٹ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور کھڑے کھڑے ہی ذرا سا جھک کر انگلی مختلف خانوں میں رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ دیکھو یہ میرے گھوڑے کا گھر ہے یہاں تمہارا بادشاہ نہیں آسکتا۔ یہ فیلے کا گھر ہے اور یہ رخ کا۔ تمہارے پاس اب کوئی گھر نہیں ہے تم ہار چکی ہو ایکسیپٹ دا فیکٹ (accept the fact)۔“ الیان کہتا واپس مڑ گیا۔

رومیلہ اس کی بات پر غور کرتی رہی اس کے پاس واقعی اب کوئی گھر نہیں تھا اور جب اس نے واقعی قبول کرلیا کہ وہ ہار گئی ہے تب وہ نظریں اٹھا کر خود سے دور جاتے الیان کو دیکھنے لگی۔

وہ دوسری منزل پر جاتی سیڑھیاں چڑھنا شروع ہوگیا تھا رومیلہ نے اس کی پشت پر نظریں جمائے جمائے صرف ایک مہرے کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسرے خانے میں رکھ دیا اور بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”ایک منٹ الیان کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ایک گھر ابھی بھی باقی ہے۔“ الیان سیڑھیوں پر رک کر تھوڑا سا مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”مذاق مت کرو مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔“

”صرف ایک نظر آکر دیکھ لیں۔“ الیان نے ایک گہرا سانس کھینچا اور سست روی سے چلتا ایک بار پھر اس کے سامنے آکھڑا ہوا انداز ایسا تھا جیسے بیٹھنے کا ارادہ نہ ہو مگر کچھ دیر شطرنج کے مہروں پر غور کرنے کے بعد وہ رومیلہ کو دیکھنے لگا جس نے اپنے بادشاہ کو ایک محفوظ خانے میں رکھ لیا تھا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا یہاں سے مت ہٹیں ورنہ آپ کہیں گے کہ میں نے بے ایمانی کی ہے۔“ رومیلہ نے کندھے اچکائے۔

”نہیں خیر یہ تو میں نہیں کہہ رہا لیکن۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں یہ گھر کیسے رہ گیا۔“ الیان ایک بار پھر کوٹ ایک

جانب ڈال کر اس کے روبرو بیٹھ گیا۔

مگر اب بازی پلٹ چکی تھی تھوڑی دیر بعد رومیلہ نے ایک مہرہ اس کے بادشاہ کے سامنے رکھتے ہوئے اسے مات دے دی تو الیان کچھ دیر بورڈ کو دیکھتے رہنے کے بعد ایک دم مسکرا دیا۔

”بہت اچھا کھیلتی ہو تم ٹائم ہوتا تو ایک بازی اور کھیلتے خیر پھر کبھی سہی۔“ الیان اٹھنے لگا تو رومیلہ بول پڑی۔

”اتنی آسانی سے ہار مان لی آپ نے یہ سوچا بھی نہیں کہ ایک جیتی ہوئی بازی میں کیسے ہار گیا۔“ الیان ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ ہارے نہیں ہیں میں نے واقعی بے ایمانی کی تھی۔“ رومیلہ نے دھیرے سے کہا تو الیان کچھ زچ ہونے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا اسے اپنا وقت ضائع ہونے پر کوفت ہورہی تھی۔

”جیت ہی گئی تھیں تو بتایا کیوں۔“

”کیونکہ اس طرح جیتنے کا کوئی فائدہ نہیں‘ جب میں یہ جانتی ہوں کہ یہ جیت نہیں ایک جھوٹ ہے تو میں اس جیت پر خوش کیسے ہوسکتی ہوں‘ ایسی خود فریبی پر جشن کوئی اندر سے خالی اور کھوکھلا انسان ہی منا سکتا ہے۔“ رومیلہ کہتی چلی گئی۔

”جب تم اندر سے خالی اور کھوکھلی نہیں ہو تو پھر بے ایمانی کی کیوں؟“ الیان منہ بناتے ہوئے اٹھ گیا۔

رومیلہ صرف اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئی۔

اس نے بے ایمانی نہیں کی تھی صرف الیان کو آزمایا تھا کہ کیا وہ اس جھوٹ پر اس حد تک یقین کرسکتا ہے کہ اپنی شکست قبول کرلے اور اس آزمائش کے نتیجے کو دیکھ کر جہاں رومیلہ کو حیرانی ہوئی تھی وہیں ایک عجیب سی خوشی بھی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆
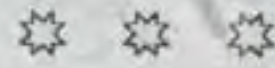
اپنے موبائل پر ایک نامانوس نمبر دیکھ کر خرم نے سوچا پہلے تو لائن کاٹ دے مگر پھر جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے کال ریسیو کرلی مگر دوسری طرف ایک انجانی نسوانی آواز سن کر الجھ گیا۔

”کیا آپ خرم حسن ہیں؟“

”جی ہاں آپ کون؟“

”دیکھیں میں آپ کو اپنا نام نہیں بتانا چاہتی میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ میں اس اسپتال سے بول رہی ہوں جہاں زوبیہ ایڈمٹ ہے۔“ وہ یہ کہہ کر لحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئی جبکہ خرم پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”زوبیہ کی حالت کافی بگڑ گئی ہے وہ آپ سے ایک بار ملنا چاہتی ہے۔

لیکن یہ کیونکہ ایک پولیس کیس ہے لہٰذا کوئی بھی اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا مگر مجھے لگتا ہے آپ سے بات کرکے اور مل کر اسے تھوڑا سکون ملے گا اگر ہوسکے تو اسپتال آجائیے گا اور یہ مت بتائیے گا کہ کسی نے آپ کو یہاں سے فون کرکے بلایا ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے لائن ڈسکنیکٹ کردی۔

تو خرم کتنی ہی دیر موبائل کان سے لگائے کھڑا رہا اور پھر بغیر یہ سوچے کہ یہ ایک پولیس کیس ہے اور اس معاملے سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔ خرم ویٹنگ آورز میں زوبیہ سے ملنے مینٹل اسپتال چلا گیا۔

اس کی توقع کے برعکس اسے زوبیہ سے ملنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی جب اس نے ریسپشن پر جا کر کہا

کہ وہ زوبیہ اختر سے ملنا چاہتا ہے تب فوری طور پر تو اسے منع کر دیا گیا لیکن پھر جب اس نے اپنا نام وغیرہ بتایا تو اس نے انٹر کام کر کے پوچھا اور ایک وارڈ بوائے کی رہنمائی میں اسے اندر بھیج دیا۔

خرم ایک ایسے کمرے میں آگیا جہاں ایک کھڑکی میں گرل لگی ہوئی تھی اور اس کے دوسری جانب کرسی اور میز رکھی تھی خرم کو ایسا لگا وہ کسی جیل میں قید قیدی سے ملنے آیا ہے اور واقعی تھوڑی دیر بعد زوبیہ سفید پاجامہ اور شرٹ میں ملبوس کسی قیدی کی طرح اس کرسی پر آ بیٹھی جو گرل کے دوسری جانب لگی تھی۔

"تم واقعی یہاں ہو یا باقی چیزوں کی طرح یہ بھی میرا وہم ہے۔" زوبیہ بالکل خالی اور ویران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سپاٹ انداز میں بولی۔ وہ شکل سے اتنی کمزور اور مضمحل لگ رہی تھی کہ خرم کو اسے دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو خرم کیا تمہیں نہیں پتا کہ میں خطرناک پاگل ہوں میں کسی پر بھی جان لیوا حملہ کر سکتی ہوں میرا آزادانہ گھومنا لوگوں کے لیے خطرناک ہے

میں اسی قابل ہوں کہ مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا جائے اگر وہ کمرہ جیل نہیں ہو سکتا تو کوئی بات نہیں یہاں کے پاگل خانوں میں بہت جگہ ہے مقصد صرف مجھے قید کرنا ہے وہ نہیں تو یہ سہی۔"

زوبیہ خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی پھر ایک دم آنکھوں کو تھوڑا سا چندھیاتے ہوئے خرم کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"کیا تم نے واقعی مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں شائستہ خالہ کی روح نظر آتی ہے یا یہ محض وہم ہے کہ میں نے تمہیں ایسا کہتے ہوئے سنا۔" پھر وہ ایک دم چونک کر خرم کو دیکھنے لگی جیسے ابھی ابھی اسے کوئی خیال آیا ہو۔

"تم نے میرے خلاف گواہی اس لیے دی ہے کہ واقعی میں نے حمید نامی شخص پر حملہ کیا تھا یا تمہیں بھی سوئمنگ پول کی تہ میں شائستہ خالہ کی روح نظر آئی تھی مگر تم نے سوچا کہیں لوگ مجھے بھی زوبیہ کی طرح پاگل نہ سمجھ لیں اس لیے شائستہ خالہ کا نام لینے کی بجائے زوبیہ کا نام لے لوں۔" خرم خاموشی سے اسے دیکھے گیا تو وہ ایک بار پھر سپاٹ سے لہجے میں کہنے لگی۔

"میں صرف سچ سننا چاہتی ہوں خرم مجھے صرف سچ جاننا ہے چاہے وہ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔ کیا تم نے کبھی شائستہ خالہ کی روح کو دیکھا ہے یا تم بھی اوروں کی طرح مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔"

خرم کو پچھتاوا ہونے لگا۔ وہ یہاں آیا ہی کیوں تھا ایک بار پھر اس کا ضمیر اسے بری طرح ملامت کرنے لگا۔

اتنے دنوں سے پاگل خانے کے گھٹے ہوئے ماحول میں رہتے رہتے اس کی ذہنی حالت اور بھی ابتر ہو گئی تھی۔

وہ بیک وقت کئی شاک سے گزر رہی تھی۔

خود پر پولیس کیس بننے کا شاک۔

اپنے قاتل ہونے کے الزام کا شاک۔

اپنے پاگل خانے میں بھرتی ہونے کا شاک۔

اور سب سے بڑھ کر خرم کا اپنے خلاف گواہی دینے کا شاک۔

اتنی ساری باتوں کو وہ کیسے جھٹلاتی لہٰذا وہ شدید قسم کی بے یقینی کا شکار تھی اور اسے ان تمام شاک سے نکالنا اشد ضروری تھا۔ چنانچہ خرم شرمندہ ہونے کے باوجود حمید پر کیے حملے کی تفصیل سے اسے آگاہ کرنے لگا اور ساری بات تفصیل سے بتانے کے بعد کہنے لگا۔

"میں نے تم سے واقعی جھوٹ بولا تھا مجھے شائستہ خالہ کی روح کبھی نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی شائستہ خالہ کی روح کبھی نظر نہیں آئی کیونکہ ایسی کوئی روح ہے ہی نہیں۔

تمہاری شائستہ خالہ کے ساتھ جو بھی ہوا ہو اس کا تعلق حمید وغیرہ سے نہیں ہے حمید پر اور اپنی دوست رخسار پر بھی شائستہ خالہ کی روح نے حملہ نہیں کیا بلکہ یہ سب تم نے خود کیا ہے مگر تم جو کرتی ہو وہ تم خود بھی بھول جاتی ہو۔ تمہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ تم کیا کر......"

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔" زوبیہ کا لہجہ پہلے سے دس گنا زیادہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

خرم کتنے ہی لمحوں تک کچھ بولنے کے قابل نہ ہو سکا تو زوبیہ خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی۔

"کیا تم بھی مجھے اپنے کسی مقصد کے تحت استعمال کر رہے تھے اگر ایسی بات ہے تو شائستہ خالہ نے کبھی تم پر حملہ کیوں نہیں کیا وہ تو رخسار کا سر پھاڑ چکی ہیں مجھے بے وقوف بنانے کے جرم میں۔" خرم صرف اسے دیکھتا رہا۔

تب ہی وارڈ بوائے نے آکر ٹائم ختم ہونے کی اطلاع دی تو اپنی جگہ سے بغیر کچھ کہے اٹھ گیا۔

اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی کب 'اتنا تو وہ سمجھا چکا تھا زوبیہ کو کہ شائستہ خالہ کی روح کچھ نہیں کرتی جو کچھ بھی کرتی ہے وہ زوبیہ خود کرتی ہے اب تک زوبیہ کو پتا ہی نہیں تھا کہ خرم اسے بے وقوف بنا رہا ہے تو پھر بھلا وہ حملہ کیسے کرتی۔

مگر وہ کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے باہر نکل آیا۔

یہاں آتے وقت اس کا ذہن جتنا الجھا ہوا تھا یہاں سے نکلتے وقت اس کا ذہن اس سے بھی زیادہ منتشر ہو گیا تھا۔

اسپتال سے باہر نکل کر جب وہ اپنی گاڑی تک آیا تو پارکنگ میں اپنی گاڑی کو نہ پا کر گنگ رہ گیا۔

اس نے بے اختیار ادھر ادھر دیکھا مگر اس کی گاڑی کہیں بھی نہیں تھی تب ہی ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"آپ اپنی ریڈ کلر کی اسپورٹ کار کو ڈھونڈ رہے ہیں؟" خرم نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ اسے جانتا تھا مگر کہاں دیکھا تھا یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"آپ نے اپنی گاڑی غلط جگہ پر کھڑی کی تھی اسے ٹریفک پولیس اٹھا کر لے گئی ہے۔" خرم بے اختیار نو پارکنگ کے بورڈ کو دیکھنے لگا جس کے عین سامنے خرم نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔ اپنی لاپروائی اور ذہن کے غیر حاضر ہونے پر وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

"فکر مت کریں پولیس اسٹیشن سے آپ کو آپ کی گاڑی مل جائے گی۔" اسی شخص نے تسلی دی تو خرم بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

"مل تو جائے گی مگر میں اس وقت کسی دردسری میں نہیں پڑنا چاہ رہا۔" ذہن پہلے ہی شل ہو رہا تھا اب پولیس سے مغز ماری کرنے کے خیال سے وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کھڑا ہو گیا۔

"دردسری میں تو آپ پڑ ہی چکے ہیں اب جتنی تاخیر کریں گے اتنی ہی گاڑی مشکل سے ملے گی۔" وہ شخص اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے بولا تو خرم پلٹ کر بغور اسے دیکھنے لگا۔

اچانک اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے تب ہی بے اختیار بولا۔

"آپ رومیلہ کے ہزبینڈ ہیں نا۔" الیان گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا۔

"کیا ہم مل چکے ہیں۔" الیان نے پوچھا۔

"باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی لیکن میں آپ کی شادی میں آیا تھا۔" خرم نے کہا۔

"آپ رومیلہ کے رشتے دار ہیں؟"

"نہیں رشتے داری تو کوئی نہیں ہم ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتے ہیں۔" خرم کو کہتے ہی خیال آیا جانے رومیلہ کا شوہر کس ذہنیت کا ہو وہ خرم اور رومیلہ کے بیچ کوئی گہری دوستی سمجھ کر اس سے بدگمان ہو جائے۔ خرم وضاحت دیتے ہوئے کہنے لگا۔

عنیقہ محمد بیگ

خواب جاگی آنکھیں

"دراصل میں اس کی کزن نمل میری منگیتر ہے اسی حوالے سے رومیلہ نے مجھے بھی شادی میں انوائیٹ کرلیا تھا۔"

"آپ نمل کے منگیتر ہیں؟" الیان کی آنکھوں میں واضح طور پر حیرانی تھی تو خرم نے صرف سر اثبات میں ہلا دیا۔

جب سے الیان نے نمل کے متعلق سنا تھا وہ اس سے ملنے کا سوچ رہا تھا۔ تاکہ نمل سے ابرار کے کینیڈا میں مقیم دوست جعفر اور گلفام کے فرضی نام والے شخص کے متعلق معلومات حاصل کرسکے مگر اس کی مصروفیات اسے رومیلہ سے بات کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھیں۔

اب اچانک نمل کے منگیتر کو سامنے دیکھ کر وہ چونک اٹھا تھا۔

الیان کو سوچوں میں گم دیکھ کر خرم بغیر کچھ کہے آگے بڑھنے لگا تو الیان نے پکار لیا۔

"آپ کہیں تو میں آپ کو پولیس اسٹیشن لے چلوں۔"

"نہیں اس وقت میرا کوئی ارادہ نہیں پولیس کے منہ لگنے کا ابھی تو میں سیدھا گھر جاؤں گا۔" خرم نے بے دلی سے کہا۔

"تو میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔" الیان کی آفر پر خرم نے کچھ لمحے سوچا پھر کندھے اچکاتا اس کی گاڑی کے قریب آگیا۔

سارے راستے ان کے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی خرم کے بتائے ایڈریس پر پہنچنے کے بعد جب خرم نے گاڑی ایک بڑے سے براؤن گیٹ کے اندر لے جانے کو کہا تب الیان چونک اٹھا۔

"تم اس گھر میں رہتے ہو؟"

"ہاں... کیوں کیا ہوا؟"

"نہیں... کچھ نہیں اچانک اس گھر کو اتنے قریب سے دیکھ کر تھوڑا چونک گیا تھا۔" الیان مسکرایا مگر خرم کی سمجھ میں اس کی مسکراہٹ بالکل بھی نہ آئی وہ حیرانی سے الیان کو دیکھنے لگا جو بڑی دلچسپی سے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرت کو دیکھتے ہوئے الیان کہنے لگا۔

"کسی زمانے میں ہم اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان فیکٹ میں اس گھر میں پیدا ہوا تھا۔" الیان اب بھی بڑے خوش گوار تاثرات لیے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس گھر سے وابستہ چھوٹی چھوٹی باتیں اسے ابھی بھی یاد ہوں۔

"لیکن یہ تو بلال اختر کا آبائی گھر ہے وہ باپ' دادا کے زمانے سے یہیں رہتے تھے۔" خرم بے یقینی سے بولا۔

"بلال اختر میری دادی کے پڑوسی تھے بلال اختر کے والد نے میری دادی سے ان کا گھر خرید کر اپنے گھر سے ملا لیا اور اتنی اچھی رینوویشن کرائی کہ اب لگتا ہی نہیں کہ یہ دو گھر ہیں۔" الیان نے بتایا پھر ایک دم چونکتے ہوئے بولا۔

"اگر تم اس گھر میں رہتے ہو تو پھر تو تم وہی ہو گے جس کی گواہی پر زوبیہ مینٹل اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی ہے۔" جتنی حیرانی سے الیان' خرم کو دیکھ رہا تھا خرم کی آنکھوں میں بھی الیان کے لیے اتنی ہی حیرت تھی۔

"تم زوبیہ کو کیسے جانتے ہو۔"

"زیادہ جانتا تو نہیں لیکن وہ میری پھوپھی کی بیٹی ہے۔" خرم بری طرح چونک اٹھا۔

"پھر تو تم شائستہ خالہ کو بھی جانتے ہو گے۔"

(باقی آئندہ)
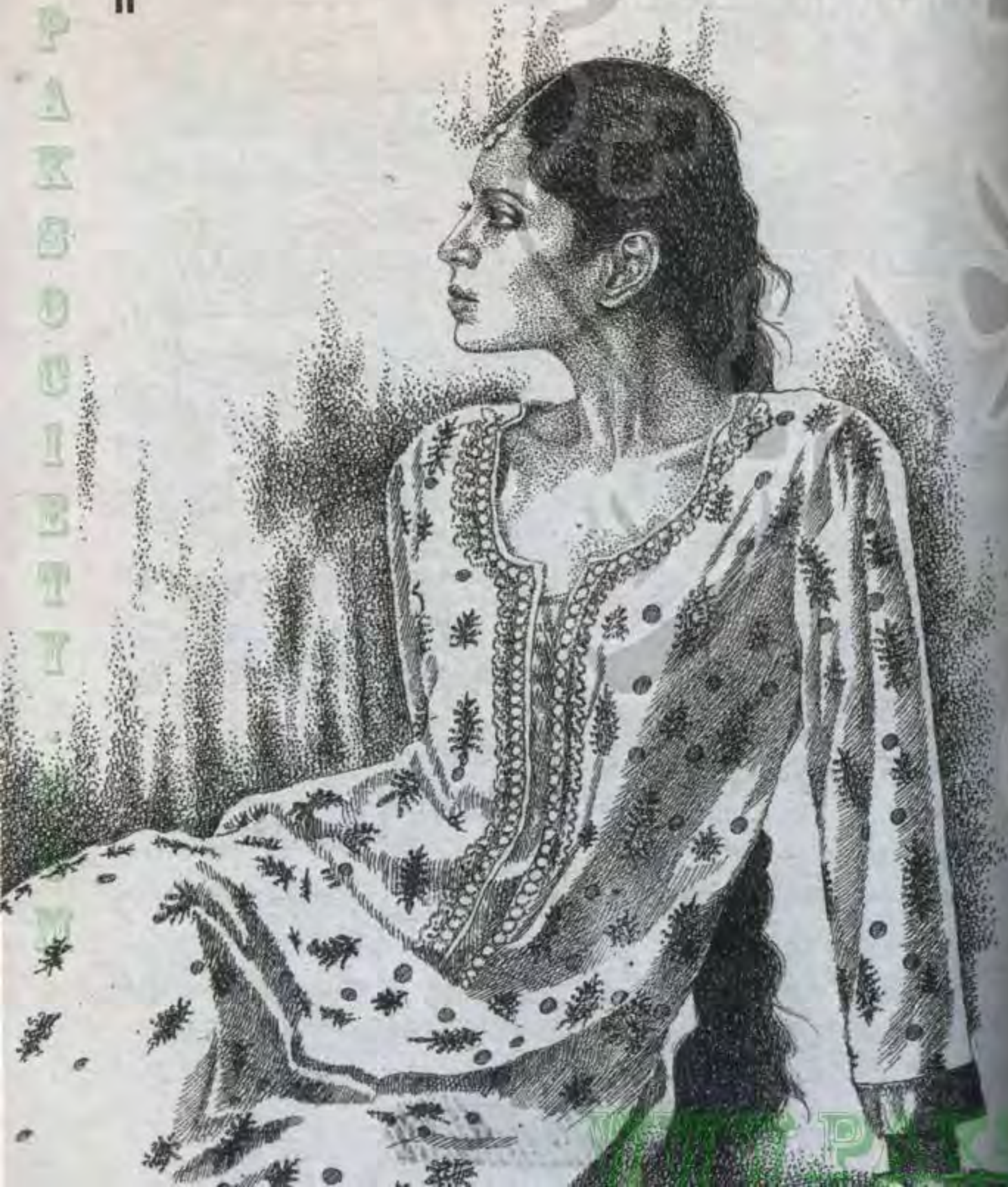
صبح کا سورج آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ابھی ساتھ چل رہی تھی۔ سکینہ صحن کے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں..... کرن باورچی خانے سے چائے کے کپ سمیت باہر نکلی اور اس نے چائے کا کپ ماں کی طرف بڑھایا۔

"اماں..... چائے!"

سکینہ جو آنکھیں بند کر کے تسبیح پر سکون سے کچھ پڑھ رہی تھیں..... انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی ان لوگوں کے لیے ناشتا تیار کر دیا کیا؟" وہ ماں کے پاس تخت پر بیٹھ کر بولی۔

"جی اماں..... پراٹھے بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیے ہیں آملیٹ کے لیے آمیزہ تیار کر لیا جب وہ لوگ آئیں گے تو چائے کا پانی رکھ دوں گی۔"

سکینہ چائے کا سپ لے کر بولیں۔

"رات کا آلو کا سالن بھی رکھ لیتا اور سوچ رہی ہوں کہ دہی بازار سے لے آؤں۔"

"اماں رہنے دیں ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے ان لوگوں کی شاہی مہمان نوازی کریں کرائے دار ہیں ہمارے سگے تھوڑی ہیں۔" وہ ماں کی دہی والی بات پر بے زار سی ہوئی۔

"بیٹی ضرورت تو ہمیں بھی ان لوگوں کی ہے ہمارے اچھے رویے کی وجہ سے تو ان لوگوں نے گھر کرائے پر لیا ہے۔" سکینہ نے فکر مندی سے جواب دیا۔

وہ خفگی سے اپنے ناخنوں پر لگی نیل پالش کریدتے بولی۔

"ہمیں نہیں بلکہ ان لوگوں کو ہماری زیادہ ضرورت ہے اتنا اچھا گھر اتنے کم کرائے پر مل رہا ہے ان کی تو لاٹری لگ گئی۔" اس نے نیل پالش کے سوکھے ذرے جو اس کی قمیص پر جا پڑے انہیں جھاڑتے ہوئے ماں کی طرف دیکھتے جواب دیا۔ سکینہ مسکرانے لگیں۔ وہ ماں کی مسکراہٹ پر تپ سی گئی۔

سکینہ نے چائے کا آدھا کپ تخت پر سنبھال کر رکھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

"کرن بیٹی زندگی کا سفر تو ضرورتوں پر چلتا رہے گا اور یہ ضرورتیں موت تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں تیری ماں کی جمع پونجی آخر کب تک چلے گی۔"

وہ ماں کے افسردہ ہونے پر جھٹ سے بولی۔

"آپ بھی تو مجھے ملازمت کرنے نہیں دیتی ہیں۔"

سکینہ نے چائے کا کپ دوبارہ اٹھالیا اور آہ بھری۔

"اماں آپ مجھے ملازمت کرنے دیں۔" وہ پیار سے بولی۔

"بیٹی یہ معاشرہ ملازمت کرنے والی لڑکیوں کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان لڑکیوں سے لڑکے بھی شادی کرنے سے کتراتے ہیں پھر میں کیسے۔" سکینہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کرن خفا سی ہو گئی۔

"اماں ایسی بھی بات نہیں۔ ایسی ہزار کیا لاکھوں لڑکیاں ہیں جو ملازمت کر کے اپنے گھر کا چولہا جلا رہی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے واقف تھی۔ اس کی ماں نے آدھا پورشن کرائے پر اس لیے دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ اس کی شادی کی رقم محفوظ رہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روز مرہ کے خرچ پر صرف ہونی شروع ہو چکی تھی۔

سکینہ نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور آہ بھر کر بولیں۔

"بیٹی میں نے تیرے ابا کے مرنے کے بعد ملازمت کی شادی شدہ ایک بیٹی کی ماں تھی مگر زمانے کی نگاہیں مجھ پر اٹھنے سے باز نہ آئیں پھر کیسے میری بچی تجھے باہر جانے کی اجازت دے دوں۔" سکینہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"میرا دل گھبراتا ہے میری بچی اس دنیا میں تیرے سوا میرا کون ہے۔" سکینہ نے اپنے پلو سے آنسو پونچھتے اپنے دل کا ڈر ظاہر کیا۔

اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا "اماں آپ پریشان نہ ہوں میں تو آپ کی پریشانی دور کرنے کے لیے ملازمت کا سوچتی ہوں میں آپ کو فکر مند نہیں دیکھ سکتی۔"

اس نے ماں کی پیشانی چومی۔ جو بہت گھبرائی سی دکھائی دیکھنے لگی تھیں۔

"مجھے صرف تیری شادی کی فکر ہے تو اپنے گھر کی ہو جائے گی تو میری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ میں تو کرائے داروں سے ڈرتی رہی ہوں مگر سونے کے سکوں سے بھرا ایک کنواں بھی ہو تو..... ایک ایک سکہ اٹھانے سے وہ بھی ختم ہو جاتا ہے اس لیے بچی تیری خاطر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"ہاں اماں آپ سچ کہتی ہیں بس فکر کرنا چھوڑ دیں اللہ سب ٹھیک کر دے گا میں اوپر کے پورشن کی صفائی کر لیتی ہوں کل رات زور کی آندھی جو چلی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جیتی رہو جاؤ جلدی کرو وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔" سکینہ خوش ہو کر بولیں۔

وہ مسکراتی چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سکینہ نے پھر سے تسبیح کے دانے گرانے شروع کر دیے اور لب ہلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

ارسلان رکشا والے کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ اور رکشے کی پچھلی سیٹ پر کلثوم اور مدیحہ چھوٹے موٹے سامان کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی تھیں رکشا کے پیچھے ایک ٹرک سامان سے بھرا ہوا آ رہا تھا۔

گرمی کی شدت کی وجہ سے ارسلان کے ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا جو وہ بار بار رومال سے پونچھ رہا تھا اس کی قمیص بھی بری طرح پسینے سے بھیگ چکی تھی وہ بے زاری سے بولا

"بھائی صاحب رکشا کی اسپیڈ تیز کر دیں میرا تو آپ نے برا حال کر دیا ہے۔" رکشے والا بے زاری سے بولا۔

"فل اسپیڈ ہے شہزادے اب یہ جہاز تو بننے سے رہا۔" وہ رکشے والے کے خفا چہرے پر نظر ڈال کر خاموش ہو گیا اور روڈ پر نظریں جما دیں۔ مدیحہ اپنا سر دبا رہی تھی وہ خفگی سے بولی۔

"اس رکشے کی پھٹ پھٹ نے تو میرے سر میں درد کر دیا۔"

کلثوم نے چادر سنبھالی اور سنجیدگی سے بولیں "بس بس اپنا موڈ ٹھیک کر لو گھر قریب آ رہا ہے یوں بجھے چہرے سے ملو گی تو وہ لوگ کیا سوچیں گے کہ کتنی بے زار لڑکی ہے؟"

ارسلان نے رکشے سے گردن نکال کر پیچھے ٹرک والے کو آواز دی۔

"بھائی صاحب اس گلی میں لے لیں۔" رکشا ایک گلی میں جانے لگا۔

ٹرک والے نے سر ہلا کر اس کو مطمئن کیا اور موڑ کاٹ کر اس گلی میں پیچھے پیچھے آنے لگا ارسلان نے لمبی سانس لی اور پھر فکر مندی سے اپنی قمیص کو دیکھا جو بری طرح پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں آ کر جھاڑو دینے لگی اور پھر اداسی سے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"یہ لڑکی ذات بھی عجیب ہے اپنے والدین کے گھر پیدا ہوتی ہے اور پھر کسی اور کا گھر بسانے کے لیے اپنے والدین کو چھوڑ جاتی ہے۔ اگر وہ سسرال کی نہیں ہو پاتی تو اس کے لیے وہی والدین کا گھر دوزخ بن جاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"کاش میں لڑکی نہ ہوتی لڑکا ہوتی تو اماں کی ساری فکریں ختم ہو جاتیں۔" وہ اپنی ذات کے خلاف سوچنے لگی۔ دروازہ پر دستک ہوئی تو کرن منفی سوچ سے آزاد ہوئی اسی وقت سکینہ کی آواز ابھری۔

"وہ لوگ آ گئے ہیں شاید؟" کرن نے جھٹ سے کپڑا اٹھایا اور پھر ہاتھ منہ دھو کر باورچی خانے میں گھس گئی۔

سکینہ نے خوش دلی سے ان لوگوں کا استقبال کیا۔

"آئیے آئیے" سکینہ نے کلثوم کا ہاتھ تھام لیا۔

مدیحہ نے شائستگی سے انہیں سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی۔" سکینہ نے سلام کا جواب دے کر

اس کے سر پر پیار دے دیا۔
"کرن بیٹی کہاں ہے؟" کلثوم نے پیار سے پوچھا۔
"...... ابھی آجاتی ہے۔" سکینہ نے پیار سے مدیحہ کی طرف دیکھا جو کمرے کے چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔
"بیٹی گھر پسند آیا کیا؟"
"جی خالہ جی جی۔" مدیحہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"یہ ارسلان بیٹا کہاں رہ گیا؟" سکینہ کو یک دم اس کا خیال آیا۔
"ارسلان سامان اتروا رہا ہے۔"
"بہت ذمہ دار لڑکا ہے۔" سکینہ نے تعریف کی۔
"ہاں مگر ارسلان جتنا ذمہ دار ہے۔ مدیحہ اتنی ہی لاپروا ہے۔" کلثوم نے مسکرا کر بتایا۔
"دیکھیے خالہ جان اماں اب ہمیشہ آپ سے ارسلان بھائی کی تعریفیں کریں گی۔" مدیحہ نے منہ بسور لیا۔ سکینہ مسکرانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

وہ باورچی خانے میں کھڑی تھی اور ایک باؤل میں انڈے پھینٹ رہی تھی۔ سکینہ وہاں آگئیں اور فکر مندی سے پوچھا۔
"کرن سب کچھ تیار ہو گیا ہے کیا؟ کلثوم تمہیں یاد کر رہی ہیں۔"
"جی اماں بس دس منٹ تک ناشتا لے آؤں گی آپ ان لوگوں کے پاس بیٹھیے۔"
سکینہ نے جلدی سے ہاٹ پاٹ کھول کر پوچھا۔
"پراٹھے کتنے ہیں؟"
اس نے آملیٹ توے پر پھیلایا اور بولی۔ "اماں پانچ پراٹھے ہیں کیوں کیا ہوا؟"
"ایسا کرو... دو پراٹھے اور بنا لو؟" سکینہ فکر مندی سے بولیں۔
"اماں وہ تین لوگ ہیں۔ پانچ پراٹھے کم نہیں ہوں گے۔"
"ارسلان جوان بچہ ہے۔ عورتوں کے مقابلے میں مرد زیادہ کھاتا ہے بے چارے نے سارا سامان خود اوپر پورشن میں سیٹ کیا ہے۔ اسے بھوک لگ رہی ہوگی؟" اس نے مسکرا کر چائے تھرموس میں ڈالی اور ڈھکن مضبوطی سے بند کرتے ہوئے بولی۔
"اماں... دو منٹ میٹھا بول لینے سے کوئی اچھا آدمی نہیں بن جاتا۔ انسان کی حقیقت آہستہ آہستہ کھلتی ہے۔"
"اچھا... اچھا جلدی سے ناشتا ان لوگوں کو دو بے چارے کب سے بھوکے ہیں اور تم طعنے دینے پر تلی ہو۔" سکینہ خفا ہو کر باہر نکل گئیں۔
کرن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے پراٹھے بیلنے کی غرض سے چولہے پر توا رکھ دیا۔
"یہ کیا؟"
کرن ناشتے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تو کلثوم نے فکر مندی ظاہر کی۔
"بہن سکینہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ ارسلان ابھی بازار سے کچھ لے آتا۔"
"اونہوں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے بہن بھی کہتی ہیں اور بہن بھی نہیں سمجھتیں۔" سکینہ نے مدیحہ کو پلیٹ تھمائی۔ کلثوم نے کرن کو دیکھ کر کہا۔
"بیٹی تمہیں ہماری وجہ سے باورچی خانے میں گرمی سہنی پڑی۔"
"نہیں خالہ مجھے تو باورچی خانے کے کام میں خوشی ملتی ہے۔ آپ ناشتا شروع کریں ٹھنڈا ہو جائے گا۔"
وہ مدیحہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کلثوم نے پراٹھا اور تھوڑا سا آملیٹ پلیٹ میں ڈال کر مدیحہ کو دیا۔
"جاؤ بیٹی بھائی کو اوپر ناشتا دے آؤ۔"
"ارسلان کہاں چلا گیا؟"
"بہن ہر گھر کے چادر اور چار دیواری کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور میرا ارسلان ان اصولوں کی بہت قدر کرتا ہے۔" کلثوم نے مسکراہٹ سجا کر بتایا۔ سکینہ کا دل مزید مطمئن سا ہو گیا۔
"اللہ ہمیشہ اسے خوش رکھے۔" کلثوم کے ہونٹ دعا کے لیے ملے۔ مدیحہ اٹھ کر جانے لگی۔ تو سکینہ نے

اس کا بازو تھام لیا اور اس سے پلیٹ پکڑ لی۔
"کیا ہوا بہن؟" کلثوم فکر مندی سے بولیں۔
"جاؤ مدیحہ ارسلان کو نیچے لے آؤ کہنا اگر خالہ سکینہ کو اپنی ماں جیسا سمجھتے ہو تو ہمارے ساتھ ہی ناشتا کرو گے۔" سکینہ نے شفقت سے کہا۔
"جی خالہ... میں ابھی بھائی کو لے کر آتی ہوں۔"
"اماں آپ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت اگر وہ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتا تو اس میں ہماری بھلائی ہے۔" کرن اسی سوچ میں پڑی تھی کہ کلثوم نے اسے چونکایا۔
"ماشاء اللہ کرن بیٹی تو کھانے پکانے میں بہت ماہر لگتی ہے آملیٹ اور آلو کی بھجیا تو بہت عمدہ ہے۔" کلثوم نے خوش دلی سے تعریف کی۔
"کرن کے ہاتھ میں بہت لذت ہے اور ماشاء اللہ سلائی کڑھائی میں بھی بہت ماہر ہے۔" سکینہ نے اس کی دل کھول کر تعریف کی تو وہ شرما سی گئی۔
"ایسی بات ہے تو پھر مدیحہ کو بھی بیٹی کچھ سکھا دینا اس کی تو جان کام کرنے سے بھاگتی ہے۔" کلثوم نے چائے کا سپ لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"جی خالہ ضرور۔" وہ مسکرائی۔
"لڑکیوں کے ہاتھ میں ہنر ہونا چاہیے ورنہ آج کل گھر ایک فرد کی کمائی پر تھوڑا چل سکتا ہے۔ مہنگائی تو آسمان کو چھو رہی ہے۔" کلثوم نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔
"ہاں بہن یہ تو آپ سچ کہہ رہی ہیں۔" سکینہ نے افسردگی سے جواب دیا۔
"مجھے تو اپنے ارسلان کے لیے ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو ہمارے ساتھ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلا سکے اور اس میں گھر چلانے کی سمجھ ہو۔"
"ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں بہتر کرے گا۔ آپ آرام سے ناشتا کریں۔" سکینہ نے تسلی دی۔
"بس میری بہن دعا کریں کہ ارسلان کو اچھی ملازمت مل جائے جس جگہ ملازمت کر رہا ہے وہاں تنخواہ بہت کم ہے صبح ملازمت کرتا ہے اور شام کو دوسری ملازمت کے لیے چکر کاٹتا رہتا ہے۔"
"ان شاء اللہ ارسلان کو بہت جلد اچھی ملازمت مل جائے گی آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں خدا اپنے بندوں کی ضرور سنتا ہے۔" سکینہ پیار بھرے لہجے میں بولیں۔
"ہاں ہاں خدا پر بھروسہ ہے تو آپ جیسے اچھے لوگوں سے ہمارا تعلق بنا دیا۔" کلثوم نے سکینہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

مدیحہ اور ارسلان بھی کمرے میں آ گئے۔
"آجاؤ بیٹا اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔" سکینہ خوشی سے بولیں۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد ارسلان کی نظریں کرن سے ٹکرائیں تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ سکینہ یہ دیکھ کر بہت مطمئن سی ہو گئیں وہ ارسلان کے خوش شکل اور نیک سیرت ہونے پر بہت متاثر ہو گئی تھیں آخر کو وہ ایک بیٹی کی ماں تھیں۔

☼ ☼ ☼

سکینہ اپنے بستر پر لیٹی تھیں کہ کرن دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ سکینہ مسکرا کر بولیں۔
"تم دوائی دینا نہیں بھولتیں۔"
"آپ روزانہ دوائی لینا بھول جانا چاہتی ہیں۔" وہ ماں کے پاس دوائی لے کر آ کھڑی ہوئی۔
سکینہ نے دودھ کا سپ لیا اور مسکرا کر بولیں۔
"ڈاکٹروں کو اپنے پیسے بنانے ہوتے ہیں بھلی چنگی تو ہو گئی ہوں۔"
"آپ کا کوئی بہانہ نہیں چلنے والا ہے۔ بلڈ پریشر کب بڑھ جائے کسی کو کیا پتا یہ دوائی آپ کے بلڈ پریشر کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔" اس نے ماں کی ہتھیلی پر دوائی رکھ دی۔
"توبہ توبہ کتنی کڑوی ہے۔" سکینہ نے دوائی نگل کر منہ بسور لیا۔
"اماں اب اتنی بھی کڑوی نہیں۔" وہ اپنے بستر کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔

"دیکھ لینا یہ دوائیاں ایک دن میری جان لے لیں گی۔" سکینہ خفگی بھرے لہجے سے بولیں۔

"اماں خدا کے لیے ایسی باتیں مت کریں آپ کے سوا میرا کون ہے۔" وہ جھٹ سے ماں کے پاس آبیٹھی اور اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"پگلی تیری شادی کردوں گی۔ تیرا شوہر تیرے بچے تیرے ساتھ ہوں گے۔" سکینہ نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"بس اماں آئندہ آپ مرنے کی بات نہیں کریں گی۔" وہ روہانسی سی ہوگئی۔

"بیٹی ایک دن تو جانا ہی ہوگا ویسے ایک بات پوچھوں۔" سکینہ نے مسکراہٹ لبوں پر سجا کر پوچھا۔

"ہاں اماں کیا بات ہے؟" وہ تجسس سے بولی۔

"تجھے ارسلان کیسا لگا۔" سکینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟" اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"بیٹی مجھے تو بہت سمجھ دار لگا ہے۔ اپنی ماں کا اکلوتا ہے۔ مدیحہ کی منگنی طے ہے۔ وہ اپنے گھر کی ہوجائے گی اور کلثوم بہن بہت اچھی عادتوں کی مالک ہیں۔" سکینہ نے سوچتے ہوئے ان لوگوں کے متعلق بتایا۔

"اماں آپ کیا سوچتی رہتی ہیں مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ مگر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

سکینہ مسکرا کر بولیں۔

"ارسلان نے تجھے دیکھ کر نگاہیں جھکالی تھیں ایسا شریف لڑکا کہاں ملے گا۔"

اس نے چادر منہ تک اوڑھ لی اور خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

"اماں آپ سوجائیے" اس کی چادر کے اندر سے آواز ابھری اور اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی مگر نیند اس کی آنکھوں سے آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔

فجر کی اذان پر اس کی آنکھ کھلی اس نے وضو کیا اور نماز کی ادائیگی کے بعد باورچی خانے کا رخ کیا۔ وہ برتن دھو رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی اس نے مڑ کر دیکھا تو ارسلان باورچی خانے کے باہر کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں کپڑے تھے۔

"جی کہیے۔۔۔ کسی چیز کی ضرورت ہے کیا؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ استری۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کرن نے نل بند کیا۔

"آپ نے کپڑے استری کرنے ہیں کیا؟" وہ اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"جی۔۔۔" اس نے نظریں جھکالیں۔

"اچھا۔۔۔ میں استری لادیتی ہوں۔" وہ اسے جواب دے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے استری اٹھائی تو سکینہ جو نماز کی ادائیگی کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھیں نے حیرت سے پوچھا۔

"بیٹی استری کہاں لے کر جارہی ہو۔"

"اماں۔۔۔ وہ ارسلان نے کپڑے استری کرنے ہیں۔" اس نے نظریں چرا کر بتایا۔

"کتنی بری بات ہے۔ بے چارا لڑکا کپڑے استری کرتا اچھا لگے گا کیا؟ تو اس سے کپڑے لے آتی۔"

"اماں میں اس کی ملازمہ تھوڑی ہوں" وہ تپ سی گئی۔ اپنی ماں کا پیار ارسلان کے لیے اسے ہضم نہیں ہوا۔

"میں کردیتی ہوں اس کے کپڑے استری۔" سکینہ نے تسبیح چھوڑی اور چارپائی سے اٹھنے لگیں ماں کے اس رد عمل پر اس نے فوراً منہ کھولا۔

"اچھا اچھا میں کپڑے استری کردیتی ہوں آپ آرام کریں۔" وہ استری لے کر باہر صحن میں آگئی۔ ارسلان اسے اپنے کمرے کے پاس ہی کھڑا ملا اسے اندازہ ہوگیا کہ اس نے ان کی ساری بات سن لی ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے استری دے دیں میں اپنے کپڑے خود استری کرنے کا عادی ہوں۔" اس نے استری کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"میں آپ کے کپڑے استری کردیتی ہوں۔" اس نے ہلکی آواز سے کہا۔

"نہیں، نہیں میں خود کرلوں گا۔" وہ مسکرایا اور اس نے استری لے لی۔ کرن اس کی مسکراہٹ پر

شرمندہ سی ہوگئی اور نظریں چرا کر باورچی خانے میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼
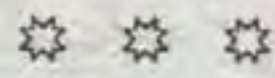
اس نے اپنا اور ماں کا ناشتا تیار کیا بار بار اس کی نظریں سیڑھیوں پر جارہی تھیں کہ شاید ابھی وہ آجائے گا اور اس سے ناشتے کے متعلق بات کرے گا کل رات اس نے چھت پر چولہے کا انتظام نہیں دیکھا تھا۔

وہ کمرے میں ناشتے کی ٹرے کے ساتھ داخل ہوئی۔ سکینہ نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھی اور فکر مندی سے پوچھا۔

"ارسلان کو بھی ناشتا کروادینا تھا۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"اماں وہ نیچے نہیں آیا۔" اور سلائس پر جیم لگانے لگی۔

"تم اس سے پوچھ آتیں" سکینہ نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

"اماں میں کیوں؟" وہ خفا سی ہوگئی۔

"بیٹی تم کیوں ارسلان جیسے بچے سے چڑ گئی ہو اس نے تمہیں ایسا کیا کہہ دیا ہے۔" سکینہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔

"اماں میں ان کی ملازمہ تھوڑی ہوں۔" وہ سلائس چبا کر بولی۔

"ملازمہ نہیں ہو مگر انسان تو ہو کوئی شخص بھوکے پیٹ کام پر چلا جائے تو کیا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بیٹی ہمسائیوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں ہمسائیہ سمجھ کر ناشتے کا پوچھ لو۔"

"اماں اچھا پوچھ آتی ہوں۔" وہ سلائس چھوڑ کر بولی۔ سکینہ مسکرانے لگیں جانتی تھیں کہ ان کی بیٹی بہت اچھے دل کی مالک ہے اور پھر خاموشی سے چائے پینے لگیں۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو وہ سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔

"سنیے۔" کرن نے اس کو پکارا جو بہت جلدی میں دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا وہ باہر کے دروازے تک جا پہنچا تھا۔

"جی۔" اس نے عجلت سے کہا۔

"وہ، وہ اماں ناشتا۔" کرن نے ادھورے لفظوں سے بات کی۔

"ناشتا میں باہر سے کرلوں گا آپ کیوں میری ملازمہ بن رہی ہیں۔" اس نے جاتے جاتے اس کا جملہ کہہ دیا۔

وہ ہکا بکا رہ گئی اور وہ شریر نظروں سے اسے دیکھ کر چلا گیا۔

وہ پاؤں پٹخ کر باورچی خانے میں آکر لمبے لمبے سانس لینے لگی اور منہ میں بڑبڑائی۔ "اماں تو بس اس کی ذات کے سحر میں کھو گئی ہیں جانتی نہیں کہ وہ کتنا ہوشیار انسان ہے۔ میری اور اماں کی چھپ چھپ کر اس نے باتیں سن لیں توبہ توبہ اس نے کیسی نظروں سے مجھے دیکھا اماں کے سامنے اس کی نظریں جھک جاتی ہیں اور مجھے دیکھ کر۔" اس کا موڈ خراب ہوگیا پھر اس نے ناشتا بے دل ہو کر کیا اور سکینہ سے ساری بات چھپالی۔

☼ ☼ ☼
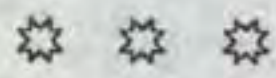
"ایک بجنے کو آرہا ہے مگر بہن کلثوم نیچے نہیں آئیں۔" سکینہ نے فکری مندی سے آکر باورچی خانے میں بتایا۔

"اماں وہ لوگ سو رہے ہوں گے کل خالہ کلثوم نے کافی کام کیا تھا اور مدیحہ بھی تو نازک طبیعت رکھتی ہے۔" اس نے چکن مسالے میں آلو ڈال کر انہیں بھونتے جواب دیا۔

"میں دیکھ کر آتی ہوں۔" سکینہ نے چادر سنبھال کر کہا۔

"ہاں ہاں آپ اوپر چلی ہی جائیں تو اچھا ہے ورنہ کمرے میں بیٹھ کر زیادہ پریشان ہوتی رہیں گی۔" اس نے مسکرا کر مشورہ دیا۔ سکینہ مسکراتی ہوئی آہستہ

آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگیں کہ ان کے کانوں میں کلثوم کی آواز پڑی۔

"ان لوگوں سے کب تک ہمارے حالات چھپے رہیں گے۔ ہم لوگ تو اپنا پرانا خراب چولہا بھی ساتھ نہیں لائے ہیں کم از کم ہماری عزت چھپی رہتی بھوکے پیٹ رہتے مگر ان تک خبر نہ پہنچتی۔" کلثوم کی آواز میں بہت دکھ تھا۔

"اماں آپ فکر کیوں کرتی ہیں بھائی ارسلان نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آج اپنے ایک دوست سے ادھار مانگ کر تھوڑا بہت راشن لے آئیں گے۔" مدیحہ نے ماں کو تسلی دی۔

"ہاں راشن تو آجائے گا مگر نیا چولہا۔" کلثوم کی آواز کانپنے لگی۔ مدیحہ نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

"اماں ہم خالہ سکینہ کے چولہے پر کھانا پکالیں گے وہ بہت اچھی ہیں۔ ہمیں انکار نہیں کریں گی۔"

"نہیں نہیں بیٹی ابھی ہمیں ایک دن نہیں ہوا۔ وہ لوگ ہمیں بوجھ سمجھنے لگیں گی اور پھر یہ بات غیر مناسب ہے۔" سکینہ ساری بات سن کر کمرے میں داخل ہوئیں دونوں ماں بیٹی شرمندہ سی ہوگئیں۔

"سکینہ بہن آپ؟" کلثوم نے گھبرا کر کہا۔

"میں تم سے نہیں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔" سکینہ نے مدیحہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا جس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"بہن وہ وہ!!!" کلثوم کچھ نہ کہہ پائیں۔

"مدیحہ بیٹی تم ہمارا چولہا استعمال کرسکتی ہو تم اس گھر کی کوئی بھی چیز استعمال کرسکتی ہو تمہیں پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا گھر ہے تمہاری خالہ کا۔" سکینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کلثوم کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ سکینہ لرزتی آواز میں بولیں۔

"برا وقت مجھ پر بھی آیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ چھٹ گیا اللہ تعالیٰ بہت جلد آپ کے گھر پر بھی کرم فرمائے گا بس بیٹی چپ ہوجاؤ تمہیں یہاں کسی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"بہن سکینہ آپ! آپ بہت اچھی ہیں مجھے تو اللہ نے زمین پر ہی آپ جیسی فرشتہ ہستی سے ملا دیا۔" کلثوم سکینہ کے گلے سے لپٹ گئیں۔

"بہن بنایا ہے تو بہن سے اپنے دکھ نہ چھپاؤ دکھ بانٹنے سے کم ہوتے ہیں ورنہ یہ تو زندگی کو نگل جاتے ہیں۔" سکینہ نے پیار سے سمجھایا مدیحہ نے اپنے آنسو پونچھے اور پیار سے بولی۔

"خالہ آپ بہت اچھی ہیں" "اور تم بھی بہت اچھی ہو چلو جلدی سے نیچے کرن کے پاس جاکر اس کا کام میں ہاتھ بٹاؤ تمہیں ہم نے سسرال بھی رخصت کرنا ہے ورنہ بہن کلثوم اور مجھے تیرے سسرال والے طعنے دیں گے کہ بیٹی کو کچھ نہیں سکھایا۔" سکینہ نے بات پلٹی۔

"اچھا خالہ۔" وہ دوپٹہ سنبھال کر کمرے سے خوشی خوشی باہر نکل گئی۔ کلثوم نے لرزتی آواز میں کہا۔

"بہن سکینہ میں آپ کا احسان کیسے اتاروں گی۔"

"آپ اتار سکتی ہیں" سکینہ نے جھٹ سے کہا۔

"کیسے" کلثوم نے حیرت سے دیکھا۔

"پیٹ بھر کر ناشتا کریں میرا احسان اتر جائے گا۔" سکینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ کلثوم ان سے لپٹ گئیں اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

کلثوم اور مدیحہ ناشتے سے فارغ ہوئیں تو مدیحہ کرن کے ساتھ اس کے کمرے میں جا بیٹھی۔ کلثوم اور سکینہ صحن میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ مگر کلثوم کا ذہن کہیں اور کھویا تھا۔ سکینہ نے ان کی ذہنی حالت کا اندازہ لگا کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولیں۔

"بہن کیا بات ہے آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں؟"

"ارسلان بہت خوددار ہے وہ ایک ہنڈیا والی بات پر مجھ سے خفا ہوجائے گا۔" بس یہی ذہن میں چل رہا تھا۔

"اوہو جب آپ کے حالات ٹھیک ہوجائیں گے تو گھر میں دو ہنڈیا پکالی جائیں گی میں ارسلان سے بات کروں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔" سکینہ نے تسلی

"میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ میرے بیٹے کے لیے وہ کوئی کرشمہ کردے اسے ہر دنیاوی چیز سے نوازے جس کی اسے ضرورت ہے۔" کلثوم کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ایسا ہی ہوگا ان شاء اللہ بس آپ اپنا ذہن ایک ہنڈیا والی بات کے لیے ہلکا کرلیں میں ارسلان کو رضامند کرلوں گی۔"

"مگر گھر کے راشن میں ہم آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے۔" کلثوم نے اپنے دوپٹہ کی گرہ کھول کر ایک ہزار کا نوٹ سکینہ کو تھمایا۔

"یہ یہ کیا کررہی ہیں کلثوم بہن۔" سکینہ بوکھلا سی گئیں۔

"بس آپ یہ رکھ لیں مجھے نہ کر کے شرمندہ مت کریں بہن آپ نے ہمیں اپنے گھر کا فرد سمجھ کر ایک ہنڈیا پکانے کا فیصلہ لیا ہے تو میں بھی اس گھر کو اپنا سمجھ کر تھوڑے سے پیسے دے رہی ہوں۔"

"اچھا اچھا بہن زیادہ پریشان نہ ہوں میں رکھ لیتی ہوں۔" سکینہ نے ہزار کا نوٹ ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"اماں روٹیاں بنالوں کیا؟" کرن اور مدیحہ صحن میں آکھڑی ہوئیں۔ کرن نے پوچھا۔

"ہاں ہاں سب کے لیے بنادو اور ہاٹ پاٹ میں رکھ دو جس کو جب بھوک لگے گی آرام سے نکال کر گرم کرلے گا کیوں کلثوم بہن۔" سکینہ نے اس سے مشورہ طلب کیا۔ کلثوم پیار سے بولیں۔

"ماشاء اللہ کرن بیٹی بہت پیاری بچی ہے سب کا کتنا خیال رکھتی ہے مدیحہ دیکھ لو اور کچھ سیکھ لو۔"

"خالہ اماں مجھے ہمیشہ طعنے دیتی رہتی ہیں آپ ہی ان کو سمجھایئے۔" وہ منہ بسور کر بیٹھ گئی۔

"کیوں کلثوم بچی کو کیوں ہر وقت طعنے دیتی رہتی ہو۔"

"جناب بچی کے کام ہی برے ہیں چلو ایسا کرتے ہیں آج سے کرن میری بیٹی اور یہ تمہاری۔" کلثوم کی بات پر کرن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"مجھے منظور ہے۔" سکینہ مسکرا کر بولیں۔

"اماں اب آپ مجھے ڈانٹ نہیں سکتیں۔ میں خالہ سکینہ کی بیٹی ہوں۔" مدیحہ نے شوخی سے جتلایا۔

"تیرے بدلے میں مجھے اتنی پیاری بیٹی کرن ملی ہے میں تو اپنی بیٹی کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے اور پھر جب مجھے کرن بیٹی کی تعریفوں سے وقت ہی نہیں ملے گا تو میں کیسے تجھے ڈانٹنے کے لیے وقت نکال پاؤں گی۔"

"اماں ایسا تو نہ کہیں۔" مدیحہ نے کلثوم کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاہاہا اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" کلثوم نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔ سکینہ اور کرن مسکرانے لگیں۔

"اتنا بھی بچی کو تنگ نہ کرو۔" سکینہ نے مدیحہ کے سر پر پیار دیا۔

"اچھی بیٹی بننا چاہتی ہے تو آج یہ روٹیاں پکائے گی۔" کلثوم نے مسکرا کر حکم جاری کیا۔

"اوکے آج میں روٹیاں پکاتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کرن بیٹی اس کو اپنے ساتھ ہر کام میں لگاؤ یہ اس گھر میں مہمان ہے۔" کلثوم نے ہنس کر بتایا۔ مدیحہ شرما کر باورچی خانے میں گھس گئی۔

"اللہ تعالیٰ بہت جلد کرن کے لیے بھی کوئی اچھا وسیلہ بنادے۔" کلثوم نے کرن کے سر پر پیار دیا اور مسکرا کر بولیں۔

"ایسی لڑکی کو تو ہر کوئی اپنی بہو بنانے کا خواہشمند ہوگا دیکھ لینا سکینہ بہن کرن کی ساس اس سے بہت پیار کریں گی۔" کلثوم نے محبت سے اسے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

سب سو رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس نے گھڑی دیکھی رات کا ایک بج رہا تھا۔

دروازہ پھر بجنے لگا اس نے اپنا دوپٹہ سنبھالا اور دبے قدموں سے باہر نکل کر مین دروازے تک پہنچی۔

"کون ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"میں ارسلان۔" اس کی آواز ابھری
"اوہو" ایک دم اسے خیال آیا کہ وہ گھر نہیں آیا تھا۔ اور سب رات کے کھانے میں اس کا کافی دیر تک انتظار کرتے رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے تھا۔

"آپ اس وقت؟" اس نے برہم لہجے سے کہا۔
"بس ..... وہ سودا سلف لانے میں دیر ہو گئی۔" دو شاپرز جن میں کھانے پینے کا سامان تھا اس نے تخت پر رکھ دیے۔
"پلیز آئندہ آپ جلدی گھر لوٹیں۔" اس نے ہنوز برہم لہجے میں اسے احساس دلایا۔
"دیکھیے آپ کیوں مجھ سے خفا رہتی ہیں؟" اس نے بھی خفگی سے پوچھا۔
"میں اور آپ سے خفا؟" وہ چونکی۔
"جی آپ ہر وقت مجھے برا ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتی ہیں؟" اس نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔
"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔
"دو منٹ میٹھا بول لینے سے کوئی انسان اچھا ثابت نہیں ہو سکتا۔" اس نے تیکھے لہجے سے اس کی اول روز والی بات دوہرائی۔ جو اس نے سیڑھیاں چڑھتے سن لی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔
"آپ؟ اس کا مطلب ہے کہ آپ جاسوسی بھی کرتے ہیں۔"
"جی نہیں میں جاسوسی نہیں کرتا اور دیکھیے پھر آپ مجھے جاسوس کہہ کر مجھے برا ثابت کر رہی ہیں۔"
"اچھا تو پھر آپ ثابت کریں کیا کسی کی چھپ کر باتیں سننا بری عادت نہیں۔" اس نے غصے سے پوچھا۔
"جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر آپ جب با آواز بلند باتیں کریں گی تو لوگ بہرے تو نہیں ہیں جو سن نہ سکیں میری مجبور سماعتوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی بات سن لی اس وجہ سے آپ مجھ پر جاسوسی کا الزام لگا رہی ہیں۔" اس نے معصومیت سے بتایا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
"ٹھیک ہے میں اپنی غلطی مانتی ہوں اور آپ؟ اتنی دیر سے آکر بھی اپنی غلطی نہیں مان رہے۔" اس نے اس پر پھر حملہ کر دیا۔
"اب میں آپ سے کیا کہوں۔" وہ آہ بھر کر بولا۔
"سوری کر لیں اور آئندہ دیر سے مت آئیے۔" اس نے مالک مکان کی طرح حکم جاری کیا۔
"میں کیوں سوری کروں جبکہ میری کوئی غلطی نہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔
"تو پھر غلطی کس کی ہے؟"
"غلطی میری قسمت کی ہے۔ آپ جائیے میری قسمت سے جھگڑا کیجیے" اس نے غصہ سے خود کو کوسا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
"سچ میں میری کوئی غلطی نہیں، اماں نے صبح نکلتے وقت گھر کا سامان لانے کا حکم دیا تھا چھٹی کے بعد ایک دو دوستوں کے گھر ادھار مانگنے گیا مگر کسی نے ادھار نہ دیا۔ پھر سوچا کہ گھڑی بیچ دیتا ہوں سو میں نے اپنی گھڑی فروخت کر دی گھڑی والی شاپ میں کافی رش تھا بس پھر وہاں کافی دیر بیٹھا رہا اب گھڑی پاس نہیں تھی تو سودا سلف لینے اور آہستہ آہستہ پیدل چل کر گھر آنے تک وقت کیسے دیکھ پاتا اگر آپ کو اب بھی لگتا ہے کہ میں غلط ہوں تو سوری اب مجھے اجازت دیجیے مجھے پھر کل ملازمت پر جانا ہے۔" وہ اپنی ساری بات سنا کر سیڑھیاں چڑھ گیا اور وہ اسے ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔
اس نے سارا سامان باورچی خانے میں رکھا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کیوں اس سے جھگڑا کیا ہے ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ اس نے خود پر قابو پایا۔ اور پھر چور نظروں سے دیکھا۔ ارسلان نے ایک گلاس اٹھایا اور پانی بھر کر پینے لگا وہ چہرے سے مطمئن دکھائی دے رہا تھا وہ باورچی خانے سے باہر جانے لگی تو اس نے پکارا۔
"سنیے۔"
"کیا میں آپ کا چولہا استعمال کر سکتا ہوں مجھے بہت بھوک لگی ہے مدیحہ اور اماں سو رہی ہیں تو سوچا کہ انڈے ابال کے کھا لیتا ہوں۔ اب مجھے کوکنگ نہیں آتی ورنہ ایک عدد روٹی پکا لیتا۔" اس نے بتایا۔
"آپ صحن میں بیٹھیے میں آپ کو کھانا دیتی ہوں۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔
"تھینک یو۔" وہ چپ چاپ باہر صحن میں جا بیٹھا۔ اس نے جلدی سے سالن گرم کیا اور ہاٹ پاٹ میں رکھی روٹیاں گرم کر کے اس کے پاس لے گئی اس نے خاموشی سے ٹرے پکڑی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑی کہ اس نے پکارا۔
"سنیے۔" وہ فوراً پلٹی۔
"جی" اس نے کہا۔
"شکریہ آدھی رات کو دروازہ کھولنے، مجھے کھانا دینے کا میں ساری باتوں کے لیے دل سے معافی مانگتا ہوں۔" اس نے آہستگی سے لفظ ادا کیے۔
"سوری غلطی میری تھی۔" اس نے معذرت کی۔ وہ مسکرا دیا۔
"نہیں میری تھی اب میں کھانا کھا لوں جب کھانے کی خوشبو اتنی اچھی ہے تو ذائقہ کیسا ہو گا۔" اس نے ہنستے ہوئے تعریف کی تو کرن کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح جلدی اٹھ گئی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ باورچی خانے میں ایک کھڑکی کھلتی تھی جس سے چھت پر جانے والی سیڑھیاں نظر آجاتی تھیں وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے گرما گرم پراٹھے بنا ڈالے مگر وہ نہ اترا اس نے کمرے میں جا کر وال کلاک کی طرف دیکھا صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے، وہ منہ میں بڑبڑائی کہیں وہ گھڑی نہ ہونے کی وجہ سے سوتا تو نہیں رہ گیا مجھے اسے جگانا چاہیے وہ خود سے مخاطب ہوئی اور پھر اوپر کی سیڑھیاں چڑھ گئی اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا مدیحہ اور خالہ کلثوم بے خبری سے سو رہی تھیں اور وہ بھی اسے ایک چارپائی پر سوتا ہوا نظر آیا۔ وہ آہستگی سے بولی۔
"ارسلان، ارسلان!" دوسری طرف ارسلان نے کوئی حرکت نہ کی وہ مزید اس کے پاس آپہنچی اور اس نے پھر اسے پکارا۔
"ارسلان، ارسلان!" اس دفعہ تھوڑی حرکت ارسلان نے کی۔ مگر آنکھیں نہ کھولیں۔
"اف اب میں کیسے جگاؤں۔" وہ بجھے لہجے سے بولی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے ہلایا۔
"کون، کون ہے؟" ارسلان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
"جی میں ہوں کرن۔" وہ ڈر کر دور ہٹی۔
"تم۔" وہ آنکھیں مسل کر بولا۔
"جی میں کرن آپ صبح نیچے نہیں آئے ساڑھے سات بج چکے ہیں تو سوچا کہ آپ کو جگا دوں۔"
"ہاں اچھا کیا۔" وہ بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ کرن خاموشی سے پھر باورچی خانے میں آگئی اس نے آملیٹ کے لیے آمیزہ تیار کیا اور پھر اپنی نظریں سیڑھیوں پر جما دیں۔
پندرہ منٹ کے بعد وہ اسے سیڑھیاں اترتا نظر آیا اس نے اسے پکار لیا جو باہر دروازے کی جانب بڑھا تھا۔
"سنیے۔" اس نے آواز دی۔
"جی۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔
"ناشتا تیار ہے۔" اس نے ہلکی آواز میں کہا۔
"کافی دیر ہو گئی مجھے جانا ہو گا۔" اس نے دوسرے طریقے سے نفی کی وہ مرجھا کر بولی۔
"دیکھیے مگر آپ ناشتا نہیں کریں گے تو میرا دن بھی اچھا نہیں گزرے گا میں کل کے اپنے رویے سے شرمندہ ہوں۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
"اچھا آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ مجھے ٹفن دے دیجیے میں وہاں آفس میں ناشتا کر لوں گا۔" اس نے مسکرا کر مشورہ دیا۔
وہ خوش سی ہو گئی پھر ایک چھوٹے سے ٹفن کو دھو

کراس نے دو پراٹھے اور آملیٹ گرما گرم پیک کیا اور اسے تھمایا۔
"تھینک یو" اس نے مسکرا کر کہا۔
"آپ نے مجھے معاف کر دیا کیا؟" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ وہ ہنسا۔
"ہاں ہاں آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت بھی نہیں شاید میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی دیر سے آنے پر آپ پر برس پڑتا۔" اس نے جواب دیا۔
وہ خوش سی ہو گئی۔ وہ مسکرا کر بولا۔
"اچھا اب مجھے اجازت دیجیے ورنہ باس خفا ہو جائے گا ______ او کے خدا حافظ میں چلتا ہوں۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے قدموں کو حرکت دی۔
"خدا حافظ۔" اس نے جواباً کہا اور جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوا وہ دروازے پر ٹکی رہی۔

☆ ☆ ☆

وہ دوپہر کو ہنڈیا بنا رہی تھی کہ مدیحہ اس کے پاس چلی آئی۔
"کرن آپی کیا پکا رہی ہیں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔
"دال کدو بنا رہی ہوں۔" اس نے مصروف انداز میں بتایا۔
"اوہو تو پھر ارسلان بھائی بھوکے ہی رہیں گے۔" وہ اداس لہجے سے بولی۔
"کیوں؟" وہ حیرانی سے بولتے ہوئے ہنڈیا میں چمچہ چلانے لگی۔
"ارسلان بھائی کو کدو پسند نہیں ہیں اس لیے۔ ویسے کوئی بات نہیں وہ باہر سے کچھ اپنے لیے لے آئیں گے۔"
اس کا دل بجھ سا گیا وہ فوراً بولی۔
"میں ارسلان کے لیے آلو انڈے بنا دیتی ہوں کیا ارسلان کو آلو انڈے اچھے لگتے ہیں؟" اس نے نظریں چرا کر پوچھا اور سبزی کی ٹوکری میں سے آلو نکال کر پکڑے۔
"ہاں ہاں آلو انڈے تو ان کی فیورٹ ڈش ہے۔ مگر آپ رہنے دیں۔ ابھی آپ نے اتنا کام کیا ہے۔" مدیحہ نے اس کو روک دیا۔
"ارسلان کام سے تھکا ہارا آئے گا اچھا نہیں لگتا کہ وہ دوبارہ گھر سے باہر نکلے۔ میں ابھی بنا لیتی ہوں اور مجھے کام کرنے کی عادت ہے۔ تم مجھے اپنی پسند اور ارسلان کی پسند بتا دو کہ تم لوگوں کو کیا کیا پسند ہے؟" اس نے آلو کاٹنے شروع کیے۔ مدیحہ نے اسٹول سنبھال لیا اور پیار سے بولی۔
"مجھے تو سب سبزیاں پسند ہیں۔ مگر ارسلان بھائی تو گوشت کے زیادہ شوقین ہیں اور چکن بریانی اور قورمہ تو ان کی فیورٹ ڈشز ہیں۔" وہ آلو کاٹ کر دھونے لگی۔
"اور تمہاری فیورٹ ڈش کیا ہے؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔
"میری بھی بھائی کی طرح بریانی اور قورمہ۔" وہ ہنسی۔
"اچھا تو ٹھیک ہے بہت جلد چکن بریانی پکاتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"نہیں کرن آپی اتنا خرچا کرنے کی ضرورت نہیں اور پھر اماں کے علم میں یہ بات آگئی تو میری شامت آجائے گی۔" وہ ہنسی دبا کر بولی۔
"اوہو میں نہیں بتاؤں گی۔" اس نے آلو دھو کر ایک طرف رکھے اور پیاز چھیلنے لگی۔
"سوچ لیں ایسا نہ ہو کہ اماں میری بریانی بنا ڈالیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔
"تم فکر نہ کرو۔" اس نے پیاز چھیلتے ہوئے مسکرا کے جواب دیا۔
"آئیڈیا کرن آپی ہم ارسلان بھائی کی سالگرہ مناتے ہیں۔" اس نے یک دم کہا تو کرن کا دل دھڑک اٹھا۔
"کب ہے؟" اس نے نظریں چرا کر پوچھا۔

"پندرہ دن کے بعد اکیس کو ان کی سالگرہ ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ خود بھی بھول چکے ہیں ان کو سرپرائز دیتے ہیں۔" مدیحہ نے سوچتے ہوئے کہا۔
"اوہ تو پھر ان شاء اللہ اکیس تاریخ کو سب کچھ تمہاری فرمائش کا بنالوں گی۔" کرن مسکرا کے بولی۔
"میری کیوں بھائی کی سالگرہ ہے میری تھوڑی ہے۔" وہ ہنسی۔ کرن نے منہ بسور کر کہا۔
"اب مجھے کیا پتا کہ ارسلان کو کیا پسند ہے؟" اس نے ایک دیگچی میں تھوڑا سا آئل ڈال کے جواب دیا۔
"آپ بھائی سے پوچھ لینا وہ بتا دیں گے۔" مدیحہ مسکرائی۔
"تو پھر سرپرائز کیسے رہے گا۔" وہ ہنس کر بولی۔
"او نو میں بھی کتنی پاگل ہوں میں آپ کو ارسلان بھائی کی پسند بتا دوں گی انہیں چاکلیٹ کیک ملک شیک بہت پسند ہے شامی کباب بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں مگر" یک دم وہ بتاتے بتاتے رکی۔
"کیا ہوا؟" اس نے دیگچی کا آئل گرم ہونے پہ پیاز ڈال دی اور چمچہ چلاتے ہوئے پوچھا۔
"میں بھی فضول ہی بکتی جا رہی ہوں۔ کرن آپی ہم سالگرہ نہیں منائیں گے آپ سب کچھ بھول جائیے۔" مدیحہ نے افسردگی سے کہا۔
"امی کو یہ باتیں پسند نہیں۔"
"بس یہ بات تھی میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ مسکرائی اس نے آلو دیگچی میں ڈالے اور انہیں بھوننے لگی۔
"اچھا تم ایسا کرو فریج میں سے ٹماٹر لا دو۔" اس نے مسکرا کر اس کی توجہ ہٹائی۔
"یہ لیجیے۔" اس نے دو ٹماٹر اس کو تھمائے وہ مسکرا کر بولی۔
"ٹماٹر کاٹ کر دو۔" وہ اس کی اداسی ختم کرنا چاہتی تھی۔
"اچھا جی۔" اس نے کہا اور چھری پکڑ کر ٹماٹر کاٹنے لگی۔ اس نے دیگچی میں آلو گلنے کے لیے تھوڑا سا پانی ڈالا۔ مدیحہ کا موڈ آف تھا۔ پھر اس کے موڈ کو خوشگوار کرنے کے لیے اس نے مدیحہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔
"آلو انڈے، بہت مزے کے تھے۔ تھینک یو کہ آپ نے میرے لیے خاص اہتمام کیا۔" وہ رات کے برتن دھو رہی تھی کہ اس کو اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔
"آپ کا شکریہ آپ کو پسند آئے۔" اس نے نظریں چرائیں۔
"میں آپ کو اپنے ہاتھ کی چائے پلانا چاہتا ہوں کیا آپ پئیں گی۔" وہ شوخی سے بولا۔
"جی۔" وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
"کیا آپ چائے پینا پسند کریں گی۔" وہ تھوڑا سا سنجیدہ ہوا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔
"جی ضرور۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر برتن دھونے لگی اس نے ایک پتیلی اٹھائی اور اس کے بہت پاس آکھڑا ہوا۔ کرن کا چہرہ سرخ سا ہو گیا۔
"پانی لے سکتا ہوں؟" اس نے پتیلی سنک کے پاس پہنچائی۔ وہ پیچھے کو ہٹی۔
"جی۔" اس نے مسکرا کر پانی پتیلی میں لیا۔ اور چولہا جلا کر پتیلی رکھ دی۔ وہ خاموشی سے برتن دھونے لگی۔ مگر اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
"دودھ ملے گا کیا؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں کیوں نہیں فریج میں سے لے لیں۔" کرن نے برتن دھوتے ہوئے جواب دیا۔ قہوہ بن چکا تھا اس نے فریج میں سے دودھ لیا اور چائے میں ڈالتے ہوئے بولا۔
"تھینک یو۔" اور تھوڑا سا مسکرایا۔
"ہر بات پر تھینک یو کرنا اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے برتن دھو لیے تھے پھر اپنے ہاتھ صابن سے دھو کر نل بند کیا۔
"آپ کے احسانات ہی اتنے ہیں کہ منہ سے تھینک یو خود بخود پھسل جاتا ہے جبکہ میں خود تھینک یو لفظ کو اہمیت نہیں دیتا اس سے رشتے میں اپنائیت نہیں رہتی۔" اس نے وضاحت دی۔
"جی ہاں میں آپ کی بات سے متفق ہوں مگر احسانات والی بات آئندہ مت کہیے گا اماں کو اس

بات کا علم ہوا تو وہ بہت دکھی ہو جائیں گی وہ آپ کو اپنا بیٹا مانتی ہیں۔" اس نے نظریں چرا کر بات کی۔

"بیٹے کا بھی تو فرض نہیں نبھا رہا پتا نہیں خالہ جان کو اگلے مہینے کا کرایہ کیسے دے پاؤں گا آفس والوں سے دو ماہ کی ایڈوانس تنخواہ لے چکا ہوں۔" اس نے فکرمندی سے بات کی۔

"اوہو آپ کی چائے۔" وہ چولہے کی طرف بڑھی چائے فرش پر تھوڑی سی گر گئی تھی۔

"میں نے آپ کا کام بڑھا دیا۔" وہ فرش پر گری چائے دیکھ کر بولا۔

"کوئی بات نہیں میں صفائی کر لوں گی۔" وہ بولی۔ پھر اس نے دو کپ چائے سے بھرے اور ایک کپ اسے تھمایا۔

"تھینک یو" وہ چائے کا کپ تھام کر بولا اور پھر اس نے ہلکا سے قہقہہ لگایا۔

"میری زبان نے پھر گستاخی کر دی۔" اس نے چائے کا سپ لیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے مسکراتے ہی نظریں جھکا لیں۔

"آپ چائے نہیں پی رہیں۔" وہ فوراً بولا۔

"میں اتنی گرم چائے نہیں پی سکتی۔" اس نے کہا۔

"اچھا کرتی ہیں میری طرح نہیں ——— کہ معدہ ہی جلا دیں۔" وہ چائے کا سپ لے کر ہنستے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرائی اور کپ تھام لیا اور چائے کی چسکی لی۔

"اوہو آپ کیوں گرم چائے پی رہی ہیں۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تاکہ میری عادت ہو جائے اور آپ خود کو نامعقول نہ سمجھیں۔" اس نے پھر چائے کی چسکی لی۔

"آپ بہت اچھی ہیں پہلے میں یہ سمجھا تھا کہ آپ ہمیں یہاں ٹکنے نہیں دیں گی۔" اس نے ہنستے جتایا۔

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"آپ کا غصہ جو ہر وقت میرے لیے ناک پر نظر آتا تھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ یہ حقیقت تھی اس نے ایک دوبار اسے گھور کر دیکھا تھا اس نے ہلکی سے مسکراہٹ لبوں پر سجالی اور وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

☼ ☼ ☼
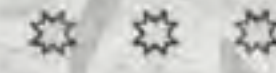
رات کو وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو سکینہ سو رہی تھیں اس نے جگا کر ماں کو دوائی پلائی۔

"اوف فو... اتنی مزے کی نیند سو رہی تھی۔" سکینہ نے دوائی نگل کر پانی پیا اور منہ بسور کر بیٹھ گئیں۔

"اماں خفا کیوں ہو رہی ہو پھر لیٹ جاؤ۔" وہ ہنسی اور اپنے بستر پر آبیٹھی۔

"میں تو کب سے تمہارا کمرے میں انتظار کر رہی تھی۔" سکینہ نے لیٹتے ہوئے بتایا تو وہ دھڑکتے دل سے بولی۔

"اماں وہ چائے ارسلان نے بنائی تھی تو انہوں نے میرے لیے بھی بنا دی تھی بس چائے پینے میں دیر ہو گئی۔" اس نے ماں سے بات چھپانا مناسب نہ سمجھی۔

"ٹھیک ہے اچھا کیا اس طرح تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے لگو گے مجھے تو ارسلان بہت پسند ہے اور کلثوم بہن تو تمہاری تعریفیں کرتے تھکتی نہیں ہے۔" سکینہ نے پیار سے اسے جواب دیا۔ وہ منہ بسورے بولی۔

"اماں آپ میری بات کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہی ہیں۔"

"دیکھو کرن میں ماں کے ساتھ تمہاری سہیلی بھی ہوں اور تمہیں پوری اجازت ہے کہ تم اپنے لیے سوچو اگر تمہیں ارسلان پسند نہیں آئے تو کوئی بات نہیں مگر تم اس کے متعلق سوچے بغیر ہی کوئی رائے قائم کر لو گی تو یہ بہتر نہیں۔" سکینہ نے اس کو پیار سے سمجھایا۔

"اماں مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے چادر منہ پر اوڑھتے جواب دیا۔ سکینہ کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ ابھری۔ اور پیار سے بولیں۔

"مجھے ارسلان بہت اچھا لگتا ہے بس یہ بھی بات ذہن میں رکھ کر سوچنا۔"

"اماں پلیز تنگ نہ کریں۔" اس نے چادر ہٹا کر انہیں دیکھتے جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے باورچی خانے کا رخ کیا اور باورچی خانے کی کھڑکی کھول دی جہاں سے وہ اسے اترتا دیکھ سکتی تھی۔ اس نے مدیحہ سے اس کی پسند ناپسند معلوم کر لی تھی۔ آج اس نے آلو کے پراٹھے تیار کیے تھے۔ اس کی نظریں سیڑھیوں پر تھیں کہ وہ بالوں پر ہاتھ پھیرتا اترتا نظر آیا اس نے جھٹ سے نظریں چرا لیں۔ وہ مسکرا کر اس کے پاس باورچی خانے میں چلا آیا۔

"السلام علیکم" وہ اس کے سامنے تھا۔

"وعلیکم السلام" اس نے پراٹھا بیلتے ہوئے جواب دیا۔

"آج میں جلدی اٹھ گیا۔" وہ مسکرایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پراٹھا توے پر ڈالا اور اس کے لیے ایک پراٹھا پلیٹ میں رکھ کر اسے تھمایا۔

"واہ واہ آلو کے پراٹھے۔" وہ شوخ سا ہوا۔

"آپ کو آلو کے پراٹھے اچھے لگتے ہیں تو سوچا..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور گھبرا سی گئی کہ کہیں اسے علم نہ ہو جائے کہ وہ خاص اس کی پسند کو ترجیح دے رہی ہے۔

"تھینک یو سو مچ" کہتے ہوئے اس نے نوالہ لیا۔ اس نے توے سے دوسرا گرما گرم پراٹھا اتارا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ چائے دم پر تھی اس نے چائے ایک کپ میں نکالی اور ٹیبل پر رکھ دی وہ مزے سے ناشتا کرنے لگا۔ اس نے چولہا بند کیا اور سنک سے ہاتھ دھونے لگی۔

"آپ بھی ناشتا کر لیں" اس نے اصرار کیا۔

"جی میں وہ اماں اور مدیحہ کے ساتھ کروں گی۔" اس نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔

"ارے آجائیں یہ پراٹھا آپ کھالیں۔" اس نے دوسرے پراٹھے کو دیکھ کر اسے بلایا۔

"میں اپنے لیے اور بنالوں گی آپ اچھی طرح ناشتا کیجیے۔" اس نے نظریں چرا لیں اس کا سامنا کرنے سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔

"اچھا تو میرے خلاف آپ سازش کر رہی ہیں۔" وہ چائے کی چسکی لے کر مسکرانے لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ گھبرا سی گئی۔

"مطلب تو صاف ظاہر ہے آپ مجھے موٹا بنا رہی ہیں اور میں موٹا ہو گیا تو پھر کسی کام کا نہیں رہوں گا۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

"نہیں نہیں ایسی بات ہرگز نہیں۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

"تو چلیے پھر ناشتے میں میرا ساتھ دیں۔" اس نے آدھا پراٹھا پلیٹ میں رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

"جی اچھا میں کھا لیتی ہوں مگر آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔" وہ اسٹول پر بیٹھ گئی اور نظریں جھکا کر پراٹھا کھانے لگی۔

"آپ بہت اچھی ہیں۔" اس نے یک دم اس کی تعریف کر دی اس کا نوالہ حلق میں اٹک گیا وہ کھانسنے لگی وہ تیزی سے اٹھا اور نل میں سے پانی کا گلاس بھر کر اسے تھمایا۔ وہ آہستگی سے پانی پینے لگی اس کو یوں لگا جیسے اس کی دھڑکن وہ سن لے گا اس کا دل جو زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"آپ اچھی نہیں ہیں۔" وہ اسٹول پر بیٹھا اور چائے کا کپ تھام کر بولا۔ وہ مسکرائی اور نظریں جھکا لیں۔

"دیکھا جب تعریف کی تو آپ ڈر کر کھانسنے لگیں اور جب برائی کی تو آپ مسکرا رہی ہیں توبہ توبہ لڑکی کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔" وہ چائے کا سپ لے کر مسکرانے لگا۔

"جتنا مشکل عورت کو سمجھنا ہوتا ہے اس طرح

ایک عورت کے لیے بھی مرد کو سمجھنا اتنا ہی مشکل بلکہ کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں جی اگر آپ مجھے سمجھنا چاہتی ہیں تو مجھے بتائیے آپ کو مجھ میں کیا مشکل لگ رہا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"بھائی جان آپ بعد میں آپی کو سمجھا لیجیے گا ابھی آپ کو آفس سے دیر ہو گئی ہے ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔" مدیحہ باورچی خانے کے دروازے سے داخل ہوتی ہنستے ہوئے بولی۔ تو وہ بوکھلا سا گیا۔

"اومائی گاڈ۔۔۔ میں چلتا ہوں۔" وہ مسکراتا ہوا ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

صبح کے ناشتے کے بعد اس نے گھر کی صفائی کی۔ کلثوم اور سکینہ سبزی لینے چلی گئیں اور مدیحہ اوپر اپنے پورشن میں تھی۔ اس نے صفائی ختم کی۔ اور مدیحہ کے پاس اوپر پورشن کی طرف چلی گئی۔ ابھی وہ کمرے سے باہر تھی کہ اسے مدیحہ کی آواز سنائی دی۔

"نہیں نہیں عثمان ایسا نہیں ہو سکتا اماں مجھے رات کو باہر جانے کی اجازت نہیں دیں گی۔" اس نے اپنے قدم روک لیے اور منہ میں بڑبڑائی۔

"عثمان یہ عثمان کون ہے جبکہ مدیحہ کے منگیتر کا نام تو فراز ہے۔"

وہ خود سے مخاطب ہوئی۔ "مدیحہ کے پاس سیل فون ہے۔۔۔؟ اس نے بتایا کیوں نہیں اور وہ اتنی اپ سیٹ کیوں ہے؟ اور یہ عثمان کون ہے؟" وہ سوچ رہی تھی کہ مدیحہ نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے کرن کو دیکھ کے وہ گھبرا سی گئی اور اچانک اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مدیحہ۔۔۔ کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"آپی۔۔۔ آپی میں بہت بری لڑکی ہوں میں بہت بری ہوں۔" اس نے اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور روتے روتے جواب دیا۔

"مدیحہ ادھر دیکھو میری طرف پلیز۔" اس نے پیار سے کہا۔

"آپی مجھے مر جانا چاہیے اسی میں سب کی بھلائی ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔" اس نے غصہ سے اسے جھنجھوڑا۔

"آپی میں پاگل ہی تھی جس نے عثمان سے دوستی کرلی تھی اور اب پچھتا رہی ہوں۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"کون ہے یہ عثمان بتاؤ۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپی یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا مجھے بعد میں علم ہوا کہ وہ سب لڑکیوں کو اپنی محبت کے جال میں پھانس کر ان سے برے کام کرواتا ہے۔ میں بھی اس کے جال میں پھنس چکی ہوں۔" وہ کانپنے لگی تھی۔

"ادھر بیٹھو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ!!! تم نے کوئی ایسا کام۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں آپی نہیں پلیز مجھے اس بیمار شخص سے بچالیں اس کے پاس میرے خطوط میری تصویریں ہیں۔ جس سے اب وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے امیر دوستوں کے ساتھ چکر چلاؤں اور ان سے پیسہ لے کر اسے دیتی رہوں اور میں نے اپنی عزت کی خاطر اس کے امیر دوست اکبر کو پھانس کر اس سے کافی رقم لی اور عثمان کو دی پھر میرا ایم اے ختم ہو گیا تو میرا یونیورسٹی جانا بند ہو گیا، میں نے سکھ کا سانس لیا مگر عثمان نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میرے محلے کے لڑکے ذیشان سے اس نے دوستی کرلی مجبوراً مجھے اس سے رابطہ کرنا پڑا اور یوں اس نے مجھے سیل فون دے دیا میں اکبر کو ابھی بھی جھوٹی محبت کا دھوکا دے کر اس سے پیسہ لے کر اسے دے رہی ہوں میں آپی مر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے عثمان کی حقیقت بتادی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے برف ہو گئے اور اسے یوں لگا جیسے کہ وہ زمین پر گر جائے گی۔

☼ ☼ ☼
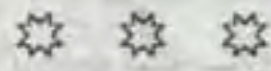
اس نے بجھے دل سے کھانا لگایا آج اس نے مدیحہ کی پسند پر مسالا بھرے کریلے پکائے تھے اماں اور خالہ کلثوم کو کھانا دے کر وہ اوپر پورشن میں اس کے لیے کھانا لے کر گئی۔ جس نے خود کو بیمار کہہ کر بستر پکڑ لیا تھا۔ وہ کمرے میں پہنچی تو اسے بستر پر افسردہ پایا وہ سوچوں میں گم تھی۔

"مدیحہ میں کھانا لائی ہوں کھانا کھالو۔" اس نے پیار سے کہا اور اس کے پاس جا بیٹھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے وہ کب سے رو رہی ہو۔

"مدیحہ خود کو سنبھالو اس طرح تو خالہ جان کے علم میں بات آجائے گی تم اپنا حلیہ تو دیکھو۔" اس نے اس کے بالوں کو سلجھایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپی میں کیا کروں میں عثمان سے آزاد ہونا چاہتی ہوں وہ مجھے اپنے اک نئے دوست سے ملوانا چاہتا ہے عظیم اس کا دوست لندن سے آیا ہے اور اگر کل رات میں اس سے ملنے نہ گئی تو وہ مجھے بدنام کردے گا میری تصویریں میرے خط ارسلان بھائی کو دے جائے گا۔ اف خدایا میں نے عثمان پر اعتبار کر کے کتنی بڑی غلطی کردی ہے۔" وہ پچھتا رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا میں تمہارے ساتھ ہوں کوئی تمہیں بدنام نہیں کر سکے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم میری بات عثمان سے کروا دو میں خود اس انسان کو دیکھ لیتی ہوں۔" اس نے ہمت سے جواب دیا۔

"آپی وہ بہت برا ہے میں آپ کی عزت کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" وہ روتے روتے بولی۔

"مدیحہ میں اس سے بات کروں گی تو کوئی حل ضرور نکلے گا۔" اس نے پیار سے سمجھایا۔

"آپی اچھا میں فون کرتی ہوں۔" اس نے تکیے سے سیل فون نکالا اور اس کے نمبر پر کال ملائی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری آواز ابھری۔

"ہیلو ڈارلنگ بہت اچھا کیا جو تم نے جلدی فون کرلیا۔" اس نے بات کر کے قہقہہ لگایا۔

"عثمان میری آپی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔" وہ غصے سے بولا۔

مدیحہ کے چہرے پر خوف کے تاثر دیکھ کر کرن نے فون لے لیا۔

"ہیلو عثمان میں مدیحہ کی آپی کرن بول رہی ہوں میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے مضبوط لہجے میں بات کی۔ وہ ہنسا۔

"کیوں ملنا چاہتی ہیں۔"

"مجھے وہ تمام خطوط اور تصویریں چاہئیں۔"

"اچھا جی مطلب آپ مجھ سے سودا کرنا چاہتی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" اس نے اپنا لہجہ مضبوط رکھا جب کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اچھا تو ٹھیک ہے۔ مجھے تو پیسوں سے غرض ہے۔ اگر آپ پیسہ دے دیں تو میں سب کچھ آپ کے حوالے کردوں اور پھر کبھی بھی مدیحہ کو فون نہیں کروں گا۔" اس نے تاجرانہ انداز سے بات کی۔

"آپ کو کتنے پیسے چاہئیں۔" وہ بولی۔

"چلیے آپ لوگوں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا آپ لوگ ایک لاکھ کا ارینج کردیں اس سے میرا کام چل جائے گا۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں پیسوں کا ارینج کر کے تمہیں کال کرلوں گی۔" اس نے پھر فون بند کردیا۔

"آپی اس نے کتنے پیسے مانگے ہیں اور ہم پیسوں کا انتظام کیسے کریں گی۔"

"ایک لاکھ مانگ رہا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"کیا؟ کیا ایک لاکھ" مدیحہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہاں وہ ایک لاکھ مانگ رہا ہے اور پھر وہ تمہیں کبھی فون نہیں کرے گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"آپی ہم ایک لاکھ کہاں سے لائیں گے؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا اور پھر رونے لگی۔

"تم کیوں رو رہی ہو تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تم اس سے آزاد ہو جاؤ گی۔" اس نے پیار سے ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

"آپی میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔ میں کہاں سے اتنے پیسوں کا بندوبست کروں گی۔" اس نے روتے ہوئے اپنے دل کی بات بیان کی۔

"میں ہوں نا میں ایک لاکھ کا بندوبست کر لوں گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں اسے تسلی دی۔

"آپی اتنی بڑی رقم آپ کے پاس کہاں ہو گی۔" اس نے فکر مندی سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"کیا؟" وہ فکر مندی سے بولی۔

"آپی بتائیے پلیز آپ کیا کریں گی؟" وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

"مدیحہ بس تم اپنا حلیہ درست کرو اور کھانا کھاؤ اب تم ریلیکس ہو جاؤ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔" اس نے پیار سے اسے سمجھایا۔

"نہیں آپی نہیں پلیز مجھے بتائیے اتنی بڑی رقم آپ نہیں، نہیں میں اپنی وجہ سے آپ کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی ہوں۔" وہ گھبرا کر بولی اور پھر رونا شروع کر دیا۔

"مدیحہ میں کسی مشکل میں نہیں آؤں گی میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اپنا سونے کا سیٹ فروخت کر دوں گی۔" اس نے پیار سے کہا۔

"کیا کیا مطلب؟ آپ اپنی شادی کا سیٹ، نہیں نہیں، اس سے تو اچھا ہے کہ میں زہر کھا کر مر جاؤں۔" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"خبردار جو آئندہ اس طرح کی بات کی۔" اس نے غصے سے اسے جواب دیا۔

"آپی مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر دے دیں میں جینا نہیں چاہتی۔" وہ اس کے گلے سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بس بس مدیحہ چپ ہو جاؤ میں تمہاری آپی ہوں نا تو بس اپنی ساری فکریں مجھے دے دو۔" اس نے مدیحہ کے سر پر پیار کیا۔ مدیحہ رو رہی تھی اور وہ اسے دلاسا دے رہی تھی جبکہ وہ اندر سے خوف زدہ تھی کہ کہیں عثمان جیسا شخص ان کو دھوکا نہ دے جائے۔

☼ ☼ ☼

اس نے سکینہ کو دوائی دے کر سلا دیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سونے کے سیٹ کے متعلق اماں پوچھیں گی۔ تو پھر اس کے پاس کیا جواب ہو گا وہ فکر مند سی ہوئی اس سے پہلے کہ وہ مزید سوچتی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دوپٹہ سنبھالا اور دروازہ کھولنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔

"السلام علیکم۔" وہ شوخی سے بولا۔

"وعلیکم السلام ـــــــ" وہ افسردہ چہرے پر مسکراہٹ سجا کے بولی۔

"آج کھانے میں کیا ملے گا۔" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"جی مسالا بھرے کریلے پکائے ہیں۔"

"واہ واہ میری تو روز ہی عید ہوتی ہے میں ابھی چینج کر کے آتا ہوں آپ پلیز میرے لیے کھانا گرم کر دیجیے۔" اس نے معصومیت سے حکم دیا۔

"جی ضرور" وہ مسکرائی۔

"آپ بہت اچھی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور مسکرانے لگی۔

"شکر ہے کہ صبح کی طرح آپ کو کھانسی نہیں آئی اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میری تعریف سننے کی عادت پڑ گئی۔" وہ شوخ سا ہو گیا۔

"اچھا اچھا آپ چینج کر لیں میں روٹیاں پکا لوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہو آپ بے شک پہلے سے روٹیاں بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ لیا کریں۔ اب رات کو کہاں آپ روٹیاں پکائیں گی سارا دن کام کر کے تھک جاتی ہیں اور میں ہوں جو آپ کو رات میں ڈسٹرب کرنے چلا آتا ہوں۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"نہیں میں باورچی خانے کے کام سے نہیں تھکتی ہوں۔ آپ فریش ہو جائیے۔" اس نے ارسلان کی شرمندگی کو زائل کرنا چاہا۔

"جو حکم آپ کا۔" وہ ہنسا اور سیڑھیاں چڑھ گیا اور وہ اسے دیکھتی رہی جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔

باورچی خانے میں آ کر اس نے چولہا جلایا۔ اور توا رکھ کر فریج میں سے آٹے کی پرات نکال لی۔ وہ تنہا تھی تو پھر مدیحہ کے واقعے نے اسے جکڑ لیا وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"مجھے ارسلان کی عزت کی حفاظت کرنی چاہیے سونے کا سیٹ تو پھر بن سکتا ہے مگر مدیحہ بدنام ہو گئی تو ارسلان کبھی سر اٹھا کر جی نہیں سکے گا مجھے اماں سے پوچھے بغیر یہ قدم اٹھانا پڑے گا جب اماں کے علم میں بات آئے گی تو شاید تب انہیں سمجھانے کے لیے میرے پاس معقول جواب ہو۔" اس نے سوچتے ہوئے پھر پیڑا لیا اور روٹی بیلنے کے بعد اسے توے پر ڈال دیا۔

پھر وہ عثمان کے رویے کے متعلق سوچنے لگی کہ وہ بدتمیز شخص کہیں اس سے ایک لاکھ لے کر بھی ان لوگوں کو ڈسٹرب کرتا رہا تو پھر کیا ہو گا۔ وہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ توے پر پڑی روٹی جل گئی۔ ارسلان نے اسے پکارا تو وہ چونکی۔

"اوہو روٹی جل گئی۔" اس نے توے کی طرف دیکھا تو روٹی پوری جل چکی تھی۔

"آپ کہاں کھو گئی ہیں۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"نہیں وہ..... بس کچھ نہیں۔" اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"آپ شاید سو گئی تھیں۔ میں کل جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے روٹی جلنے پر خود کو قصوروار ٹھہرایا۔

"نہیں..... نہیں بس دھیان میرا اماں کی طرف چلا گیا ان کا بی پی اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ اور وہ دوائیاں بھی نہیں لینا چاہتیں۔" اس نے بات پلٹی اور دوسری روٹی کو بیلنا شروع کر دیا۔

"آپ خالہ جان کی طرف سے فکر مند نہ ہوں انہیں کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے تسلی دے کر جمائی لی۔

"آپ تھک گئے ہیں اور آپ کو نیند بھی آ رہی ہے۔" اس نے ارسلان کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں آج آفس میں بہت کام تھا۔" اس نے اپنی آنکھیں دباتے ہوئے جواب دیا۔ اور مسکرایا۔

"آپ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھیے۔ میں کھانا اوپر لے آتی ہوں۔" روٹی توے پر ڈال دی اور دوسری روٹی کا پیڑا بنا لیا۔

"نہیں اوپر چلا گیا تو بستر پر بیٹھتے ہی سو جاؤں گا میں یہاں باورچی خانے میں بیٹھ جاتا ہوں۔" اس نے اسٹول پکڑا۔ اور بیٹھ گیا اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ اس نے سالن گرم کر لیا۔ اور ایک روٹی سمیت کھانا اسے پیش کیا دوسری روٹی بھی اس نے توے سے اتار لی۔

"بس مزید روٹی نہ پکاؤ۔" اس نے تیسری روٹی کا پیڑا بنایا تو اس نے روکا۔ وہ الجھی الجھی اسے دکھائی دی اس نے خاموشی سے پیڑا ہاتھ سے رکھ دیا اور کام سمیٹنے لگی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی۔" وہ گھبرا کر بولی اور اپنا منہ دھونا شروع کر دیا۔ مگر اس کا زرد چہرہ کھل نہ سکا اپنی کیفیت اس سے سنبھل نہیں رہی تھی تو اس نے وہاں زیادہ دیر کھڑا رہنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ باورچی خانے سے نکل گئی تو ارسلان فکر مند سا ہو گیا اس نے بجھے دل سے کھانا کھایا۔

اپنے کمرے میں آکر لیٹا تو اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ کروٹیں بدلنے لگا۔ "اف خدایا میں کیوں اس کے لیے اتنا بے چین ہو رہا ہوں۔" اس نے خود کو مخاطب کیا اور چلتے پنکھے کو دیکھنے لگا۔ اسے چلتے پنکھے میں اس کا اداس چہرہ نظر آنے لگا اس نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں مگر اس کا چہرہ پھر بھی چھایا رہا۔ "مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں کیوں اسے سوچ رہا ہوں کہیں مجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی ہے؟" وہ گھبرا سا گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ اپنی کیفیت کو سمجھنا چاہتا تھا۔ مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ محبت ہے یا پھر اس کا خیال کرنا ہے۔ وہ سوچتے سوچتے کب سو گیا وہ نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ارسلان جلدی جلدی تیار ہوا اور پھر نیچے اتر آیا مگر اس کا دل یک دم بجھ سا گیا وہ باورچی خانے میں نہ تھی اس کی جگہ خالہ سکینہ ناشتا بنا رہی تھیں۔

"آؤ بیٹا میں نے ناشتا تیار کر دیا ہے۔" انہوں نے پیار سے ناشتا ٹیبل پر رکھتے کہا۔

"خالہ جان آپ نے کیوں زحمت کی" وہ شرمندہ سا ہوا اور اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"بیٹا زحمت کیسی؟ اپنے لیے ناشتا بنانے آئی تو سوچا کہ تمہارے لیے بھی بنا دوں کرن کو بخار ہو گیا اس لیے وہ نہ اٹھ پائی۔" سکینہ نے افسردگی سے اطلاع دی۔

"وہ کل رات ہی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔" اس نے بتایا۔

"آج دوائی لا کر کھائے گی تو ان شاء اللہ بہت جلد اس کا بخار اتر جائے گا۔" سکینہ نے اس کے اداس لہجے پر تسلی دی۔

"ان شاء اللہ۔" اس نے صدق دل سے کہا اور ناشتا کرنے لگا۔ سکینہ نے اپنے لیے تھرموس میں سے چائے کا کپ بھرا اور اسٹول پر بیٹھ کر بولیں۔

"بیٹا ابھی تو پہلی تاریخ بھی نہیں آئی کہ تم نے دو دن پہلے ہی کرایہ کرن کو تھما دیا کیا میں تمہارے لیے مالک مکان جیسی ہوں۔"

"کرایہ؟" اس کے حلق میں نوالہ پھنس گیا اور وہ کھانسنے لگا۔

"پانی پیو بیٹا۔" سکینہ نے پیار سے اسے گلاس تھمایا اور وہ پانی پیتا چلا گیا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ سکینہ کو اس بات کا کیا جواب دے مگر سکینہ نے دوسری بات چھیڑ دی۔

"بیٹا تمہاری ملازمت کیسی چل رہی ہے؟"

"جی خالہ جان سب ٹھیک چل رہا ہے۔" اس نے مجبوراً کہا جبکہ وہ ایک ہفتہ پہلے فکر مندی سے سوچ رہا تھا کہ وہ خالہ سکینہ سے کرائے کی بات کرے گا کہ اگلے مہینے دو ماہ کا کرایہ اکٹھا ادا کر دے گا مگر کرن نے اس کی تمام فکریں اک پل میں ہی دور کر دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آپی میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" وہ فکر مند سی بولی جب اس نے الماری میں سے سونے کا سیٹ نکال کر اک بلیک کلر کے شاپر میں رکھا۔

"نہیں نہیں مدیحہ میں اکیلی جاؤں گی۔" اس نے پیار سے اسے دیکھ کر جواب دیا اور چادر اوڑھ لی۔

"آپی وہ بہت خطرناک ہے۔" اس نے کہا۔

"بے شک ہمارے ساتھ ہمارا اللہ ہے اور تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں میں نے کھانا بنا دیا ہے اور اماں سے کہہ دیا ہے کہ میں دوائی لے کر اپنی سہیلی ہادیہ کی طرف بھی جاؤں گی اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

"آپی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے آپ اپنی سہیلی ہادیہ کے ساتھ وہاں چلی جائیں۔" اس نے لرزتی آواز سے مشورہ دیا وہ عثمان کی گندی نگاہ سے واقف تھی۔

"بس تم فکر مت کرو اور گھر کا خیال رکھنا۔" اس

نے وال کلاک پر نظری ڈالی سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ ابھی اسے سونے کا سیٹ بھی فروخت کرنا تھا اور پھر شام چھ بجے ہوٹل ریڈ میں عثمان کو پیسے دے کر سب ثبوت حاصل کرنے تھے وہ مدیحہ کی دعاؤں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

مارکیٹ میں پہنچی تو اسے مایوسی ہوئی ہر کوئی اس کے ڈیڑھ لاکھ کے سیٹ کو اسی نوے ہزار میں لینے کو تیار تھا وہ سونے کی ہر دکان میں گئی اسے ایک لاکھ چاہیے تھے مگر ہر کوئی سیٹ کی کم قیمت لگا رہا تھا وہ بہت پریشان سی ہو گئی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور پھر ایک دکان میں گھس گئی دکان میں بہت رش تھا وہ دکان کے مالک کے پاس پہنچی۔

"جی بہن کیا لینا ہے؟" دکان دار نے پوچھا۔ اس نے سونے کا سیٹ شاپر سے نکالا۔

"میں یہ سیٹ فروخت کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے سیٹ کا ڈھکن کھول کر دکان دار کو دکھایا۔

"واہ کتنا پیارا سیٹ ہے۔" اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی لڑکی نے دیکھتے ہی کہا وہ حیرانی سے اس لڑکی کو دیکھنے لگی۔ کرن کے پاس جو سونے کا سیٹ تھا وہ سکینہ نے بہت پیار سے بنوایا تھا۔ وہ دکان دار سے مخاطب ہوئی۔

"مجھے یہ سیٹ فروخت کرنا ہے۔" اس نے لڑکی کے بجائے دکان دار سے کہا۔

"سعد دیکھو یہ سیٹ۔" لڑکی نے سیٹ اپنی طرف کر لیا اور وہ اپنے ساتھ کھڑے لڑکے کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"بہت اچھا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا اور پھر اس نے دکان دار سے پوچھا۔

"بھائی صاحب کیا قیمت ہے اس سیٹ کی؟" اس نے مڑ کر دیکھا سامنے ڈاکٹر سعد کھڑے تھے ڈاکٹر سعد اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"آپ اور یہاں" وہ مزید گھبرا سی گئی ڈاکٹر سعد کے پاس تو وہ اماں کا علاج کروا رہی تھی اور ان سے اچھی سلام دعا تھی۔

"سعد مجھے یہ سیٹ ہی خریدنا ہے۔" پیچھے سے پھر لڑکی نے زور دیا۔

"حمنہ ان سے ملو یہ کرن ہیں ان کی والدہ میری پیشنٹ ہیں۔" حمنہ نے پیار سے ہاتھ ملایا اور ہنس کر بولی۔

"یہ سیٹ آپ کتنے کا فروخت کرنے آئی ہیں۔ میں یہ سیٹ لینا چاہتی ہوں۔" ڈاکٹر سعد نے حیرت سے کہا۔

"یہ سیٹ آپ کا ہے کیا؟"

"جی جی۔" وہ گھبرا گئی کہ اب کہیں ڈاکٹر سعد نے اس سیٹ کا تذکرہ اماں سے کر دیا تو کیا ہو گا۔ ڈاکٹر سعد نے اسے فکر مند دیکھا تو بولے۔

"گھر میں سب خیریت ہے؟" اس کے بجھے چہرے کو بھانپ کر وہ بھی فکر مند دکھائی دینے لگے۔

"جی جی سب خیریت ہے۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔ حمنہ بھی فکر مندی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے زرد چہرے سے دونوں نے محسوس کر لیا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔

"اچھا تو پھر بتائیے یہ سیٹ کتنے کا ہے؟" سعد نے مزید اسے شرمندہ نہ ہونے دیا جو سر جھکائے کھڑی تھی۔

"جی ڈیڑھ لاکھ کا تھا مگر اب کوئی بھی اس کا لاکھ روپے بھی نہیں دے رہا یہ سیٹ تین تولے کا ہے۔" اس نے وضاحت دی۔ دکان دار جس کا سعد گاہک تھا اس نے حمایت کر کے کہا۔

"ڈاکٹر سعد آپ اسی ہزار دے دیں یہ سودا مناسب ہو گا۔" وہ گھبرا سی گئی اب وہ ڈاکٹر سعد کو انکار بھی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے برے وقت میں اس کی اماں کے لیے اسپتال میں بہت کچھ کیا تھا۔ جب سکینہ ان کے اسپتال میں بیمار ہو کر داخل ہوئی تھیں۔

"کرن آپ کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟" سعد نے دکان دار کی بات پر توجہ نہ دی اور اس سے پوچھ

لیا۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"جی مجھے ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔" اس نے لرزتی آواز سے بتایا۔ حمنہ فکر مندی سے بولی۔

"کرن تم اپ سیٹ لگ رہی ہو کیا بات ہے؟" اس کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھ کر حمنہ نے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ گھبرائی سعد نے اپنا والٹ جیب سے نکالا اور پانچ ہزار کے بیس نوٹ گن کر کرن کی طرف بڑھائے۔ کرن نے کانپتے ہاتھوں سے پیسے تھام لیے اور شکریہ ادا کیا۔ حمنہ نے پھر اسے پیار سے کہا۔

"آپ ہماری شادی پر ضرور آئیے گا سعد انہیں تم ضرور شادی کا کارڈ دینا۔"

"شادی تم نے ایک سال کے بعد رکھی ہے۔" اس نے مسکرا کر حمنہ کو یاد دلایا۔ دونوں ہنسنے لگے اور اس نے بھی مجبوراً" ان کا ساتھ دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ریڈ ہوٹل میں ساتھ بجے تک پہنچ گئی۔ اتنے بڑے ہوٹل میں اندر جاتے وقت اسے ڈر لگ رہا تھا اس نے پرس سے سیل فون نکالا اور عثمان کے نمبر پر کال کی۔ یہ سیل فون وہ مدیحہ سے لے کر آئی تھی۔ اسے ایک لاکھ کے ساتھ یہ سیل فون بھی اسے واپس دینا تھا کہ پھر وہ کبھی مدیحہ کی زندگی میں واپس نہ آسکے۔

ایک ٹیبل پر اس نے ایک لڑکے کو دیکھا جس نے اپنا سیل فون اٹھایا سیل فون سے آواز ابھری۔

"جی مجھے علم ہے کہ آپ ریڈ ہوٹل میں آچکی ہوں آپ نے بلیک چادر اوڑھ رکھی ہے اور میں آپ کے سامنے ٹیبل پر بیٹھا ہوں جسے آپ دیکھ رہی ہیں۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔

وہ اس کی طرف اپنے قدم بڑھانے لگی۔ اسے اپنا ایک ایک قدم اٹھانا بہت بھاری لگ رہا تھا۔ مگر مدیحہ کی عزت کی خاطر اسے یہ کرنا تھا۔

"آئیے بیٹھیے۔" وہ مسکرایا وہ دھڑکتے دل سے بیٹھ گئی اور ارد گرد بیٹھے لوگوں کو فکر مندی سے دیکھنے لگی۔

"آپ چائے لیں گی یا پھر جوس؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ غصے سے بولی۔

"مجھے مدیحہ کی سب چیزیں دے دو میں وعدے کے مطابق پیسے لے آئی ہوں۔" اس نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔

"گڈ ویری گڈ۔" وہ ہنسا اور اس نے ایک پیکٹ اپنی جیب سے نکالا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ پیکٹ کو گھورنے لگی۔

"آپ مدیحہ سے زیادہ پیاری ہیں۔" اس نے پیکٹ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ غصے سے بولی۔

"دیکھیے میں یہاں آپ کی بکواس سننے نہیں آئی ہوں۔" اس نے پرس میں سے ایک لاکھ روپے نکال کر ٹیبل پر رکھ دیے اور اسے تیکھے لہجے میں بولی۔

"آپ کی ڈیمانڈ پوری کر دی اب مزید تماشا کیا تو پھر مجھے دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"آپ خوب صورت ہیں اور عقل مند بھی ماشاء اللہ مجھے ایسی ہی لڑکی چاہیے۔ جو میری زندگی سنوار دے۔" وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ کرن کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے مگر وہ ہوٹل میں کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتی تھی اسے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنی تھیں۔

"دیکھیے میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں آپ کی کوئی بات مزید نہیں سن سکتی اگر آپ کو روپے نہیں چاہئیں تو میں دوسرے طریقے سے یہ سب چیزیں حاصل کرلوں گی۔" وہ روپے واپس پرس میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے یک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مضبوطی سے واپس کرسی پر بٹھا لیا وہ اس حملے سے گھبرا گئی۔

"چھوڑیے۔" وہ غصے سے اپنا ہاتھ چھڑوانے لگی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے سہلانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے سامنے دور ڈاکٹر سعد کو دیکھا جو ایک آدمی سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"ڈاکٹر سعد۔" اس نے بلند آواز سے پکارا، عثمان اس کے رد عمل پر گھبرایا، سعد نے اسے ٹیبل پر دور بیٹھا دیکھ لیا، وہ اس کی طرف بڑھنے لگے، عثمان بوکھلا سا گیا جس کی فیملی سے ڈاکٹر سعد کے اچھے تعلقات تھے۔ اس سے پہلے کہ سعد ان تک آتے عثمان نے وہ پیکٹ اسے تھمایا اور غصے سے بولا۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ مدیحہ کی زندگی سے میں نکل جاؤں تو تم ڈاکٹر سعد سے میرا تذکرہ نہیں کرو گی۔" پھر وہ یہ کہہ کر منہ چھپا کر نکل گیا۔ اور وہ ٹیبل پہ بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اسے اچھے طریقے سے شکریہ کہنا چاہیے۔" آفس سے نکلتے ہوئے اس نے کرن کے متعلق سوچا۔

"چاکلیٹ لے لیتا ہوں" وہ اس خیال کو رد کرتے ہوئے مسکرایا نہیں نہیں یہ بچکانہ حرکت ہوگی۔ مجھے اس کے لیے پھول لینے چاہئیں۔ اس نے اپنی جیب سے والٹ نکالا اور پیسے دیکھے اس کے والٹ میں تین سو روپے تھے۔ وہ افسردہ ہو گیا۔

"کاش کہ میں اس کے لیے اچھا سا سوٹ خرید سکتا چلو سو روپے کے پھول خرید لیتا ہوں۔ پھول اسے پسند آئیں گے۔" اس نے خود کو تسلی دی اور پھر ایک شاپ سے اس نے تازہ گلاب کا گلدستہ بنوا لیا اور گھر کی طرف راہ لی۔

وہ گھر کے راستے پر پھول کے گلدستے کو دیکھ کر چلا آرہا تھا کہ گھر سے تھوڑے فاصلے پر اک گاڑی رکی اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب اس گاڑی سے رات کے گیارہ بجے کرن نکلتی نظر آئی گاڑی کی دوسری جانب سے ایک لڑکا اترتا دکھائی دیا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" کرن کے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے ایک پیکٹ بہت مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

"جی میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔" سعد نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"نہیں میں چلی جاؤں گی۔ بس اماں کو اس بات کا پتا نہ چلے۔" اس نے پھر سے وعدہ مانگا۔

"آپ بے فکر ہو کر گھر جائیے۔" اس نے کرن کے کانپتے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"پلیز خود پر قابو پائیے ورنہ آپ کی والدہ اس حادثے سے اپ سیٹ ہو جائیں گی۔" اس نے پیار سے سمجھایا۔

"چلیے خود کو ریلیکس کیجیے۔" ڈاکٹر سعد نے تسلی دی۔ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لائی اور پھر اس نے لمبی سانس لی۔

"جی میں ٹھیک ہوں اب۔"

"او کے خدا حافظ۔" وہ پھر اپنی گاڑی میں آبیٹھے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی جب تک گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی وہ وہاں کھڑی رہی، ارسلان دور سے اسے ترستی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور پھر اس کے ہاتھ پھولوں کو مسلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گیا کمرے میں اس نے اپنی اماں کو سوتے دیکھا۔ مدیحہ اسے اپنے بستر پہ نہ دکھائی دی اس نے پھولوں کا گلدستہ اپنی الماری میں پھینک دیا جس پر ایک چھوٹا سا کارڈ کرن کے نام کا لکھا ہوا تھا۔ وہ گلدستے سے الگ ہو کر فرش پر جا پڑا وہ اس سے بے خبر تھا اور مدیحہ کو غصے سے پکارنے لگا۔

مدیحہ جو باورچی خانے میں کرن کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی تھی ارسلان کی غصیلی آواز پر گھبرا گئی۔

"بھائی اتنے غصے میں کیوں ہیں۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

"دروازہ کھلا تھا کیا؟" مدیحہ نے گھبرا کر پوچھا اور

کرن کو دیکھنے لگی۔

"میں دروازہ شاید بند کرنا بھول گئی تھی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"کہیں بھائی نے میری اور آپ کی باتیں تو نہیں سن لیں۔" مدیحہ گھبرا گئی۔

"تم ڈرو مت۔" اس نے مدیحہ کو تسلی دی۔ جس کا رنگ فق ہو گیا۔

ارسلان کی آواز پھر صحن سے ابھری مدیحہ اور کرن صحن کی جانب بڑھیں مدیحہ اس کے سامنے پہنچی اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چیخا۔

"کہاں تھیں کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔" اس نے کرن کو نظرانداز کر کے بات کی۔

"وہ بھائی میں کرن آپی کے ساتھ بات کر رہی تھی۔" اس نے مسکراہٹ بمشکل ہونٹوں پر سجائی۔

"میرے لیے کھانا گرم کر کے لے آؤ۔" اس نے مدیحہ کو غصے سے حکم دیا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔

مدیحہ اور کرن ایک دوسرے کو فکر مندی سے تکنے لگیں۔ ارسلان کی یہ بے رخی دیکھ کر کرن نے بمشکل اپنے آنسوؤں پر ضبط کیا مگر وہ ناکام رہی۔ اور روتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

مدیحہ صحن میں پریشان کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اسے کرن کے رونے پر اور ارسلان کے بلاوجہ غصے کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد باورچی خانے میں آکھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں سیڑھیوں کی طرف بار بار جا رہی تھیں وہ اس کی منتظر تھی۔۔۔ کل رات اس کے رویے سے کافی پریشان تھی کہ وہ اسے سیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دیا اس نے جھٹ سے نظریں چرا لیں اور پراٹھا بیلنے لگی وہ باورچی خانے میں آنے کے بجائے سیدھا باہر کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔۔۔ مجبوراً" اس نے پکارا۔

"سنیے۔ ارسلان۔۔۔" وہ باورچی خانے کے دروازے کے باہر آکھڑی ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے کل رات وہ سو نہ سکا ہو۔

"ارسلان۔۔۔ ناشتا کر لیں۔" اس نے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کا چہرہ اداس تھا۔

"آپ ٹفن لے جائیے۔" اس نے دھڑکتے دل سے مشورہ دیا جبکہ اسے صاف صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرنا ہی نہیں چاہ رہا۔

"نہیں روز روز ٹفن لے کر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا میں آفس کی کینٹین سے کچھ منگوالوں گا۔" اس نے بےزاری سے جواب دیا۔

"آپ کے من پسند گوبھی کے پراٹھے بنائے ہیں۔" اس نے ارسلان کو ناشتا کرنے پر اکسانا چاہا۔

"آپ میری پسند کو زیادہ اہمیت مت دیا کریں مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ بےزار سا ہو گیا۔

"کیوں آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔" وہ مرجھا سی گئی۔

"مدیحہ کل سے میرا ناشتا خود تیار کر لیں گی آپ نے جتنے دن مجھے ناشتا بنا کر دیا اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

"اس میں شکریہ کیسا؟" وہ اس کے تلخ رویے پر مزید مرجھا سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"اور ہاں کرائے کے لیے بھی شکریہ مگر آپ کو کرایہ دینا نہیں چاہیے تھا۔" اس نے خفگی بھرے لہجے سے کرائے کی بات کی۔

"میں نے آپ کو دوست سمجھ کر" اس سے جملہ مکمل نہ ہو سکا۔

"آپ کے بہت سے احسانات ہیں پلیز مزید احسانات کر کے میرے ضمیر کو مردہ نہ کریں۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ارسلان" وہ اسے ہاتھ جوڑے دیکھ کر زرد سی پڑ گئی اور مزید کچھ کہہ نہ پائی۔

"کرن پلیز مجھ سے دور رہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے کسی بھی کام میں مداخلت کریں میں یہاں کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہوں اور میں اپنا کرایہ خود ادا کروں گا آپ سے گزارش ہے کہ آئندہ مجھ پر

ترس نہ کھائیے۔" وہ غصے سے بولتا چلا گیا۔

"ترس، ارسلان آپ نے کیسے سوچ لیا۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"میں نے سوچا اس کے لیے آپ نے مجھے مجبور کیا۔ میں آج ہی آپ کو کرایہ ادا کروں گا۔" وہ خفگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ وہ خوب جھگڑے۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ سیڑھیوں پر کھڑی مدیحہ نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی وہ بھی مزید پریشان سی ہو گئی۔

اس نے بجھے دل سے ناشتا تیار کیا اور خود کو کوستی رہی کہ کیوں اس نے کرایہ اماں کو ادا کیا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ سکینہ باورچی خانے میں آکھڑی ہوئیں۔

"کیا ہوا کرن؟" سکینہ نے اسے افسردہ پایا تو حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں" وہ اپنے پاس سکینہ کو کھڑا دیکھ کر گھبرا سی گئی اور پھر اس نے بمشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔

کلثوم اور مدیحہ بھی باورچی خانے میں آکر بیٹھ گئیں۔ کلثوم مسکرا کر بولیں۔

"کرن بیٹی ہم تو کب سے کمرے میں ناشتا کا انتظار کرتے رہے مجبوراً" ہم یہاں دوڑے چلے آئے اب بڑھاپے میں بھوک برداشت نہیں ہوتی۔"

"ہاں، ہاں، کلثوم بہن ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں اچھا کیا جو باورچی خانے میں آگئیں۔" انہوں نے اسٹول پہ بیٹھ کر مسکرا کے جواب دیا۔

"بس خالہ وہ گوبھی کے پراٹھے بنانے کی غرض سے دیر ہو گئی۔" اس نے ہاٹ پاٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"واہ۔۔ واہ کیا بات ہے کرن بیٹی کی۔" کلثوم نے ایک پراٹھا پلیٹ میں لیا سکینہ نے بھی ایک پراٹھا پلیٹ میں لیا جبکہ مدیحہ نے اپنے لیے تھرموس میں سے چائے نکالی۔

"بیٹی پراٹھا لو" مدیحہ نے چائے کا سپ لیا تو سکینہ نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان پیٹ میں درد ہے۔" اس نے نظریں چرا کر جھوٹ بولا۔

"کب سے؟" سکینہ فکر مند دکھائی دینے لگیں۔

"کرن بیٹی رس ہیں تو مدیحہ کو پھر رس دے دو۔" سکینہ نے پیار سے ہدایت کی۔

"جی اماں۔" اس نے الماری کھولی اور رس کا پیکٹ مدیحہ کو تھمایا جو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔ کرن بھی ان کے پاس آکر ناشتا کرنے لگی۔ بھوک تو اس کی اڑ چکی تھی مگر وہ اپنی کیفیت سے دوسروں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"مدیحہ بیٹی، تم بھی گوبھی کے پراٹھے سیکھ لو۔ دیکھو کتنے پیلے بنائے ہیں۔" کلثوم نے پراٹھا کھاتے ہوئے تعریف کی۔

"ہاں، ہاں۔ اب وہ لوگ جلد شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں تو تمہیں اب ساری توجہ باورچی خانے کو دینی چاہیے۔" سکینہ نے پیار سے اسے نصیحت کی۔ مدیحہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ عثمان کے خوف سے ابھی تک باہر نہیں نکلی تھی۔

"خالہ جان! آپ مدیحہ کی کب شادی کر رہی ہیں۔" کرن نے پیار سے پوچھا۔

"وہ لوگ جلد شادی کا کہہ رہے ہیں اب اپنی چھوٹی بہن کو ہر وقت سمجھاتی رہا کرو کچھ پلے پڑے گا تو ہی وہاں پر گزارہ ہو گا ورنہ سسرال والے تو ایک بات پر ہزار نقص نکال دیتے ہیں۔ کیوں بہن سکینہ۔۔۔؟" کلثوم نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں یہ بات تو بہن تم نے درست کہی۔"

"اماں! مجھے شادی نہیں کرنی" مدیحہ چائے کا کپ رکھ کر بولی۔

"کیوں کیا ہوا؟" کلثوم فکر مند سی ہو گئی اور سکینہ کے ہاتھ سے بھی نوالہ چھوٹ گیا۔

"بس مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ لرزتی آواز میں بولی اور چائے کا کپ ٹیبل پر چھوڑ کر باورچی خانے سے نکل گئی۔

"مدیحہ کو کیا ہوگیا ہے یہ ایسی بات کیوں کر گئی۔" کلثوم فکر مندی سے بولیں۔

"خالہ جان کوئی بات نہیں آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔" اس نے خالہ کلثوم کو تسلی دی۔

"بہن... لڑکیوں کی شادی کی بات ہو رہی ہو تو وہ یہی رویہ اختیار کر لیتی ہیں۔" سکینہ نے کلثوم کا ہاتھ تھام کر تسلی دی کلثوم مسکرانے لگیں اور پیار سے کرن کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

"مدیحہ کی رخصتی کے بعد کرن کو بھی رخصت کرنے کا سوچ لو..." کلثوم نے اس کے سر پہ پیار دیتے مشورہ دیا۔

"ہاں... ہاں کیوں نہیں، کوئی اچھا رشتہ ملے تو...؟" سکینہ نے فکر مندی سے کہا۔ کرن نے نظریں جھکا لیں اور خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کلثوم نے پھر کرن کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور پیار سے بولیں۔

"سکینہ مجھے اپنی بیٹی دے دو بہت خوش رہے گی میرے ارسلان کے ساتھ..." کلثوم نے اپنے دل کی بات بیان کر دی جو کب سے وہ سوچ رہی تھیں۔ کرن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا سکینہ بھی خوشی سے کھل اٹھیں۔

"کیوں نہیں مجھے تو ارسلان بہت پیارا لگتا ہے اور میری طرف سے بات پکی سمجھیں۔" سکینہ نے ہنستے ہوئے کرن کے سر پر پیار دیا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے باہر نکل آئی۔

"شرما گئی دیکھا ہماری بچیوں میں حیا ہے ورنہ آج کل کی لڑکیوں میں ایسی حیا کہاں۔" سکینہ نے جواب دیا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ مدیحہ کی رخصتی کے بعد ارسلان کی منگنی کر دوں اور پھر ارسلان اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے تو دونوں کی دھوم دھام سے شادی کر دیں گے۔" کلثوم نے اپنی سوچ ظاہر کی۔

"جیسی آپ کی مرضی بہن کرن آپ کی بہو کے ساتھ ساتھ بیٹی بھی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

سکینہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا وہ دونوں بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سانوں اک پل چین نہ آوے
سانوں اک پل چین نہ آوے
سجناں تیرے بنا... سجناں تیرے بنا
ساڈا کلاں دل نوے لگ دا
سجناں تیرے بنا... سجناں تیرے بنا

ریڈیو پر گانا بج رہا تھا۔ اور وہ ارسلان کو سوچ کر اداس ہو رہی تھی کہ کہیں وہ اس شادی سے انکار نہ کر دے مدیحہ خوشی خوشی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے گلے لگ گئی۔

"کرن آپی آپ میری بھابھی بننے جا رہی ہیں۔" مدیحہ نے خوشی سے بتایا اس کا چہرہ ماں کے فیصلے پہ کھل اٹھا تھا۔ کرن نے ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ بستر پر بٹھایا اور بولی۔

"ارسلان شاید اس شادی کے لیے راضی نہ ہوں" اس نے ریڈیو بند کر دیا اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"ایسا کیوں؟ آپ کو ارسلان بھائی پسند کرتے ہیں۔" مدیحہ نے خوشی خوشی کہا۔

"نہیں مدیحہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے نمی بہنے لگی۔

"کرن آپی ایسی بات ہرگز نہیں یہ دیکھیے۔" اس نے اپنے پلو کی گرہ کھول کر ایک چھوٹا سا کارڈ اسے دکھایا۔

"پیاری کرن مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے پلیز یہ پھول قبول کر لو۔ اور اگر تم نے یہ پھول قبول نہ کیے تو میں مر جاؤں گا میں تمہارے منہ سے ہاں، صرف ہاں چاہتا ہوں ارسلان" اس نے وہ کارڈ پڑھا تو وہ روتے روتے ہنس پڑی۔

"اب یقین آگیا نا... آج کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ ارسلان بھائی کی الماری کے نیچے سے یہ کارڈ

ملا..." اس نے خوشی خوشی بتایا۔

"مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ یہ کارڈ اور پھول ارسلان بھائی نے آپ کو دیے کیوں نہیں تھے۔" اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ایک غلطی کر دی۔" اس نے اپنے پلو سے آنسو پونچھتے بتایا۔

"کیسی غلطی؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

کرن نے کرائے کی بات اسے بتائی مدیحہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولی۔

"او ہو بھائی زیادہ دیر خفا نہیں رہیں گے اور پھر آپ نے اپنا سمجھ کر ہی ان کی مدد کی ہے انہیں بہت جلد اندازہ ہو جائے گا۔" وہ ہنسی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اگر انہوں نے انکار کر دیا تو اماں کو بہت دکھ ہوگا۔" وہ افسردگی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"کرن آپی میں نے آپ کو بھابھی اور اماں نے آپ کو بہو تسلیم کر لیا ہے۔ آپ بس ارسلان بھائی کی ناراضی سے فکر مند ہیں پسند تو وہ آپ کو کرتے ہی ہیں اور تین دن بعد ان کی سالگرہ ہے ان کی سالگرہ کا سوچیں..." اس نے مسکرا کر اطلاع دی۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور بولی۔

"میں ارسلان کے لیے کڑھائی والا کرتا تیار کرتی ہوں مجھے یقین ہے کہ اسے بہت پسند آئے گا۔" اس نے سوچ کر کہا۔

"اتنی جلدی کڑھائی ہو جائے گی کیا؟" مدیحہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ہاں... ہاں میرا کڑھائی میں ہاتھ بہت تیز ہے۔" اس نے اپنے ہنر سے اسے آگاہ کیا۔

"تھینک یو بھابھی آپ نے پہلے بھی مجھے مصیبت سے نکالا آپ بہت اچھی ہیں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولی۔

"اچھا! اب عثمان کی باتیں بھول جاؤ خالہ کلثوم اور اماں سے اپنی کیفیت کو چھپا کر رکھو وہ تمہارے رویے پر گھبرا سی گئی تھیں۔"

"سچ بھابھی۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"نہیں، نہیں میں نے بات کو دوسرا رنگ دے دیا... اور اب جب سب کچھ ختم ہو گیا ہے تو کس بات کا ڈر ہے اب؟" اس نے پیار سے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"بس... بھابھی مجھے اندازہ ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں مدیحہ یہ تمہارے اندر کا خوف ہے اسے نکال کر باہر پھینک دو۔ اور اپنی شادی کے متعلق سوچو سب کچھ اچھا لگنے لگے گا۔" کرن نے اس کا گال چھو کر سمجھایا۔

"آپ سچ میں بہت اچھی ہیں بھابھی۔" وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ کرن مسکرا کر بولی۔

"ابھی بھابھی بھابھی مت پکارو ابھی ارسلان سے میری صلح نہیں ہوئی۔"

"ہاہاہا میں تو آپ کو بھابھی ہی پکاروں گی۔" اس نے کرن کا ہاتھ چوم لیا۔

اس سے پہلے کرن لب کھولتی صحن سے سکینہ کی آواز سنائی دی تو وہ دونوں صحن کی طرف بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے سکینہ کو دوائی دی اور اس کی نظریں وال کلاک پر رک گئیں۔

"بیٹی کرن تو خوش ہے ہمارے فیصلے پر؟" سکینہ نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ہاں اماں" وہ شرما کر بولی۔

"ارسلان بہت اچھا بچہ ہے تجھے بہت خوش رکھے گا۔" سکینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اماں وہ ارسلان کی سالگرہ آنے والی ہے تو میں سوچ رہی تھی کہ اس کے لیے کچھ خرید لوں۔" اس نے نظریں چرا کر بتایا۔

"ہاں، ہاں... ضرور کوئی اچھی سی چیز خرید لو اور سالگرہ والے دن اس کی پسند کی ڈش بھی بنا لینا خوش ہو جائے گا۔" سکینہ نے محبت بھرے انداز میں اسے اجازت دی۔

"اماں ارسلان کو مٹن قورمہ اور چکن بریانی اور سیخ کباب اچھے لگتے ہیں آپ کل گوشت لے آیئے گا۔" اس نے ارسلان کی پسند بتائی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں کل لے آؤں گی اور بیٹی میری طرف سے بھی کل بازار سے کوئی گفٹ لے آنا میں بھی اپنے ہونے والے داماد کو گفٹ دوں گی۔" سکینہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اماں آپ ۔۔۔ کیش دے دیجئے گا۔" اس نے جواباً" کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔ میں دو ہزار دے دوں گی وہ کوئی اچھا سا سوٹ خرید لے گا اور تم کیا لاؤ گی اس کے لیے؟" سکینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"اماں میں قمیص کا کپڑا لے آئی ہوں اس پر اچھی سے کڑھائی کر کے دے دیتی ہوں۔" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں یہ تو بہت بہتر رہے گا اور پھر ارسلان کو بھی تو علم ہو کہ میری بیٹی کتنی سلیقہ مند ہے۔" سکینہ نے مسکرا کے کہا۔ وہ ماں کی بات پر شرما سی گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا جس پر سکینہ کا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اس کی نظریں وال کلاک پر بار بار جا کر ٹھہر جاتیں مگر وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ تقریباً" بارہ بجنے کے بعد دروازے پہ دستک ہوئی اس نے جلدی سے دوپٹہ سنبھالا اور باہر کی طرف بھاگی۔ آج اس کا چہرہ رشتے کی بات پر بہت کھلا کھلا لگ رہا تھا مگر جونہی اس نے دروازہ کھولا اس کی ساری خوشی ختم ہو گئی۔ ارسلان کے چہرے پر خفگی کا تاثر تھا اس نے دھڑکتے دل سے سلام کیا وہ بے زاری سے جواب دے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"ارسلان" اس نے پکارا وہ اس کی بے رخی برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

"ہاں کہو۔" وہ مڑ کر بولا اس کے چہرے پر اداسی تھی۔

"مٹر پلاؤ اور چکن کا سالن بنایا ہے۔ کیا آپ کے لیے کھانا گرم کروں۔" اس نے نظریں چرا کر پوچھا۔

"ہاں میں ابھی چینج کر کے آتا ہوں۔" اس نے جواب دیا اور سیڑھیاں چڑھ گیا وہ اس کی بات پر تھوڑی سی مطمئن ہوئی۔

تقریباً" پندرہ منٹ کے بعد وہ باورچی خانے میں آبیٹھا اس نے کھانا ٹیبل پر لگایا اور فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالنے لگی۔

"کرن یہ آپ کے پیسے۔" اس نے پانی کی بوتل ٹیبل پر رکھی تو اس نے ہزار کے چند نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"یہ کیا؟" وہ گھبرائی۔

"یہ کرائے کے پیسے ہیں اور اگلے مہینے کا بھی ایڈوانس کرایہ دے رہا ہوں۔" اس نے خفگی سے بات کی۔

"ارسلان یہ پیسے آپ نے کسی دوست سے ادھار لیا ہے۔" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"تمہیں میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔" وہ ٹیبل سے کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارسلان میرا مطلب کہ آپ کو کسی کا احسان لینے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ یہ پیسے آپ بعد میں بھی دے سکتے تھے۔" اس نے اسے سمجھایا۔

"میں تمہارے احسان تلے مرنا نہیں چاہتا بس کرن۔" وہ غصے سے بولا اور باورچی خانے سے باہر نکلنے لگا۔

"ارسلان" اس نے لرزتی آواز سے پکارا اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مگر اپنے قدم روک لیے تھے۔ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"ارسلان مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جو آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو پلیز مجھے بتائیں اور میری وجہ سے آپ کا دل دکھے ایسا میں ہرگز نہیں چاہتی میں نے آپ کو اپنا سمجھ کر آپ کا بوجھ کم کرنا چاہا۔ میں نے آپ پر احسان نہیں کیا بلکہ۔۔۔" وہ کچھ بولنے سے پہلے ہی رو پڑی۔ اس نے پلٹ کر کوئی جواب نہیں دیا اور چھت کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☼ ☼ ☼

وہ ایرپورٹ پر اسے چھوڑنے آئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب بس جلدی سے لندن آجایئے گا۔ ماما نے کہا ہے کہ وہ ہماری شادی لندن میں دھوم دھام سے کروائیں گی۔" حمنہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے مگر اپنے دل کی بات بیان نہیں کر سکے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کے ساتھ لندن نہیں رہنا چاہتے۔

"سعد۔۔۔ تم آرہے ہو نا۔۔۔" اس نے انہیں خیالوں میں پایا تو گھبرا کر بولی۔

"ابھی یہاں بہت کام ہے ابھی ابھی تو میں نے یہاں کلینک شروع کیا ہے۔ میں کیسے؟" انہوں نے بات کو ادھورا چھوڑا وہ اسے افسردہ نہیں کرنا چاہتے تھے مگر نہ جانے کیوں وہ بار بار ان سے وعدہ مانگ رہی تھی۔

"سعد تم پاپا کے اسپتال میں کام کرنا ان کی بھی یہ مرضی ہے کہ تم اسپتال کی ساری ذمہ داریاں اٹھاؤ۔" اس نے فیملی کی مرضی ظاہر کی۔

"حمنہ میں یہاں زیادہ بہتر محسوس کر رہا ہوں کیا تم میرے ساتھ یہاں نہیں رہنا چاہتیں۔" انہوں نے پیار سے پوچھ لیا۔

"سعد یہاں۔۔۔ یہاں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں حمنہ میرے پاس۔۔۔ میرے ساتھ۔" انہوں نے حمنہ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مگر اپنی دادی جان کو چھوڑ کر دور لندن میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس کا چہرہ یک دم بجھ گیا۔

"تم نے یہ فیصلہ۔۔۔ اپنے کلینک کے لیے نہیں بلکہ اپنی بوڑھی دادی جان کے لیے کیا ہے۔" اس نے خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ تم غلط سمجھ رہی ہو دادی اماں تو تمہیں کتنا پیار کرتی ہیں پلیز ان پر کوئی الزام نہ لگاؤ۔" وہ بوکھلا گئے۔ "تو پھر پرابلم کیا ہے۔۔۔ وہ ملک اس ملک سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ تمہیں وہاں سیکھنے کے زیادہ مواقع ملیں گے۔" وہ بولتی چلی گئی۔

"حمنہ میں اپنے لیے نہیں اپنے ملک کے لیے سوچ رہا ہوں میں بھی لندن چلا گیا تو پھر اس ملک کے لوگوں کا کیا ہو گا۔ انہیں میری ضرورت ہے۔" انہوں نے پیار سے ہاتھ تھام کر سمجھایا

"پلیز سعد اب دادی جان کے لیے جھوٹ تو مت بولو اور یہاں بہت زیادہ ڈاکٹرز ہیں تمہاری کمی کسی کو محسوس نہیں ہو گی۔" وہ خود غرض سی ہو گئی ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

"تم ہر بات پر دادی جان کو قصور وار کیوں ٹھہرا رہی ہو۔" ان کے لہجے میں خفگی آگئی اس نے ایک خفگی بھری نظر ان پر ڈالی اور پھر اپنا اٹیچی گھسیٹنے لگی۔

"ابھی تو آدھا گھنٹہ باقی ہے تم اتنی جلدی جا رہی ہو۔" وہ اس کے رویے سے گھبرا گئے۔

"ماما ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ تم اپنی دادی جان کو چھوڑو گے نہیں۔۔۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"تم کیا باتیں سوچ رہی ہو۔ دادی جان تو یہی چاہتی ہیں کہ میں تمہارے ساتھ لندن شفٹ ہو جاؤں۔" انہوں نے حمنہ کا بازو پکڑا۔

"تمہاری دادی جان صرف اچھا بننے کا ڈھونگ کرتی ہیں در حقیقت وہ اچھی نہیں ہیں۔" وہ چیخی

"حمنہ پاگل مت بنو ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"ہاں میں پاگل تھی جو میں یہاں دادی جان سے ملنے کے لیے آئی مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولی۔

"تم اپنا مقابلہ دادی جان سے کر رہی ہو۔ پلیز حمنہ تم ایسی سوچ تو نہیں رکھتی تھیں۔" وہ افسردگی سے بولے۔

"تم بھی تو بدل گئے ہو' لندن میں تو تم ایسی سوچ

نہیں رکھتے تھے لندن میں تو تم نے گھر بھی پسند کیا تھا۔" اس نے انہیں یاد دلایا۔
"حمنہ اب میرے والدین اس دنیا میں نہیں رہے۔" انہوں نے وہ کار حادثہ یاد کیا جس میں ان کے والدین جاں بحق ہوگئے تھے۔
"تسعد تم مجھے سوچ کر اپنا فیصلہ سنا دینا۔" وہ پھر خاموش ہوگئی۔
"اچھا۔۔۔ موڈ تو ٹھیک کرو۔" وہ پیار سے بولا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔
اسپیکر سے آواز ابھری کہ تمام پسنجر ایرپورٹ کے اندرونی حصے میں داخل ہوجائیں۔ انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نظریں جھکالیں۔ وہ خاموشی سے سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی جبکہ وہ اس کے منتظر تھے کہ کب وہ پیچھے مڑ کر اسے الوداعی ہاتھ کا اشارہ دے گی۔ مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اور ان کا دل ڈوبتا چلا گیا۔

رات جاگتے گزر جاتی ہے
اسی حساب میں
اس کو محبت تھی؟
نہیں تھی
ہے۔۔۔؟ یا نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اس نے ارسلان کے دیے پیسوں کو دیکھا اور پھر اس کی بے رخی پر آنسو بہتے چلے گئے۔ مگر اس نے بہتے آنسوؤں میں ہی اس کی قمیص پر کام کرنا شروع کردیا۔ ہلکے گرے کلر کی قمیص پر وہ گہرے میرون کلر کی کڑھائی کررہی تھی کل اس کی سالگرہ تھی اور اسے صبح یہ گفٹ میں دینی تھی۔
وہ کڑھائی کرتے کرتے بڑبڑائی۔
"ارسلان میں نے تم سے محبت کرلی ہے شاید تم اسی بات کی مجھے سزا دے رہو۔" وہ اداس تھی مگر کڑھائی کرتے اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے کہ اسے ہلکی سی آواز مدیحہ کی سنائی دی۔
"آپی۔۔۔ میں اندر آجاؤں؟" اس نے پیار سے پوچھا۔
"آؤ۔۔۔ آؤ" اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ وہ اس کی چارپائی پر آبیٹھی اور ہلکی آواز میں بولی۔
"مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے آپ کے پاس چلی آئی۔"
"اچھا کیا، دیکھو کیسی لگی کڑھائی؟" اس نے قمیص اس کی طرف بڑھادی۔
"کرن آپی آپ تو بہت کمال کی کڑھائی کررہی ہیں۔" اس نے کڑھائی کو دیکھ کر حیرت سے اس کی تعریف کی۔
"کرن آپی میرے خیال میں تو بھائی نے اپنی ساری زندگی اتنا پیارا کرتا نہیں پہنا ہوگا۔" اس نے ہنستے ہوئے تسلی دی۔
وہ اس کی بات پر مسکرائی مدیحہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولی۔
"آپ ارسلان بھائی کی وجہ سے رو رہی ہیں کیا؟" اس نے پوچھا کرن کی ناک سرخ ہورہی تھی۔
"نہیں" اس نے انکار کیا اور اپنی نظریں جھکالیں جو ثبوت پیش کررہی تھیں۔
"کل بھائی کی سالگرہ ہے۔ دیکھ لیجیے گا کل آپ دونوں کے درمیان ساری غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی اور اگر نہ ہوئیں تو میں کس لیے ہوں میں خود بھائی سے بات کروں گی۔" اس نے ——— تسلی دی۔
"اچھا باتیں کرتی رہو گی تو پھر یہ قمیص مکمل نہیں ہوسکے گی۔" اس نے ہنس کر سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے کہا۔
"ہاہا۔۔۔ اوکے میں چلتی ہوں آپ اپنا کام مکمل کرلیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تھینک یو مدیحہ" وہ پیار سے بولی۔ اس کی باتوں سے وہ کافی ریلیکس ہوچکی تھی۔
"آپ کا بھی ہزار دفعہ شکریہ" اس نے پیار سے جواب دیا اور پھر مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے ہاتھ پھر کڑھائی میں مصروف ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند تھی جو آنے کا نام نہیں لے رہی تھی آخر وہ گاڑی میں کون تھا اور پھر وہ دونوں اتنے قریب تھے میری نظروں نے دھوکا نہیں کھایا۔ وہ خود سے مخاطب ہوا۔
مدیحہ دبے قدموں سے اندر داخل ہوئی اور اپنے بستر پر جالیٹی۔
"مدیحہ تم کہاں گئی تھیں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔
"بھائی آپ جاگ رہے ہیں؟"
"ہاں۔" ارسلان نے پیار سے جواب دیا۔
"بھائی آپ کو بھی میری طرح آج نیند نہیں آرہی کیا؟" وہ ہنس کر بولی۔
"شاید" وہ بجھے لہجے میں بولا۔
"میں کرن آپی کے پاس گپ شپ کرنے گئی تھی مگر انہیں نیند آرہی تھی اس لیے میں دوبارہ واپس چلی آئی۔" اس نے ہنس کر بتایا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ بہت جلد ہمیں دوسرا مکان دیکھنا چاہیے۔" وہ افسردگی سے بولا۔
"کیوں بھائی اس گھر میں کیا پرابلم ہے۔" وہ گھبرا سی گئی۔
"بس میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔" اس نے افسردگی سے کہا۔
"کیوں بھائی خالہ سکینہ اور کرن کتنے اچھے ہیں آپ پلیز ایسا کوئی فیصلہ نہ لیں اور پھر آج اماں نے آپ کی بات کرن آپی سے طے کردی ہے۔"
"کیا؟" وہ بوکھلا کر بولا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔
"سچ بھائی اماں نے آپ سے پوچھا نہیں تھا کیا؟" وہ اس کے رد عمل پر گھبرائی۔
"مجھے کرن سے شادی نہیں کرنی۔" وہ فوراً بولا۔
"کیا مطلب؟" مدیحہ اپنے بھائی کے منہ سے انکار سن کر گھبرا گئی۔ اور اس کا منہ تکنے لگی۔
"مطلب یہ کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا پہلے شاید کرلیتا مگر آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا میرے بس کی بات نہیں۔" اس کے چہرے پر خفگی چھاگئی۔
"بھائی آپ کرن آپی کے لیے کیا بول رہے ہیں پلیز آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ بول اٹھی۔
"میں نے اپنی آنکھوں سے اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا اور۔۔۔ اور" اس نے جملہ مکمل نہ کیا۔
مدیحہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جان گئی کہ کرن آپی کو عثمان کے ساتھ اس نے دیکھ لیا ہے اس وجہ سے وہ کرن کی ذات پر انگلی اٹھا رہا ہے اسے کرن کے لیے دکھ ہورہا تھا کہ اس کی وجہ سے ان دونوں میں ایک بڑی غلط فہمی پیدا ہوچکی ہے جسے دور کرنے سے اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ارسلان کرن کے اصل چہرے کی وضاحت دیتا رہا مگر اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے کان بند ہوگئے اور وہ کبھی بھی کچھ سن نہیں پائے گی۔

☼ ☼ ☼

ارسلان کی قمیص پر کڑھائی کرتے ہوئے اسے وقت کا اندازہ نہ ہوا اور فجر کی اذان ہونا شروع ہوگئی۔ اس نے حیرت سے وال کلاک کی طرف دیکھا صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔
اس نے قمیص بھی تقریباً مکمل کرلی تھی ایک دو چھوٹے پھول باقی رہ گئے تھے۔ اس نے پیار سے قمیص کو خود سے دور کیا اور اپنے ہاتھ کی ہنرمندی دیکھنے لگی۔
"کیا ارسلان کو یہ تحفہ پسند آئے گا؟" وہ خود سے مخاطب ہوکر مسکرائی اور پھر اس نے خود ہی جواب دے دیا۔
"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں!!" اور شرما سی گئی۔
سکینہ کو کروٹ لیتے دیکھ کر اس نے جلدی سے قمیص کو تکیے میں چھپایا سکینہ جمائی لے کر بولیں۔
"کرن تم اٹھ گئیں کیا؟" سکینہ نے آنکھیں مسلیں۔

"جی اماں۔" اس نے جمائی لی اور دوپٹہ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیے آج دونوں اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا سکینہ نے اس کے سر پر پیار دیا اور پھر وضو کے لیے دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

ارسلان تو سو گیا تھا مگر مدیحہ نے ساری رات جاگ کر کاٹی اس نے نماز فجر ادا کی اور پھر روتے ہوئے خدا کو پکارا، کرن اور ارسلان کے درمیان غلط فہمی کو دور کر سکے مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ دعا مانگ رہی تھی کہ اسے کلثوم نے پکارا۔

"مدیحہ۔۔۔ مدیحہ"

"جی اماں!" اس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور پلٹ کر دیکھا۔

"ارسلان کو سالگرہ وش نہیں کرنی کیا؟" کلثوم نے آہستگی سے پوچھا۔ ارسلان دور چارپائی پر سو رہا تھا۔

"نہیں اماں میں نے اور کرن نے سرپرائز دینا ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا" کلثوم نے کہا۔

اس نے جائے نماز تہ کی اور ارسلان کو جگایا۔

"بھائی۔۔۔ بھائی صبح ہو گئی ہے۔" اس نے ارسلان کا کندھا ہلایا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

"کون کرن۔" اس کے منہ سے بے ساختہ کرن کا نام نکلا

"بھائی۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ مدیحہ۔" اس نے آہستگی سے کہا مگر اس کا دل بہت اداس ہو گیا کہ اس نے اپنے بھائی کی محبت کو چھین لیا ہے۔ اگر شاید عثمان کا وجود نہ ہوتا تو وہ دونوں خوشی خوشی ایک دوسرے کے ہو جاتے۔

ارسلان نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور نظریں چرا کر بولا۔

"مدیحہ۔۔۔ میرا ناشتا پلیز تم بنا کر اوپر لے آؤ میں بار بار اس سے بات نہیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے آہستگی سے حکم دیا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ مدیحہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور وہ پھر بجھے دل سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے آج سلائس ناشتے میں تیار کیے کیونکہ آج شام کو اچھا اہتمام جو کرنا تھا۔ مدیحہ کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تو وہ حیران سی ہوئی۔

"مدیحہ تم۔" اس نے حیرت سے پوچھا جو باورچی خانے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ کرن آپی مجھے بہت بھوک لگی تھی اسی لیے آج جلدی اٹھ گئی ہوں۔ کیا مجھے بھی گرما گرم ناشتا ملے گا؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"کیوں نہیں" وہ مسکرائی۔

"آپی اماں کا ناشتا بھی بنا دو آج ارسلان بھائی کے ساتھ ناشتا کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے نظریں چرا کر جھوٹ بول دیا۔

"کیا ارسلان کے لیے بھی ناشتا بنا دوں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ وہ اس کے رویے کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں بھائی بول رہے تھے کہ آپ سے بول دوں کہ آملیٹ میں پیاز زیادہ ڈال دیں۔" اس نے دوسرا جھوٹ مسکرا کر بولا۔ کرن کا چہرہ زردی مائل ہو رہا تھا کھل اٹھا۔

"اچھا ابھی بنا دیتی ہوں۔" وہ مسکرائی اور اس نے ٹوکری سے ایک بڑی پیاز لے کر کاٹنی شروع کر دی۔ مدیحہ اسٹول پر آ بیٹھی اور سوچنے لگی کہ ان دونوں کے درمیان جو غلط فہمی کی دیوار کھڑی ہے وہ کیسے گرا سکے گی۔

"کہاں کھو گئی ہو۔" کرن نے آمیزہ پھینٹتے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جی۔۔۔ کچھ نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

اس نے توے پر آمیزہ پھیلا دیا اور بولی۔

"تمہیں کسی بھی قسم کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں جو ہوں۔" اس نے مسکراہٹ لبوں پر

سجالی۔

"جی۔۔۔ میں تو آج بھائی کی سالگرہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" اس نے بات پلٹی۔

"آج چکن بریانی، مٹن قورمہ اور شامی کباب تیار کر لوں گی اور کیک باہر سے منگوا لیں گے۔" اس نے ڈشز تجویز کر کے بتایا اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"واہ آپی کیا مینو تجویز کیا ہے ارسلان بھائی کی یہ سالگرہ ان کی یادگار سالگرہ بن جائے گی۔" مدیحہ نے اسے مزید خوش کیا۔

آملیٹ کو اس نے پلیٹ میں نکالا اور پھر کلثوم اور ارسلان کا ناشتا ٹرے میں سجا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"آپی میں ابھی ناشتا دے کر آتی ہوں۔" اس نے فوراً ٹرے تھام لی اور اوپر کی سیڑھیاں چڑھ گئی جہاں اسے اندازہ تھا کہ ارسلان اس کا منتظر تھا۔

اس نے پیاز والا آملیٹ دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کا ناشتا کرن نے بنایا ہے مگر اس نے بولنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ مدیحہ بھی اس کے ساتھ ناشتا کرنے لگی وہ سوچوں میں گم تھا کہ مدیحہ نے مسکرا کر کہا۔

"بھائی۔۔۔ ناشتا کیسا بنا ہے؟" اس نے بات چھیڑی وہ اسے اداس دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے" اس نے افسردگی سے کہا اور چائے کا سپ لیا۔

مدیحہ نے اپنے لیے چائے تھرموس سے نکالی اور پھر چائے کا سپ لے کر بولی۔

"بھائی آپ نے کرن سے بات کی کیا؟" اس نے مسئلہ سلجھانے کے لیے ارسلان سے پوچھا۔

"کیسی بات؟" وہ چائے کا سپ لے کر بولا۔

"یہی کہ اس رات ان کے ساتھ وہ لڑکا کون تھا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"میں۔۔۔ میں کون ہوتا ہوں کہ اس سے بات کروں۔" وہ تلخ ہوا۔

"ارسلان بھائی وہ اور آپ اچھے دوست بھی تو ہیں اور پھر پوچھنے سے حقیقت سامنے آجائے گی۔" اس نے مشورہ دیا۔

"نہیں مجھے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ غصے سے بولا۔

"کیوں؟" مدیحہ کا چہرہ مرجھا گیا اور اس نے حیرت سے اسے پوچھا۔

"بس میں فیصلہ کر چکا ہوں۔" اس نے چائے کا آدھا کپ چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھائی آپ پہلے تو اتنے سخت نہیں تھے۔" وہ مرجھا سی گئی اور اس نے وضاحت مانگی۔

"وقت کے ساتھ انسان بدلتا ہے اور میں بھی وقت کے ساتھ بدل گیا ہوں میں نے شاید اسے اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ مگر اس نے وہ جگہ خود میرے دل سے مٹا دی۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی میں ہی محبت کر بیٹھا۔" وہ افسردگی سے بولتا چلا گیا۔

"بھائی! کبھی کبھی آنکھوں دیکھی کا مطلب کچھ اور ہی نکلتا ہے، آپ ایک موقع تو اپنی محبت کو دیں۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"مدیحہ پلیز مجھے دیر ہو رہی ہے میں چلتا ہوں۔" اس نے اپنے قدم دروازے کی جانب بڑھا دیے۔ اسے اپنا ہر قدم بہت بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نہ چاہ کر بھی اس سے محبت کر بیٹھا تھا اور پھر ڈاکٹر سعد کے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ دیکھ کر وہ کیسے خود کو سنبھال سکتا تھا۔ اس نے محبت کی تھی "محبت" اور محبت کا درد بہت برا ہوتا ہے۔ وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ وہ کام میں مگن دکھائی دی وہ خود سے مخاطب ہوا۔

"تم ایسی تو نہیں لگتیں پھر وہ۔۔۔ وہ "منظر" کیا تھا کیا میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کاش کہ وہ میرا خواب ہوتا اور تم میری ہی ہوتیں مگر وہ خواب نہیں تھا۔ وہ حقیقت تھی۔ تمہاری زلفوں کو کوئی سلجھا رہا تھا اور میں بے بس وہاں پر دیکھتا رہ گیا کرن تم بہت ظالم ہو۔۔۔"

کرن کی نظر ارسلان پر پڑی تو اس نے مسکرا کر اسے دیکھا وہ اس سے نظریں چرا کر گھر سے باہر نکل گیا وہ افسردہ سی ہو گئی۔ وہ صبح سے کچن میں مصروف تھی۔ سکینہ خوشی خوشی باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔

"کرن بیٹی کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو۔ میں بازار سے لے آتی ہوں۔" انہوں نے باورچی خانے کا جائزہ لیتے پوچھا۔

"اماں۔۔۔ کیک خریدنا ہے۔" اس نے شامی کباب بناتے ہوئے بتایا۔

"اوہو۔۔۔ یہ کیک ویک خریدنا نہیں آتا۔" سکینہ نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ تو پھر آپ مدیحہ کو پیسے دے دیں وہ جا کر لے آئے گی۔ وہ ارسلان کی پسند سے واقف ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سکینہ نے گردن ہلائی اور باورچی خانے سے نکل آئیں اسی وقت انہیں مدیحہ سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔

"مدیحہ بیٹی ادھر آؤ اور اپنے بھائی کی پسند کا کیک خرید لاؤ۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں پیسے تھمائے۔

"خالہ جان کیک رہنے دیں بھائی کوئی چھوٹے بچے ہیں۔" اس نے اتنا خرچ کرتے دیکھ کر منع کیا۔

"ارسلان میرے لیے چھوٹا بچہ ہی تو ہے اور پھر کیک نہ ہو تو سالگرہ نہیں لگتی۔" وہ مسکرائیں۔ کلثوم سیڑھیاں اترتے ہوئے بولیں۔

"بہن سکینہ آپ نے پہلے ہی اتنا خرچا کیا ہے۔ بس کیک رہنے دیں۔"

"کیک کے بغیر سالگرہ کیسی‘ جاؤ مدیحہ جلدی سے کیک کا بندوبست کرلو۔"

"کرن بیٹی صبح سے باورچی خانے میں ہے۔ میں کرن بیٹی کی مدد کو جاتی ہوں۔" کلثوم نے فکرمندی سے بتایا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ مدیحہ چادر اوڑھ کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ اداس بیٹھے تھے جب حلیمہ ان کی دادی اماں آہستہ قدموں کے ساتھ ان کے پاس آ بیٹھیں تو وہ چونکے جو ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لیے بیٹھے تھے۔

"آپ اتنی جلدی اٹھ گئیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولے جو دمے کی مریضہ تھیں۔

"ناشتا کیوں نہیں کررہے؟" حلیمہ نے پیار سے پوچھا۔

"بس دادی جان میں کرنے ہی والا تھا۔" اس نے نظریں چرا کر ہونٹوں سے چائے کا کپ لگایا۔

"حمنہ نے فون نہیں کیا۔ اور میں نے کتنے فون کیے۔ مگر وہ میری کال پک نہیں کررہی ہے۔ کیا تم لوگوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔" حلیمہ نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید وہ بزی ہوگی۔" انہوں نے بمشکل مسکراہٹ سجائی مگر پچھلے ایک ہفتے سے وہ حمنہ کے رویے پر بہت شاک تھے کہ حمنہ نے صاف صاف کہا تھا کہ اگر وہ لندن اس کے ساتھ شفٹ نہیں ہوں گے تو اس کی طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں اور اب فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنا گھربار چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ مگر حمنہ سے بھی وہ دور نہیں رہ سکتے تھے۔

"بزی! پہلے تو وہ میرا فون اٹھالیتی تھی۔ کیا اس نے کوئی جاب شروع کردی ہے؟" ان کے چہرے سے فکرمندی کا تاثر جھلکنے لگا۔

"ایسا تو کچھ نہیں بتایا‘ ہاں شاید اس کی سہیلی کی شادی تھی۔" انہوں نے اپنی دادی کو پرسکون کرنے کے لیے جھوٹ بول دیا۔

"ہاں۔۔۔ یہ بات ہوگی میں بھی سوچ رہی تھی کہ حمنہ کیوں نہیں میری کال پک کررہی ہے۔" دادی نے مسکرا کر اپنی کیفیت واضح کی۔

"دادی جان آپ بھی ناشتا کرلیں۔" انہوں نے اورنج جوس کا گلاس انہیں تھمایا۔

"حمنہ کی والدہ کب پاکستان آرہی ہیں؟" وہ سپ لے کر اسے دیکھتے پوچھنے لگیں۔

"بہت جلد۔" انہوں نے پھر جھوٹ بول دیا اور سلائس پر جیم لگا کر ان کی پلیٹ میں رکھا۔

"مسعد تم ان لوگوں کو جلد ہی انوائٹ کرلو۔ میں تم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔" حلیمہ نے کانپتے ہاتھوں سے ان کا ہاتھ تھام کر اپنی خواہش ظاہر کی۔

"جی دادی جان۔ آپ فکر نہ کیجیے۔ بس میرے اسپتال کا سارا کام سیٹ ہوجائے پھر آپ جیسا بولیں گی ویسا ہی ہوتا جائے گا۔" وہ مسکرائے۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ یہ گھر میں حمنہ اور تمہارے نام کردوں۔" حلیمہ نے کہا۔

"کیوں؟ آپ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہیں۔" وہ حیرت سے بولے۔

"میں۔۔۔ میں سدا تو یہاں نہیں رہوں گی اپنی زندگی میں ہی یہ گھر حمنہ کو گفٹ میں دینا چاہتی ہوں۔" وہ مسکرائیں۔

"دادی۔۔۔ پلیز۔۔۔ ایسی باتیں مت کیجیے۔"

"ڈاکٹر بن گئے ہو مگر بچوں کی طرح موت سے ڈرتے ہو۔" انہوں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"تو کیا ڈاکٹر کا دل نہیں ہوتا؟" انہوں نے نظریں ملا کر پوچھا حلیمہ نے ان کا ہاتھ چوم لیا۔

"تو پھر کل آپ فیزیوتھراپی کے لیے میرے ساتھ چلیں گی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ ڈر سی گئیں۔

"دادی اس سے آپ بہتر چل پھر سکیں گی۔ آپ کے گھٹنوں کی ورزش ہوگی تو پھر درد بھی دور ہوتا جائے گا۔" انہوں نے ان کا ہاتھ چوم کر تسلی سے بتایا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بیکری میں داخل ہوئی اور شیشے میں کیک دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔

"ہیلو مدیحہ" اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔

"عثمان۔۔۔ تم!" اس کو دیکھ کر وہ کانپنے لگی۔

"جی میں کیوں مجھے دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی تم تو میرا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب رہتی تھیں اب وہ تمہاری محبت کہاں چلی گئی ہے۔" اس نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھوڑو۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ مجھے۔" اس نے غصے سے ہاتھ چھڑوایا اور پیچھے کو ہٹی۔

"بھاگو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ جتنی دور بھاگ سکتی ہو۔" اس نے اسے راستہ دیتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اب وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"میں۔۔۔ میں تم سے کرن کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔ کون ہے وہ؟ اور تمہاری کیا لگتی ہے؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"کرن۔۔۔ کرن میری بھابھی ہیں۔ اور خبردار جو اپنی گندی زبان سے ان کا نام بھی لیا۔" وہ غرائی۔

"ہاہاہا۔۔۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "اس کرن کے ساتھ رہ کر تم میں بھی ہمت آگئی۔ مجھے بہادر لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"تم پاگل ہوگئے ہو۔" اس نے ہمت باندھ کر جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔ وہ ظالم حسین بھی تو بہت ہے اور کمبخت میرا دل تو اس کے لیے بے چین ہے صرف میں ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم اسے فارم ہاؤس لے آؤ بس اس کے بعد تم میرے چنگل سے آزاد ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنا مقصد بتایا۔

"شٹ اپ عثمان میں کبھی تمہاری اس گھٹیا خواہش کو پورا نہیں ہونے دوں گی بے شک تم مجھے زمانے میں رسوا بھی کردو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"تمہیں اپنی عزت کی بے شک فکر نہ ہو مگر اپنے بھائی کا سوچا وہ تو اس دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔" اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"عثمان۔۔۔ عثمان تمہیں مجھ سے کام تھا۔ میں تمہارا ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں بس کرن آپی کو بھول جاؤ۔" اس نے فکرمندی سے جواب دیا۔

"مجھے صرف یہی کام ہے اور تمہیں میرا یہی کام کرنا ہوگا۔" اس نے پیار سے اس کا گال چھو کر بتایا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔" اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"تمہاری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے اب جو کرنا ہے تم سوچ سمجھ کر کرو۔ میں تو صرف تمہارے بھائی کو۔" اس نے ہنستے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی اور بیکری سے باہر نکل گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس کا چہرہ زردی مائل ہو گیا۔

اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے پاؤں سن ہو چکے ہیں جو پھر کبھی حرکت نہیں کریں گے۔ بیکری والے نے اسے اسٹول دیا جو اس کے زرد چہرے پر اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

"آپ خیریت سے نہیں لگ رہیں۔" اس نے اسٹول اس کے طرف بڑھایا۔ وہ اس پر بیٹھی اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟" بیکری والے نے دوسرا سوال کیا۔

"جی وہ پاس ہی رہتی ہوں۔" اس نے خود کو سنبھالا۔

"آپ مجھے اپنے گھر کا نمبر دیں میں کسی کو بلوا لیتا ہوں۔" بیکری والے نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میں چلی جاؤں گی۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" بیکری والے نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے پائن ایپل کا دو پونڈ کا کیک خریدنا ہے۔" اس نے لمبی سانس لے کر اس بیکری والے کو آرڈر دیا۔

"جی۔۔۔ ضرور۔" بیکری والا ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شاید وہ تازہ کیک لانے کے لیے اندر گیا تھا وہ عجیب نظروں سے باہر کے دروازے کو دیکھنے لگی جیسے پھر عثمان اس کے سامنے آجائے گا۔ بیکری والا کیک لے آیا۔

"میڈم دیکھ لیجیے۔" اس نے کیک اسے دکھایا۔

"جی۔ آپ پیک کر دیں کتنے پیسے دوں؟" اس نے ہلکی آواز سے پوچھا اور ادائیگی کر کے وہ کیک لے کر وہاں سے نکل پڑی مگر عثمان کا ڈر ابھی تک اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے کپڑے استری کر کے ایک طرف کیے اور پھر ارسلان کے لیے وہی تیار کیا کرتا استری کرنے لگی کرتے پر ہوئی کڑھائی بہت ہی دلکش لگ رہی تھی۔

مدیحہ بجھے چہرے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کرن نے مسکرا کر اسے کرتا دکھایا۔

"واہ آپی بہت پیاری کڑھائی کی ہے۔" مدیحہ نے خود کو سنبھالا اور مسکرا کر کہا۔ وہ آج خوشی کے دن افسردگی کا بادل نہیں لانا چاہتی تھی۔

"سچ۔۔۔ کیا ارسلان کو یہ کڑھائی والا کرتا اچھا لگے گا۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں آپی بہت شاندار ہے ریئلی ایسا لگ رہا ہے کہ یہ کرتا کسی ریاست کے شہزادے کے لیے بنایا گیا ہو۔" اس نے پیار سے جواب دیا۔

"تم کیک لے آئی ہو؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"ہاں میں پائن ایپل کیک خرید لائی ہوں۔ فریج میں رکھ دیا ہے۔" اس نے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"تم بھی تیاری کر لو شام کے سات بج چکے ہیں۔" اس نے پیار سے اس کو تاکید کی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔" اس نے خود کو عثمان کی سوچ سے آزاد کیا اور اپنے پورشن میں آگئی۔ خود کو تنہا پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ وہ خود کو عثمان کے چنگل سے کیسے بچا پائے گی۔ اور اگر اس نے ارسلان کو سارے ثبوت دکھا دیے تو وہ کیسے اس سے نظریں ملائے گی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ کھڑکی سے کود کر جان دے دے جہاں سے اسے روڈ نظر آرہا تھا کہ اچانک اسے ایک دکان پر وہ کھڑا دکھائی دیا۔ جو مسکرا رہا تھا۔

"اف خدایا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ میرے گھر کے آس پاس ہے۔" اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

عثمان نے اسے اشارے سے پیار کیا اور مسکرایا اس نے غصے سے کھڑکی زور سے بند کر دی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنسو تھے جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں کچھ دیر بعد وہ ایک فیصلہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے گفٹ پیک کیا اور کپڑے بدل کر ہلکا سا میک اپ کرنے لگی وہ بلیو سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی کہ سکینہ خوشی خوشی کرن کو آوازیں دیتی اندر آئیں۔

"اماں۔۔۔ کیا ہوا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" سکینہ نے اس کا ماتھا چوما۔

"اماں آپ اتنی خوش کیوں لگ رہی ہیں کیا بات ہے؟" اس نے مسکرا کر سبب پوچھا۔

"بہن کلثوم آج منگنی کی رسم بھی ادا کرنا چاہ رہی ہیں۔" سکینہ نے خوشی خوشی بتایا۔

"کیا؟" وہ بوکھلا سی گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "میں نے ہاں کر دی۔" سکینہ نے بتایا۔

"اماں اتنی جلدی۔" وہ گھبرائی۔

"اوہو۔ اس میں جلدی کیسی؟ اور پھر جب تمہیں کلثوم کو دے دیا تو ان کی خوشی کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ بیٹی وہ تمہاری ساس ہیں۔" سکینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"میں مٹھائی لے آئی ہوں۔" سکینہ نے خوشی سے اپنی چارپائی کے تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوا نکال کر کہا۔

"اماں کیک بھی تو ہے۔" اس نے کہا۔

"اوہو۔۔۔ کیک تو ارسلان کی سالگرہ کے لیے ہو گا۔ میں تو مٹھائی پورے محلے میں بانٹنے کا سوچ رہی ہوں۔ میری ایک تو بیٹی ہے۔" سکینہ نے خوشی خوشی چادر اوڑھتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر جھٹ سے باہر نکل گئیں۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ "کیا میں پیاری لگ رہی ہوں۔۔۔؟" اس نے خود کو مخاطب کیا۔ اور پھر لپ اسٹک گہری کرنے لگی۔ وہ لپ اسٹک لگا رہی تھی کہ اس نے مدیحہ کو آئینے میں دیکھا۔ جس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہ بے چینی سے بولی۔ "تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہیں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"اوہو وہ میں نے پرانا کاجل ڈال لیا تھا اس سے آنکھیں جل اٹھیں۔" اس نے آنکھیں مسلتے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ تم رو تو نہیں رہی تھیں۔" اس کا چہرہ بجھ گیا اور وہ اس کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔

"اوہو چھوڑیں نا آپی آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"سچ۔۔۔؟" اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

"ہاں سچ۔۔۔ ریئلی ارسلان بھائی بہت خوش قسمت ہیں جنہیں آپ کا ساتھ مل رہا ہے۔" اس نے خوشی سے تعریف کی۔

"اب اتنا بھی چاند پر مجھے نہ بٹھاؤ۔" اس نے ہنستے ہوئے بالوں پر برش کیا۔

"اوہو آپ تو خود چاند لگ رہی ہیں۔ ارسلان بھائی تو یہ سرپرائز دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" وہ مسکرائی۔

"مگر وہ۔۔۔ وہ تو مجھ سے خفا ہے۔" اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"اوہو۔۔۔ سب پہلے جیسا بہتر ہو جائے گا آپ نے ان کے لیے اتنی اچھی دعوت ارینج کی ہے۔ وہ اپنی ناراضی بھول جائیں گے۔ آپ بے فکر ہو جائیے۔"

"وہ۔۔۔ اماں بتا رہی تھیں کہ آج خالہ کلثوم منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتی ہیں۔" کرن نے ہچکچاہٹ سے بتایا۔ "کیا؟" وہ بوکھلا سی گئی۔

"اماں اور خالہ کلثوم نے بھی سرپرائز دینا ہے۔" اس نے شرما کر بتایا۔ وہ فکرمند سی ہو گئی جو جانتی تھی کہ ارسلان اس سے اب شادی کرنے کا ارادہ ترک کر چکا ہے۔ اور اس کی وجہ وہ ہے۔ وہ سوچوں میں گم تھی تو کرن نے اسے پکارا۔

"کہاں کھو گئی ہو؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں وہ میں سوچ رہی تھی کہ اماں اور خالہ سکینہ نے بہت اچھا سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔" اس نے بمشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔ جس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☼ ☼

ریحانہ امجد بخاری

فرزان ایک دن کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو چائے پینے کی نیت سے باہر جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات چند علماء کرام سے ہوتی ہے جو اسے باقاعدگی سے مسجد آنے اور نیک اعمال کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرزان کی ان سے بحث ہو جاتی ہے۔ تو تکرار میں بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران پولیس آجاتی ہے جو ان سب کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے وہاں پر بھی فرزان پولیس والوں سے عجیب وغریب گفتگو کرتا ہے۔ پولیس والے اسے پاگل قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اذان کو ایک اسٹیج پلے کرنے کی آفر ملتی ہے۔ ساری ذمہ داریاں اسی پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق ڈرامے میں ایک لڑکی کی ضرورت ہے مگر ان کی ٹیم میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ایک دوست رانا فہیم اسے بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو یہ کردار بہت اچھا کر سکتی ہے۔ اذان اس لڑکی ماہم سے ملتا ہے۔ ماہم بہت پُراعتماد اور خوب صورت لڑکی ہے جو پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتی ہے۔ اذان اس کے حسن اور صلاحیتوں سے متاثر ہو جاتا ہے مگر اس کے سامنے اعتراف نہیں کرتا۔ ماہم اس کے گروپ کے تمام لڑکوں سے فری ہو جاتی ہے اور باری باری سب کو اپنا موبائل نمبر دیتی ہے۔ اذان کو یہ بات بہت بُری لگتی ہے۔ مگر وہ اس سے موبائل نمبر نہیں مانگتا۔ اذان کا اسٹیج پلے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر اسی دوران اس کے اپنے دوست رانا فہیم سے تلخی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ماہم اب تمہارے پلے میں کام نہیں کرے گی۔ تم کوئی متبادل انتظام کر لو۔ اذان جیسے تیسے باقی کے پروگرامز کرتا ہے مگر وہ ماہم کو بھول نہیں سکا۔ وہ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا ہے، اس کے دوست اور ٹیم ممبرز اسے بتاتے ہیں کہ ماہم فون پر سب ہی سے بات کرتی ہے لیکن وہ ملنے کے سخت خلاف ہے اور ایک مخصوص حد تک بات کرتی ہے۔ وہ دوستی کرنے کے حق میں نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جو شخص اس سے مخلص ہوگا اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوگا وہ اسی سے تعلق رکھے گی۔ ماہم کے خیالات سن کر اذان کو خوشی

ہوتی ہے۔ ماہم کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہوتا ہے اس کی ماں ایک اسکول میں کینٹین چلاتی ہے اور باپ سائیکل پر گھوم کر صبح کے ناشتے کے لیے چھولے بیچتا ہے۔ مگر وہ اپنی غربت کے باوجود ماہم کو اعلا تعلیم دلا رہے ہیں۔ ماہم بی کام کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ذہین اور حساس مگر اپنی غربت سے نالاں ہے۔ اذان کو اپنے ایک دوست سے پتا چلتا ہے کہ ماہم ایک کریمنل آدمی سے ٹیلی فونک رابطے میں ہے اور اس کی دوستی کا دم بھرتی ہے۔ اذان کو تشویش ہوتی ہے مگر وہ اپنے دوستوں سے اس کا نمبر پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اسی دوران اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا ایک دوست رشتے میں ماہم کا چچا لگتا ہے۔ اذان اس سے ماہم کا نمبر حاصل کر لیتا ہے۔ اذان اور ماہم کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ محلے دار فیضی صاحب سے فرزان کی الٹی سیدھی حرکتوں کی شکایت کرتے ہیں۔ فیضی صاحب بہت شرمندہ ہوتے ہیں اور فرزان سے سخت رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ یا تو اپنے دوستوں کو چھوڑ دو یا اس گھر کو...... فرزان ضد میں آ کر اپنی بیوی زارا کو ساتھ لیتا ہے اور گھر چھوڑ دیتا ہے۔ فرزان کے گھر چھوڑنے کے بعد فیضی صاحب فرزان کی بہت کمی محسوس کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ذکیہ بیگم جو ایک ماں ہیں۔ بیٹے کی جدائی ان پر بھی بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی وکالت کرتی ہیں مگر فیضی صاحب انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ یہ سختی بیٹے کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ فرزان گھر چھوڑنے کے بعد مالی پریشانیوں کا شکار ہے اور اس کے گھریلو حالات بہت خراب ہیں۔ اس کا ایک دوست اسے ایک این جی او میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے جہاں اس کی ملاقات نیلم سے ہوتی ہے۔ نیلم کو فرزان بہت اچھا لگتا ہے مگر وہ اسے بتا دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یوں نیلم کے دل میں فرزان کی محبت پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ فیضی صاحب کو بیٹے کی نافرمانی اور جدائی نے مل کر اندر سے توڑ دیا ہے۔ انہی دنوں فیضی صاحب کا دوسرے شہر جانا ہوتا ہے۔ وہ وہاں جا کر شدید بیمار ہو جاتے ہیں۔ اذان فرزان سے کہتا ہے کہ وہ جا کر ان سے معافی مانگ لے اور انہیں گھر لے آئے مگر فرزان اس سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ فرزان کو فیضی صاحب کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو اسے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر دل ہی دل میں بہت شرمندگی ہوتی ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اور غلط کام کرنے لگتا ہے۔ تدفین والے دن شراب کے نشے میں دھت ہو کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ فرزان کی وہی روٹین ہوتی ہے اب تو اسے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا اس کی اور اس کے دوستوں کی چاندی ہو جاتی ہے' زارا دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی ہے مگر وہ اسے ڈانٹ دیتا ہے۔ فرزان سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیے اور ڈھیر ساری دولت کمانی چاہیے وہ ان باتوں کا ذکر محبوب خان سے کرتا ہے۔ محبوب خان جلال زئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور لنڈی کوتل کا رہائشی ہے جو اسے منشیات اور اسلحہ کے کاروبار کے متعلق معلومات دیتا ہے جس میں فرزان خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ معاشی حالات اور تنگ دستی سے گھبرا کر وہ محبوب خان کے ساتھ لاہور چلا جاتا ہے۔ ان کا پروگرام ہوتا ہے کہ کچھ دن لاہور رہ کر سیر و تفریح کریں گے پھر وہاں سے لنڈی کوتل روانہ ہو جائیں گے لیکن وہاں ایک حادثہ میں فرزان شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ محبوب خان فرزان کو زخمی حالت میں اسپتال چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے لیکن وہ فون کر کے نیلم کو اس کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ فرزان ہوش آنے پر ڈاکٹر فریال سے حسب عادت عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے تو ڈاکٹر فریال کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اذان اور ماہم میں بے تکلفی پیدا ہوتی ہے تو اذان اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے لیکن ماہم انکار کر دیتی ہے جس پر اذان سخت ناراض ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

اب آپ آگے پڑھیے

دسویں قسط

جہاں تم آنکھ والوں کو دکھائی کچھ نہیں دیتا
وہاں ہم دل جلوں کو روشنی محسوس ہوتی ہے
یہ بے شک لوگ کہتے ہیں کہ پتھر دل نہیں رکھتے
ہمیں تو پتھروں میں زندگی محسوس ہوتی ہے

''گلی والیاں نوں نیند نئیں آوندی نی تیری کیویں اکھ لگ گئی'' موبائل تیز آواز میں چلانے لگا تو علی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیڈ پر لیٹے لیٹے اپنا داہنا ہاتھ دراز کیا اور ''چٹ'' کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرہ تیز دودھیا روشنی میں نہا گیا۔

علی نے برا سا منہ بناتے ہوئے وال کلاک کی جانب دیکھا رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اس نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا جس کی اسکرین پر روشنیوں کے جھماکے مسلسل ابھرتے اور ڈوبتے دکھائی دے رہے تھے۔

''اذان کالنگ'' اس نے اسکرین پر دکھائی دینے والے نام کو گھورا اور پھر کال ریسیو کرنے کے بعد موبائل کان سے لگا کر جماہی لیتے ہوئے بولا۔

''ہیلو! خیریت تو ہے اذان؟''

''نہیں! میرا دماغ چل گیا ہے...... اس وقت کال کروں گا تو اسی بات سے تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ خیریت نہیں ہے' میں بہت پریشان ہوں یار۔''

جواب میں اذان کی پریشان آواز سنائی دی۔

''ابے یار! تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے' پریشانی کا اظہار کیا اسی وقت ضروری تھا...... ٹائم دیکھ رہے ہو؟ ڈھائی بج رہے ہیں۔''

علی کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

''فضول بکواس مت کرو...... میں نے علی شاہ روس کو فون کیا ہے' وائٹ ہاؤس نہیں...... یہاں میری جان پہ بنی ہوئی ہے اور تمہیں اپنی نیند خراب ہونے کا غم کھائے جا رہا ہے۔''

اذان کی تلخ آواز سنائی دی۔ تو علی سنبھلتے ہوئے قدرے نرمی سے گویا ہوا۔

''یار کچھ منہ سے تو پھوٹو...... کون سی قیامت آ گئی رات کے اس پہر...... ہوا کیا ہے؟''

''یار بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

اذان کی پریشان آواز سنائی دی۔

''کیسا مسئلہ؟''

علی نے استفسار کیا۔

''یار مسئلہ یہ ہے...... میں کسی سے جھوٹ بول بیٹھا ہوں کہ میری پیشانی پر زخم آ گیا ہے...... اور جس سے جھوٹ بولا ہے وہ صبح میری عیادت کرنے آ رہا ہے' زخم تو آیا نہیں...... پریشانی یہ ہے کہ اب یہ جھوٹ کیسے نبھے گا؟''

اذان نے تفصیل سے مسئلہ بیان کیا تو علی طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

''دھت تیرے کی...... یار یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے کہ تم رات کے ڈھائی بجے فون کر کے کسی شریف آدمی کی نیند خراب کرنے لگو...... کیسے ڈائریکٹر ہو تم؟ بھئی سیدھی سی بات ہے...... تھوڑی سی کاٹن لو' اس پر تھوڑا سا ریڈ کلر لگاؤ' پھر اسے ماتھے پر رکھ کے بینڈیج کر لو...... سمپل!''

لیکن اس کی بات سن کر اذان کی پریشانی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی' وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

''اتنا بھی سمپل نہیں ہے! یہ سب میں نے بھی سوچا ہے...... لیکن تم خود سوچو اگر آنے والے نے پٹی اتار کر دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟''

''وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا...... بھئی میری سمجھ میں جو آیا' میں نے بتا دیا...... اب اگر آنے والا اتنا ہی بے تکلف ہے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں' دیوار میں ٹکر مارو...... اور تو کوئی حل نہیں ہے۔''

علی نے بےزاری سے جواب دیا۔ لیکن اذان برا منائے بغیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''کوشش کر چکا ہوں! لیکن...... ٹکر مارنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے' یہ مجھ سے نہیں ہو گا...... میں تو بلیڈ سے کٹ لگانے کی کوشش بھی کر چکا ہوں لیکن...... یہ بھی خاصا تکلیف دہ عمل ہے...... مجھ سے نہیں ہو پایا...... اسی لیے تم سے مشورہ کر رہا ہوں کہ شاید تم کوئی اور بہتر حل بتا سکو۔''

"ہاں میرے پاس ایک اور بہترین حل موجود ہے۔"

علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"وہ کیا؟"

اذان نے پراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ یہ...... کہ موبائل بند کر کے تکیے کے نیچے رکھو' سر تکیے کے اوپر رکھو' آنکھیں بند کرو اور آرام سے سو جاؤ...... صبح اٹھ کر میرے کہنے کے مطابق بینڈیج کر لینا اور بس...... گڈ نائٹ!"

علی نے جھلکے دار لہجے میں مشورہ دینے کے بعد کال ڈسکنیکٹ کی' موبائل کو پاورڈ آف کرنے کے بعد تکیے کے نیچے رکھا' لائٹ آف کی اور پھر کمبل چہرے پر کھینچتے ہوئے آرام سے لیٹ گیا۔

☆☆☆

اب اپنے فیصلے پر خود الجھنے کیوں لگی ہوں؟
ذرا سی بات پر اتنا بکھرنے کیوں لگی ہوں؟
وہ جس موسم کی اب تک منتظر آنکھیں تھیں میری!
اسی موسم سے اب میں اتنا ڈرنے کیوں لگی ہوں؟

"فریال! تم ٹھیک تو ہونا؟"

یاور زمان کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ جو کافی دیر سے خیالات کے سمندر کی گہرائیاں ناپنے کی کوشش کر رہی تھی ہڑبڑا کر واپس آ گئی۔

یہ الگ بات کہ ایسا کرنے سے اس کے ہاتھ میں دبی چھری چھوٹ کر پرشور آواز کے ساتھ گلاس ٹیبل سے ٹکرائی' اس نے گھبرا کر چھری واپس اٹھائی اور جلدی جلدی سلائس پر مکھن لگانے لگی۔

وہ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر موجود ناشتا کرنے میں مصروف تھی۔ جہازی سائز کی بڑی سی گلاس ٹیبل کے ارد گرد قطار در قطار رکھی فینسی کرسیوں پر اس وقت صرف وہ دونوں موجود تھے اور باقی تمام کرسیاں خالی پڑی ہوئی تھیں کیوں کہ اتنے بڑے گھر میں ان دونوں بہن بھائیوں کے علاوہ اور تھا بھی کون......؟ درجنوں ملازم اور بس!

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا فریال؟ میں کل سے نوٹ کر رہا ہوں کہ تم شاید کچھ پریشان ہو رات برتھ ڈے فنکشن میں بھی یہی صورت حال تھی کہ تم حاضر ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھیں...... کوئی الجھن ہے تو مجھے بتاؤ' میں سب ٹھیک کر دوں گا۔"

یاور زمان کی آواز دوبارہ سنائی دینے پر فریال نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ چند لمحے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

"نہیں بھیا! ایسی کوئی بات نہیں' بس ذرا ہاسپٹل کے معاملات میں الجھی ہوئی ہوں' دراصل! ہمارے ہاسپٹل میں ایک انوکھا مریض آیا ہے۔ کون ہے' کیا کرتا ہے' کہاں سے آیا ہے؟ کچھ پتا نہیں...... شاید اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے! البتہ شخصیت بڑے کمال کی ہے' بہت دلچسپ اور گہری باتیں کرتا ہے وہ...... اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"اچھا...... بھئی ہماری بہن اتنی تعریف کر رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ شخصیت واقعی باکمال ہو گی! ویسے کس قسم کا انسان ہے؟ جوان ہے' بوڑھا ہے یا...... ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے کہ کیسی باتیں کرتا ہے؟"

یاور زمان نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

فریال نے بغور بھائی کے چہرے کا جائزہ لیا جہاں بہن کے لیے ٹھاٹھیں مارتی ہوئی محبت صاف دکھائی دے رہی تھی اور آنکھوں میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔ وہ پرجوش انداز میں بولی۔

"بھائی! وہ عجیب الجھی ہوئی گفتگو کرتا ہے سیدھی سادی بات کو پتا نہیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے' یوں لگتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریخ اپنے صفحے پلٹتی ہے' ماضی کے بہت سے قصے اسے زبانی یاد ہیں' شعر و ادب سے اس کا گہرا لگاؤ بھی ثابت ہوتا ہے' لیکن بھائی! اس کی بات سمجھنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور اگر اس کی باتوں پر غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ اس کا کوئی بھی لفظ مفہوم سے خالی نہیں ہوتا۔"

یاور زمان نے بغور فریال کی طرف دیکھا پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"دیکھو فریال! تاریخ اور ماضی کی بات کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہمارا ماضی ہماری تاریخ کا حصہ ہے اور تاریخ کتابوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ کوئی بھی شخص جو مطالعہ کرتا ہے' ذہن رکھتا ہے وہ ان ساری چیزوں پر با آسانی دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک ماضی کی بات کرنا یا تاریخ پر لیکچر دینا کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں! مجھے صرف وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو مستقبل کی زبان میں بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جن میں اپنے آنے والے کل کو سدھارنے کی اہلیت ہو! کیا تم مجھ سے اتفاق نہیں کرو گی؟"

فریال نے اس کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے بھیا لیکن ہر انسان کی سوچ پر کچھ تہیں جمی ہوئی ہیں۔ وہ تصور کرتا ہے کہ یہ اس کے اپنے خیالات ہیں۔ لیکن ایسا ہے نہیں! کیوں کہ جب انسان یہ سوچتا ہے کہ کون سی چیز اس کی اپنی ہے اور کون سی اسے دی گئی ہے تب احساس ہوتا ہے کہ اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم تو صرف ایک خاموش جھیل ہیں! ایک ایسی جھیل جو اپنی سطح پر ہونے والی ہلچل سے بھی کوئی نہ کوئی سبق حاصل کرتی ہے۔

اگر پالینے کی لگن ہو تو کوئی بھی آپ کا راستہ نہیں روک سکتا! اپنی تاریخ' اپنا ماضی جان لینا آگہی کے نئے در وا کرتا ہے۔ اور یہی آگہی آپ کے آنے والے کل کے راستوں میں روشنیاں بکھیرتی ہے۔"

"اوکے...... اوکے! یہ اب کوئی ایسی بات بھی نہیں جس پر ہم گھنٹوں بحث کریں۔ نقطہ نظر اپنا اپنا ہوتا ہے۔"

یاور زمان نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھنے کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر ہار مانتے ہوئے کہا اور پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں آفس جا رہا ہوں اور ہاں تم آج نئی گاڑی میں ہاسپٹل جاؤ گی...... شام کو بتانا ضرور کہ تمہیں اپنا یہ برتھ ڈے گفٹ کیسا لگا!"

"جی بھیا! ضرور...... لیکن وہ......"

فریال نے اقرار میں گردن ہلانے کے بعد قدرے ہچکچاتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو یاور زمان جو پلٹ کر جانے ہی والا تھا رک کر سوالیہ نظروں سے فریال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں بولو...... کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

فریال نے ایک نظر بھائی کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔

"بھیا میں چاہتی تھی کہ اس مریض کو ہم کچھ دنوں کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں اس کا آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں...... اگر آپ اجازت دیں تو......"

یاور زمان نے چند لمحے خاموشی سے اس کی جانب دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"بھئی اس میں اتنا جھجکنے کی کیا بات ہے؟ یہ گھر جتنا میرا ہے اتنا ہی تمہارا بھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ میری بہن کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کرے گی' جیسے تمہارا دل چاہے ویسا کرو...... ٹھیک؟"

یاور زمان جملہ مکمل کرنے کے بعد پلٹ کر چلتا ہوا ڈائننگ روم کے دروازے تک پہنچ گیا تھا جب اس کی سماعتوں سے فریال کی تشکر آمیز آواز ٹکرائی۔

"تھینک یو بھیا!"

فریال کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اس شہر میں کتنے چہرے تھے' کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

☆☆☆

رات کو روز ڈوب جاتا ہے
چاند کو تیرنا سکھانا ہے
ڈگڈگی ہی نہیں بجانی مجھے!
عشق کو ناچ بھی سکھانا ہے

چند لمحے موبائل کو گھورنے کے بعد اس نے کاؤنٹر کی دراز کھول کر بلیڈ کا آدھا ٹکڑا برآمد کیا۔ پھر آئینہ سامنے رکھتے ہوئے بلیڈ کا ایک کونا پیشانی کی دائیں جانب رکھ کر آہستہ سے گھسیٹا تو اس کے حلق سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔

پیشانی پر ایک باریک سی لکیر تو ضرور بنی تھی لیکن اس میں سے خون رسنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس نے آئینے میں بغور اپنے تاثرات کا جائزہ لیا تو اسے اپنے چہرے پر تکلیف کے آثار پھیلے ہوئے دکھائی دیے۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور دراز کھول کر بلیڈ واپس وہیں رکھ دیا۔

شاید ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹکائے چند لمحے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر شاید کسی نتیجے پر پہنچ گیا کیوں کہ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس نے دیوار پر لٹکا ہوا چابیوں کا گچھا اتارا اور دکان سے باہر نکل گیا ٹھیک اسی وقت دیوار گیر گھڑی نے موسیقی کی مدھر آواز بلند کرتے ہوئے رات کے تین بج جانے کا اعلان کیا۔

اذان نے شٹر نیچے گرایا اور پھر چاروں تالے لگانے کے بعد ایک ایک کے بعد انہیں کھینچ کر اس بات کی تسلی کی کہ تالے بند ہو چکے ہیں یا نہیں پھر اس نے سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لیا۔

ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد وہ ایک جانب روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ قریبی چوک پر پہنچ گیا جہاں روڈ کے کنارے چار پانچ رکشا قطار میں آگے پیچھے کھڑے تھے۔

جونہی وہ ان رکشوں کے قریب پہنچا سیٹوں پر اونگھتے ہوئے رکشا ڈرائیوروں میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

"ہاسپٹل جانا ہے۔"

اذان نے ایک رکشا والے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور جائیں گے بادشاہو! آؤ بیٹھو۔"

رکشا والے نے جواب دیا تو اذان سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"کتنے پیسے لو گے؟"

"او جی جتنے مرضی دے دینا بادشاہو"

"پھر بھی بتا دو تو اچھی بات ہے' طے کر لینا بہتر ہوتا ہے۔"

اذان نے رکشا ڈرائیور کے جواب سے متاثر ہوئے بغیر بدستور سوالیہ انداز میں پوچھا تو رکشا ڈرائیور شانِ بے نیازی سے بولا۔

"سو روپے دے دینا آپ۔"

"سو روپے...... یار یہاں سے فاصلہ کتنا ہے؟ قریب ہی تو ہے' سو روپے بہت زیادہ ہیں کوئی مناسب بات کرو۔"

اذان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جناب! رات کا وقت ہے' یہاں سے ہاسپٹل تک ستر روپے تو ہم دن میں بھی لے لیتے ہیں اس وقت تو وہاں سے واپسی پر کوئی سواری بھی نہیں ملے گی سو روپے بالکل مناسب ہیں۔"

رکشا والا اپنی بات پر مصر رہا تو اذان قطعیت سے بولا۔

"بس ستر روپے ٹھیک ہیں' اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

"چلیں بیٹھیں آپ بھی کیا یاد کرو گے۔"

رکشا والا شاہانہ انداز میں بولا تو اذان جلدی سے رکشا میں بیٹھ گیا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد رکشا ہاسپٹل کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تو سجود و قیام کے پیچھے!
اور میں ہوں امام کے پیچھے!
سدرۃ المنتہیٰ سے آگے تو!
کیا ہے تیرے مقام کے پیچھے؟
جامِ کوثر کو آشکارا کر!
کون مخفی ہے جام کے پیچھے؟

کون ہے لا سے لا اِلہٰ تک؟
کون ہے اس کلام کے پیچھے؟
لفظِ ''کُن'' سے جہاں بنا ڈالا!
بھید کیا تھا تمام کے پیچھے؟
کیا دکھاتا ہے روشنی دے کر؟
کیا چھپاتا ہے شام کے پیچھے؟
کھیل کیسا رچا دیا تُو نے؟
روزِ محشر کے نام کے پیچھے؟
میم سے پہلے مرگیا کوئی
جب چلا الِف لام کے پیچھے!

فرزان کی آواز بلند ہورہی تھی اور سرو کے بلند قامت پودے کے عقب میں کھڑا یاور زمان پورے انہماک کے ساتھ اس کے منہ سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو سننے کے ساتھ ساتھ گہری نظروں سے اس کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

فریال اور فرزان اس وقت لان پر رکھی نفیس کرسیوں پر براجمان چائے پی رہے تھے اور ان کے اردگرد تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے رنگ برنگے پھول جیسے ان دونوں کو ایک ساتھ بیٹھا دیکھ کر ہوا کی تال پر جھومتے' لہراتے' خوشی سے رقص کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

فریال رات ہی فرزان کو گھر لے آئی تھی اور یاور زمان نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

اچانک اس کی نظریں فریال کے چہرے سے ٹکرائیں جو پوری محویت سے فرزان کی جانب متوجہ تھی، یاور زمان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

پتا نہیں کیوں اسے یہ شخص ایک آنکھ نہ بھایا تھا اور فریال کی اس میں یہ گہری دل چسپی بھی اس کے لیے لمحہ فکریہ تھی لیکن بہرحال بہن کا دل دکھانے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی جس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہا۔ مطمئن ہوکر اس نے قدم آگے بڑھائے اور پھر قریب پہنچنے کے بعد کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''وہ ذاتِ لازوال جس نے اس زوال پذیر دنیا کو تخلیق کیا! ہماری فہم وفراست سے ماورا ہے' ایسے اشعار اگر علامہ ڈاکٹر اقبال کہیں تو بات کچھ سمجھ میں آتی ہے...... اب سب لوگ تو تخیل کی ویسی اڑان یا علم کی اس بلندی کو نہیں چھو سکتے نا؟

کم از کم میں تو فرزان صاحب کے اس انداز اور اس شاعری سے متفق نہیں ہوں۔''

فریال نے محبت سے بھائی کی طرف دیکھا پھر قدرے احتجاجی لہجے میں گویا ہوئی۔

''رہنے دیں بھائی! اتنے اچھے شعر تو سنائے ہیں فرزان نے ...... آپ کو تو بس اختلاف کرنا ہوتا ہے چاہے کوئی کچھ بھی کہے۔''

فرزان نے متانت سے یاور زمان کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''یاور زمان صاحب! اس وقت ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر صاحبہ بھی موجود ہیں میں آپ کو ایک چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں۔

کسی ملک میں تین سرجن دوست ایک جگہ اکٹھے بیٹھے گپیں لگا رہے تھے ایک نے کہا ''میرے پاس جنگ کے دنوں میں ایک شخص آیا جس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہوگئی تھیں، میں نے اس کو مصنوعی ٹانگیں لگائیں اور وہ شخص بہترین دوڑنے والا بن گیا حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اب اس نے اولمپک کھیلوں میں میڈل بھی جیت لیا ہے۔''

دوسرے نے کہا ''ارے بھائی! یہ تو کچھ بھی نہیں میرے پاس ایک ایسی عورت لائی گئی تھی جو ایک تین منزلہ عمارت سے نیچے گری اور اس کا چہرہ بالکل مسخ ہوگیا۔ میں نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے اسے بالکل ایک نیا چہرہ دے دیا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ اس عورت نے ملکہ حسن کا مقابلہ جیتا ہے۔''

تیسرے نے کہا ''بھئی یہ کوئی خاص حیرت کی بات نہیں یہ تو سرجری کا کمال ہے میں تمہیں اس سے بھی حیرت انگیز واقعہ سناتا ہوں۔

میرے پاس ایک زخمی لایا گیا جس کا دماغ بالکل کچلا ہوا تھا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوگیا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا حل نکالا جائے۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں ایک کھیت میں گیا وہاں سے میں ایک کدو لایا اور اس کے سر میں رکھ کر سلائی کردیا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ وہ شخص آج ہمارے ملک کا وزیر داخلہ ہے۔''

فریال کی بے ساختہ سنائی دینے والی ہنسی کی آواز پر یاور زمان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر پلٹ کر فرزان کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''کہنا کیا چاہتے ہو...... بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟''

فرزان نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں پھر پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

''ذہین انسان ہمیشہ اپنے وقت سے آگے چلتا ہے کیوں کہ وہ موجد ہوتا ہے۔ ذہانت کے بغیر کامیاب ہونے میں رکاوٹ نہیں بلکہ ذہانت کے ساتھ کامیاب ہونے میں زیادہ مشکلات ہوا کرتی ہیں...... ہمارا المیہ ہی یہی ہے کہ ہم اپنے اردگرد ظہور پذیر ہونے والے معجزات کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے' زندگی کیا کیا نعمتیں ہم پر نچھاور کرتی ہے...... ان کو دیکھنے، جانچنے، یا پرکھنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس سرے سے موجود ہی نہیں کیوں کہ دیکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آپ میں سمجھنے کی اہلیت بھی ہو...... جو افراد ذہین نہیں ہوتے ان کی بات لوگ بہت جلد سمجھ لیتے ہیں لیکن کسی ذہین شخص کی بات کو سمجھنے کے لیے اس معاشرے کو سالوں لگ جاتے ہیں!''

یاور زمان نے حیرت سے اس کی بات سنی چند لمحے جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے تولنے کی کوشش کی پھر فریال کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

''فریال! آپ کے فرزان صاحب شاید اپنی ذات سے بہت ہی محبت کرتے ہیں...... اپنی ذات پر اعتماد ہونا اچھی بات ہے! لیکن جب یہ اعتماد حد سے بڑھ جائے تو اسے خودپسندی کہا جاتا ہے اور ہمارا معاشرہ......''

یاور زمان کا جملہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ فرزان اس کی بات کاٹتے ہوئے نپے تلے انداز میں گویا ہوا۔

''اور ہمارا معاشرہ ہی اپنی ذات پر اعتماد کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، خوف زدہ کرتا ہے...... کیوں کہ معاشرہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جو شخص پراعتماد ہے وہ اپنی مرضی کرتا ہے اور موثر بھی ہوجاتا ہے۔

اس پر قابو پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا ہے اگر آپ کسی شخص کے اعتماد کو کچلتے ہیں تو گویا آپ نے اس کی صلاحیتوں کو ختم کردیا، اس کی طاقت چھین لی۔

اب وہ ہمیشہ ضرورت محسوس کرے گا کہ کوئی اس پر غلبہ پالے، اس کی رہنمائی کرے، اسے حکم دے...... ایسا شخص ایک شریف شہری، ایک اچھا سپاہی، ایک اچھا قوم پرست، ایک اچھا ہندو، اچھا عیسائی یا اچھا مسلمان تو ہوسکتا ہے مگر وہ کوئی حقیقی فرد نہیں رہے گا کیوں کہ اس کی جڑیں نہیں ہوں گی...... وہ ساری زندگی بھٹکتا رہے گا۔

جس طرح درختوں کو ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی جڑیں ہمیشہ زمین میں رہیں اسی طرح انسان کو ضرورت ہے کہ اس کی جڑیں حیات میں ہوں ورنہ وہ ایک بے کار اور احمقانہ زندگی گزارے گا۔

اگر آپ اپنے آپ سے محبت کے قابل نہیں تو آپ کسی سے بھی محبت کرنے کے لائق نہیں رہتے یہ ایک عالم گیر سچائی ہے کہ پہلی محبت انسان کو اپنی ذات ہی سے ہوتی ہے۔ ہاں اگر یہ محبت اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھتی اور اس کا محور صرف اپنا آپ ہی رہے تو شاید یہ خودپسندی یا خودغرضی کہلائے۔

یہ ضرور یاد رکھیں کہ اگر آپ ''صرف'' اپنے آپ

سے محبت کریں گے تو ایسی محبت بھی "بانجھ" کہلائے گی۔

خود سے محبت ہی دوسری تمام تر محبتوں کی ابتدا ہے۔ جو شخص خود سے محبت کرتا ہے، جس شخص کا بھروسہ اپنی ذات پر ہو وہ دوسروں پر بداعتمادی نہیں کرسکتا! یہاں تک کہ ان لوگوں پر بھی نہیں جو اس سے دھوکا کر رہے ہوتے ہیں، اپنی ذات پر اعتماد سب سے قیمتی چیز ہے۔

ایک عظیم صوفی بزرگ نے کہا ہے کہ "اگر آپ خود اپنے نہیں بن سکتے تو کوئی دوسرا آپ کا کیوں بنے گا؟"

لہٰذا محبت کا آغاز اپنے آپ سے کریں، اگر آپ خود سے محبت نہیں کرتے تو پھر آپ سے کون کرے گا؟ جب آپ اپنے آپ سے محبت کریں گے تو آپ کی جڑیں آپ کی ذات کے اندر پھوٹنا شروع کردیں گی۔ پھر آپ مجھ سمیت اپنے دوستوں، اپنے بہن بھائیوں، اپنے بیوی بچوں پر بھی بھروسہ کرنے لگیں گے۔

پرندوں، جانوروں، درختوں، چاند اور ستاروں سے بھی آپ صرف تب ہی محبت کرسکیں گے کیوں کہ بھروسہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ باقی سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔

فرسودہ خیالات سچائی پیدا نہیں کرسکتے۔ سچ پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے اور سچ آپ کے یقین کا محتاج نہیں آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے اس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا! سچ سچ ہے چاہے آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔"

فرزان نے اپنی بات ختم کی تو یاور زمان اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور پھر فرزان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"آپ سے بات کر کے خوشی ہوئی مسٹر فرزان! خاصی مدلل گفتگو کرتے ہیں آپ......"

فرزان نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو یاور زمان اس کا ہاتھ تھام کر مضبوطی سے دباتے ہوئے بولا۔

"سچائی دریافت کرنے کی جرأت آج تک چند ہی لوگوں نے کی ہے کیوں کہ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ انسان کی ہر سوچ درست ہی ہو ممکن ہے کہ ایسی ہر چیز ختم ہو کر رہ جائے جو آپ پہلے ہی سے جانتے ہیں اور آپ کو اپنی پوری زندگی ہی دوبارہ ترتیب دینی پڑے بعض اوقات سچ بڑا خطرناک ہوا کرتا ہے اور ایسا بھی ہوجایا کرتا ہے کہ یہ انسان کے سارے گمان ختم کردیتا ہے، سارے خواب چکنا چور کردیتا ہے، بالکل آگ سے گزرنے والی کیفیت ہوتی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ آگ جلا سکتی ہے، مار سکتی ہے کسے خبر کہ کل کیا ہونے والا ہے...... بہرحال فی الحال تو میں ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے جارہا ہوں ان شاءاللہ پھر ملاقات ہوگی اور بات بھی......"

یاور زمان پلٹ کر جانے لگا تو عقب سے بلند ہوتی فرزان کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

نہیں زمیں پہ کسی کا بھی اعتبار مجھے!
کہا تھا کس نے کہ افلاک سے اتار مجھے؟

☆☆☆

میرے اس کے درمیاں یہ رابطہ ہے اور بس
عمر بھر اک دوسرے کو سوچنا ہے اور بس
یار تو نے منزلوں کا سوچ بھی کیسے لیا
عشق بس اک راستہ ہے، راستہ ہے اور بس
رات دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے آج بھی
آج بھی کمرے میں، میں ہوں اک دیا ہے اور بس
خواب زادی آ کبھی خوابوں سے ہٹ کر بھی ملیں
خواب تو ہیں خواب، ان کو ٹوٹنا ہے اور بس
اے شب گریہ مری آنکھیں مکمل ہوچکیں
آخری اک اشک پلکوں پر کھڑا ہے اور بس
یوں تو سب کچھ ہی سلامت ہے مرا اس کے بغیر
ہاں مگر اک دل یہاں ٹوٹا پڑا ہے اور بس

زارا نے آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کردیا۔ غزل کے ہر ایک شعر نے اس کے دل کو چھوا تھا اور اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، بے اختیار ہی اس کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھیں آپوں آپ ہی ساون بھادوں بن گئیں۔

دوسرے صوفے پر بیٹھی ذکیہ بیگم نے بغور یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھا لیکن وہ بولی کچھ نہیں تھیں۔ البتہ ان کے تاثرات سے ان کے اندر بپا ہونے والے جوار بھاٹوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا ان کا چہرہ ان کے اندرونی کرب کو روز روشن کی طرح عیاں کیے دے رہا تھا۔

غزل کے ہر ہر مصرعے کے ساتھ انہوں نے زارا کے چہرے پر ابھرتے دکھ کو بہت قریب سے پڑھا تھا اب جب زارا نے چڑھتے دریا کے سامنے بند باندھ دیا اور ٹی وی بھی بند کردیا تو وہ رنجور لہجے میں گویا ہوئیں۔

"زارا! سکھ اور دکھ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں ہم انہیں زندگی سے کاٹ کر علیحدہ کردیں تو زندگی پتوں اور شاخوں کے بغیر کسی ایسے ٹنڈ منڈ درخت کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے جو پھل دیتا ہے اور نہ ہی سایہ......

دیکھو زارا! کبھی کبھی انسان کو اپنے جذبات اور مزاج کی نفی بھی کرنا پڑتی ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات زندہ رہنے اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضرورت بن جاتا ہے۔ لیکن! زندگی صرف جیے جانے کا نام نہیں...... بلکہ دوسروں کے لیے جینے کا نام ہے اور ہمیں اپنے آپ کو مار کر، اپنی خواہشات اور اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے دوسروں کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا پڑتا ہے۔

باوجود اس کے کہ قدم لڑکھڑا جانے پر بضد ہوتے ہیں۔ حوصلے ہار جانے اور تھک کر گر جانے پر مجبور کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک کڑی آزمائش ضرور ہے مگر ہمیں جینا پڑتا ہے کہ یہی زندگی ہے۔"

زارا نے نظریں اٹھا کر ذکیہ بیگم کے ممتا بھرے ملیح چہرے کی جانب دیکھا اور اس کی پلکوں پر ایک مرتبہ پھر آنسو چمک اٹھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز اور شکوہ بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"اور اگر کوئی اس کڑی آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو؟"

ذکیہ بیگم نے تحمل سے اس کی بات سنی اور پھر شفقت بھرے لہجے میں دوبارہ گویا ہوئیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... کبھی کبھی انسان واقعی بہت تھک جاتا ہے، ہار جاتا ہے...... مگر...... ہار مان جانے والے بزدل کہلاتے ہیں اور میری بیٹی بزدل نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ وہ تھکن سے مغلوب ہو کر گر تو ضرور سکتی ہے...... مگر ہار نہیں سکتی! وہ پھر اٹھے گی، حالات کا مقابلہ کرے گی، اپنی ہمت اور استقامت کی مدد سے وقت کی اس ڈور کو جو ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے دوبارہ تھامے گی اور خوشیاں پھر سے اس کے قدم چومیں گی۔"

ذکیہ بیگم جو اپنی بات کا اختتام ہونے تک اٹھ کر زارا کے قریب آبیٹھی تھیں۔ زارا کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کی مدد سے اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"میری بیٹی بزدل نہیں ہے نا؟"

زارا نے بے اختیار ان کے سینے سے سر ٹکا دیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں...... امی جان!"

اور ذکیہ بیگم نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کرلیا

☆☆☆

"سنو!"

اذان نے آواز دے کر قریب سے گزرتے ہوئے اس لڑکے کو مخاطب کیا جس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور وہ ہاتھوں میں کچھ ادویات اٹھائے ہوئے تیزی سے جارہا تھا۔

"جی...... فرمایئے؟"

لڑکے نے اذان کے قریب رکتے ہوئے کہا اور پھر اس کی سوالیہ نظریں اذان کے چہرے پر ٹھہر گئیں جہاں خاصی پریشانی کے تاثرات تھے۔

"ڈیوٹی ڈاکٹر کون ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں؟"

اذان نے دریافت کیا تو لڑکا ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سامنے کمرے میں بیٹھے ہیں...... ڈاکٹر جواد صاحب!"

لڑکا اس کی رہنمائی کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا تو اذان نے بھی قدم آگے بڑھا دیے۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ دروازے پر ہلکی سی دستک دینے کے بعد کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"جی......؟"

نوجوان ڈاکٹر جو ایک بزرگ صورت شخص کے ساتھ گپیں لگانے میں مصروف تھا اذان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر جواد صاحب آپ ہی ہیں؟"

اذان نے دریافت کیا۔

"جی میں ہی ہوں...... فرمایئے۔"

نوجوان ڈاکٹر کے لہجے میں استفسار تھا۔

اذان قریب ہی رکھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں شدید پریشان ہوں، مجھے آپ کی معاونت کی ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک نظر اس کے چہرے پریشانی کے سائے لہراتے دیکھے پھر پوری طرح متوجہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی بولیں! کیا مسئلہ ہے؟"

"وہ...... ڈاکٹر صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ......"

اذان نے ایک نظر بزرگ صورت شخص کی جانب دیکھا اور پھر ہچکچاتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں کھل کر بتائیں کیا مسئلہ ہے؟"

ڈاکٹر نے اذان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا تو اذان ہمت مجتمع کر کے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس کچھ ایسی ادویات یا انجیکشن وغیرہ تو ضرور ہوتے ہوں گے جو جلد کو سن کر دیتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے بغور اذان کا جائزہ لیا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"دیکھیں! آپ یہ بتائیں کہ مریض کون ہے اور پرابلم کیا ہے؟ دوا تجویز کرنا ڈاکٹر کا کام ہے۔"

اذان نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پریشانی سے پہلو بدلا پھر گویا ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنی پیشانی پر ایک زخم بنوانا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس میں مجھے تکلیف بھی نہ ہو۔"

اذان نے اپنا جملہ مکمل کیا تو نوجوان ڈاکٹر کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ بزرگ صورت شخص بھی چونک کر اذان کی جانب دیکھنے لگا۔

"کیسی عجیب بات کر رہے ہیں آپ...... اسپتالوں میں زخموں کا علاج کیا جاتا ہے زخم بنائے نہیں جاتے!"

ڈاکٹر کے چہرے کی تمام تر حیرت اس کے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔

"دیکھیں! میرا نام اذان ہے، میں پڑھا لکھا ہوں اور مکمل ہوش و حواس میں بھی ہوں...... میں جانتا ہوں کہ اسپتالوں میں علاج کیا جاتا ہے...... میرا مسئلہ عجیب سہی لیکن میرے لیے بہت اہم ہے...... آپ پلیز میرے ساتھ تعاون فرمائیں، آپ جو بھی فیس لینا چاہیں میں حاضر ہوں۔"

اذان کا لہجہ پریشانی اور لجاجت کا امتزاج لیے ہوئے تھا۔

"آپ کیا نتیجہ لینا چاہتے ہیں...... کسی پر ایف آئی آر کٹوانی ہے کیا؟"

بزرگ صورت شخص نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اپنی گونج دار آواز میں سوال کیا۔ اذان نے پریشانی سے ان کی طرف دیکھا پھر جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں...... بس میرا کوئی ذاتی مسئلہ ہے! میں کسی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں اور نہ ہی اس میں آپ کا کوئی نقصان ہے۔"

اذان نے بزرگ شخص کو جواب دیا پھر دوبارہ ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں گویا ہوا۔

"پلیز ڈاکٹر! آپ اس سلسلے میں میری ہیلپ فرمائیں۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے اذان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"آئی ایم سوری مسٹر اذان! آپ کی یہ انوکھی خواہش سرے سے غلط ہے اور میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا...... ویری سوری!"

"ڈاکٹر پلیز! سمجھنے کی کوشش کریں...... میری دماغی حالت بالکل درست ہے آپ مجھے پاگل مت سمجھیں...... یہ زخم بنوانا میرے لیے بہت اہم ہے، میں رات کے اس پہر آپ سے مذاق کرنے نہیں آیا یہ میری عزت کا سوال ہے آپ مہربانی فرمائیں۔"

اذان نے ایک مرتبہ پھر بھرپور انداز میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں ناکام رہا کیوں کہ ڈاکٹر بدستور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"دیکھیے مسٹر اذان! آپ مجھے ایک غیر قانونی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتے، جو بات عقل تسلیم نہ کرے اور میرے دائرہ اختیار میں بھی نہ ہو میں وہ کیسے کر سکتا ہوں...... معافی چاہتا ہوں میں یہ ہرگز نہیں کروں گا۔"

نوجوان ڈاکٹر جواد کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اذان نے باری باری بزرگ صورت شخص اور نوجوان ڈاکٹر کی طرف دیکھا پھر اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، انداز میں مایوسی تھی، چند ہی لمحوں کے بعد وہ دوبارہ رکشا میں بیٹھ رہا تھا۔ رکشا اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھا تو اچانک اذان کے دماغ میں بجلی کی طرح ایک خیال چمک اٹھا۔

"رکو...... رکو...... ایک منٹ!"

اذان کے لہجے میں بے قراری تھی۔ رکشا ڈرائیور نے بوکھلا کر بریک پیڈل دبا دیا۔ رکشا ابھی پوری طرح رکا بھی نہیں تھا کہ اذان تیزی سے اترا اور پھر لپک کر دوبارہ اندرونی جانب بڑھ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر آنے والا وہی لڑکا تھا جس سے کچھ لمحے قبل ہی اس نے ڈاکٹر کا کمرہ دریافت کیا تھا۔

"سنو! ایک منٹ......"

اذان جلدی سے اس لڑکے کے قریب جاتے ہوئے بولا تو لڑکا جو بہت سی ڈسپوزیبل سرنجیں اٹھائے ایک جانب بڑھ رہا تھا اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"یہاں ایمرجنسی میں ڈاکٹر شاہد کی ڈیوٹی بھی تو ہوتی ہے...... وہ میرے دوست ہیں! ان سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

لڑکے کی سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے اذان نے جلدی سے دریافت کیا تو لڑکا گویا ہوا۔

"ان کی ڈیوٹی دن میں ہوتی ہے، ان سے ملاقات کے لیے آپ کو کل دن کے وقت آنا پڑے گا۔"

لڑکا جواب دینے کے بعد آگے بڑھ گیا تھا لیکن اس کی بات سن کر اذان کے تمام تر ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی اور وہ ایک مرتبہ پھر ڈھیلے قدموں سے چلتا ہوا واپس جا رہا تھا پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ رکشا میں بیٹھا شاہد کے گھر کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

(باقی آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

رفعت سلطانہ

ناولٹ

فاتح آٹھ سال بعد امریکہ سے واپس لوٹا تھا۔ اپنے وطن پہنچ کر ایک عجیب سا سکون اور طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ ایئرپورٹ میں ضروری کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ شائستہ بیگم کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑا رہا تھا کہ وہ سامنے سے آتی ہوئی نظر آئیں۔

"السلام علیکم مما!" ان کے قریب پہنچنے پر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" کیسا ہے میرا بیٹا؟ اور سفر کیسا رہا؟"

"آپ کا بیٹا بھی شاندار ہے اور سفر بھی بہت شاندار رہا۔" اس نے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"واقعی! میرا بیٹا تو بہت شاندار ہو گیا ہے۔" انہوں نے محبت بھری نظر اس کے دراز سراپے پر ڈالی۔ پھر اپنے ساتھ آئے ڈرائیور سے بولیں۔

"یہ سامان گاڑی میں لے جا کر رکھو۔" وہ دونوں بھی باہر کی طرف جانے لگے۔

"ویسے مما! آپ بھی پہلے دن کی طرح ہی بیوٹی فل ہیں۔ آخر راز کیا ہے؟" وہ شرارت بھرے لہجے میں پوچھنے لگا تو شائستہ بیگم نے اس کے سر پر اک چپت لگائی۔

"کس خوشی میں اتنا مکھن لگایا جا رہا ہے۔ کہیں کسی گوری میم کو میری بہو بنا کر تو نہیں لے آئے؟" وہ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے بولیں۔

"اوہ مما! کم آن آپ کو لگتا ہے کہ میں کسی گوری کو آپ کی بہو بناؤں گا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میں آپ کا کتنا بھولا اور فرماں بردار بیٹا ہوں۔" اس نے ابرو چڑھا کر جواب دیا تو شائستہ بیگم ہنس پڑیں۔

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم کتنے بھولے اور فرماں بردار ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

"ویسے مما! حسینائیں تو پاکستان میں بھی کم نہیں۔ اگر کسی حسینہ نے مجھے اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا تو؟ اور آپ تو جانتی ہیں کہ آپ کا بیٹا کتنا بھولا ہے کسی بھی جال میں با آسانی پھنس سکتا ہے۔" وہ بھولی سی صورت بنا کر بولا۔

"ہاں تو اچھا ہے نا پھر وہی تمہیں بھگتے گی اور میری جان چھوٹ جائے گی۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اتنی بے زار ہیں آپ مجھ سے؟" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ لڑاکا انداز میں پوچھنے لگا۔

"تو اور کیا؟" شائستہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں تو وہ بھی ہنس پڑا۔

☼ ☼ ☼

"خالہ آج کھانے میں بریانی بنا لوں؟"

"یہ بریانی کا خیال تجھے کیسے آ گیا؟ ضرور ایاز چپکے سے تجھے کہہ گیا ہو گا؟" پان لگاتی ساجدہ نے بھنویں اچکا کر زینی سے پوچھا۔

ساجدہ کے بالکل صحیح اندازہ لگانے پر زینی کان کھجانے لگی۔ ساجدہ نے ایک نظر سامنے کھڑی زینی کو دیکھا پھر پان منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو مزے سے فرمائش کر جاتا ہے اور بجٹ میرا خراب ہو جاتا ہے۔"

"خالہ! آج بنانے دیں نا۔ ایاز کہہ رہا تھا کہ آج اس کا بریانی کھانے کا بہت دل کر رہا ہے۔" وہ ساجدہ کے سامنے بیٹھ کر مسکین سی صورت بنا کر بولی۔

"کس کا بریانی کھانے کو دل کر رہا ہے بھئی؟" نسرین جو کمرے میں ہی آ رہی تھیں آدھی بات سن کر پوچھنے لگیں۔

"لارڈ صاحب ہیں نا ہمارے گھر میں ایک ان کا بریانی کھانے کا دل کر رہا ہے۔" ساجدہ کتھے والی انگلیاں چاٹتے ہوئے بولیں "اور یہ زینی صاحبہ ان کی وکیل بن کر آئی ہیں۔"

"امی! کبھی کبھی تو ایاز فرمائش کرتا ہے۔ اب کبھی کبھی تو حق بنتا ہے نا انسان کا۔" زینی نسرین کے ساتھ مل کر کپڑے تہ کروانے لگی جو وہ چھت سے اتار کر لائی تھیں۔

"کبھی کبھی؟" نسرین اس کی بات پر مصنوعی حیرت

سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولیں۔
"تم بھول رہی ہو زینی ابھی تین دن پہلے ہی اس نے کوفتوں کی فرمائش کی تھی۔"
"دیکھو بھلا!" ساجدہ ایک ہاتھ سے گال کو پیٹتے ہوئے نسرین کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔
"امی! آپ میرا ساتھ دینے کی بجائے خالہ کو اور بھڑکا رہی ہیں۔" زینی نے ہاتھ میں پکڑی تہ کی ہوئی قمیص زمین پر پٹختے ہوئے ماں کو ٹوکا۔ نسرین نے ایک نظر اس کے پھولے ہوئے ناراض سے چہرے پر ڈالی پھر دھیرے سے ہنس پڑیں۔
"بھئی ساجدہ! بنانے دو اسے بریانی ورنہ یہ بھی روٹھ جائے گی اور ایاز کا بھی منہ بن جائے گا اور ہمارے گھر کی تو یہ دونوں ہی رونق ہیں۔"
"ٹھیک ہے بھئی بنالے بریانی۔" ساجدہ نے مارے باندھے اجازت دی۔
"لیکن اس لارڈ صاحب کو سمجھا دینا کہ اب پندرہ دن تک کوئی فرمائش نہیں چلے گی۔"
"تھینک یو خالہ!" اجازت ملتے ہی وہ سب چھوڑ کر قلانچیں بھرتی کمرے سے نکل گئی۔
زینی کو خوش دیکھ کر نسرین کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ آگئی۔
"یہ لڑکی تو پوری پاگل ہے۔"
"ارے! بہت سمجھ دار ہے ہماری زینی' ایاز کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ جب ابھی اتنا خیال کرتی ہے تو شادی کے بعد سوچ کتنا کرے گی۔" ساجدہ خوش تھیں زینی بے حد حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سگھڑ لڑکی نہ ہوتی تو ساجدہ کبھی بھی اپنی سوتیلی بہن کی بیٹی کو اپنی بہو نہ بناتیں چاہے اس کے لیے انہیں اپنے بیٹے سے کیوں نہ لڑنا پڑتا۔

☼ ☼ ☼

"واؤ! مما ہمارا گھر تو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گیا ہے۔" فاتح نے ہال نما لاؤنج میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے ستائشی لہجے میں کہا۔
"مجھے پتا تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی تم یہ کہو گے۔" شائستہ نے مسکراہٹ کے ساتھ اس کی تعریف وصول کی۔
"یہ سب آپ نے ڈیکوریٹ کیا ہے؟" فاتح اوپر کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"نہیں میری جان! میں نے تو صرف پیسہ خرچ کیا ہے۔ باقی کام ڈیکوریٹرز کا ہے میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہی تھیں۔
"ویسے یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم اپنا کمرہ دیکھنے کے بعد باقی گھر کی ڈیکوریشن بھول جاؤ گے۔"
"رئیلی؟" اس نے اشتیاق سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو خوشی سے دنگ رہ گیا۔
"واؤ مما! یو آر گریٹ" کمرے کی ڈیکوریشن میں بلیو کلر نمایاں تھا۔ وہ پورے کمرے میں گھوم کر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔
"واقعی مام! آپ نے مجھے خوش کر دیا۔" وہ اپنے آرام دہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"میں جانتی ہوں۔" اسے خوش دیکھ کر شائستہ مطمئن ہو گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اپنے کمرے کی ڈیکوریشن کے بارے میں وہ کتنا کریزی ہے۔
"ٹھیک ہے۔ اب بہت رات ہو گئی ہے۔ اب تم سو جاؤ صبح ناشتے کی ٹیبل پر ملاقات ہو گی۔" وہ اسے ہدایت دیتی دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔
"اوکے ماما!" فاتح زیر لب کہتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کھانے میں کتنی دیر ہے جناب؟" ایاز دروازے کے فریم میں ایستادہ سینے پر ہاتھ باندھے پوچھ رہا تھا۔
"بس تھوڑی دیر ہے۔ بریانی دم پر ہے۔" زینی نے سلاد کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ایاز کی موجودگی اس کے چہرے کو بے شمار رنگ عطا کر گئی تھی۔

"تم نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے؟" وہ اس کے نزدیک آکر پوچھنے لگا۔
"ہاں!"
"اپنے ہاتھ سے کھلاؤ گی بھی؟" ایاز نے زینی کا حسین سراپا اپنی نظروں کے حصار میں لیا۔
"ایاز! پاگل ہو گئے ہو؟" زینی اس کی بات پر خوفزدہ ہو گئی۔
"کیوں؟ جب اپنے ہاتھوں سے بنا سکتی ہو تو کھلا کیوں نہیں سکتیں؟" وہ اس کے تاثرات سے محظوظ ہوتے ہوئے مزید پوچھنے لگا۔
"ایاز! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ رونی صورت بنا کر بولی تو ایاز قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"مذاق کر رہا تھا یار! تم تو بہت ڈرپوک ہو۔"
"اب تم جیسے خوفناک بھوت کو اپنے ہاتھ سے کھلانا پڑے تو ڈر تو لگے گا نا۔" وہ سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔
"اچھا! میں بھوت ہوں۔ رکو ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔" ایاز زینی کی لمبی چٹیا اپنے ہاتھ میں لینے ہی لگا تھا کہ وہ جھپاک سے کچن سے باہر نکل گئی اور وہ پیچھے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

فاتح بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے تیزی سے ڈائننگ روم میں داخل ہوا لیکن پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ ٹھٹکنے کی وجہ وہ حسین لڑکی تھی جو مما کے برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔
"رک کیوں گئے فاتح! آؤ بیٹھو۔" مما کے ٹوکنے پر وہ آگے بڑھا اور ایک چیئر کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"فاتح! یہ زینا حیات ہے۔ تمہارے ماموں کی بیٹی یہ اب ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے تم اسے ہماری فیملی کا حصہ سمجھو۔" اس کے بیٹھتے ہی شائستہ نے تعارف کروایا۔
"ہیلو زینا!" فاتح نے بے تکلفی سے اسے پکارا۔ زینا نے ذرا کی ذرا نظر اس کی طرف اٹھائی اور اشارے سے جواب دے کر دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔
فاتح اس کی آنکھیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جان نہیں پایا تھا کہ اس کی آنکھیں کس رنگ کی ہیں۔ نیلی' ہری' کتھئی یا شاید اس کی آنکھیں ست رنگی ہیں۔
وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے حسن کو کس سے تشبیہ دے۔ شاید وہ اپنے حسن میں بے مثال تھی۔
"فاتح رات نیند اچھی آئی؟" شائستہ کے اچانک پوچھنے پر فاتح چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ اسے بری طرح گھور رہی تھیں اور اشاروں اشاروں میں تنبیہہ کر رہی تھیں۔
وہ ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر مسکرانے لگا اور شرارت سے کان پکڑ کر بولا۔
"جی امی! رات بہت اچھی نیند آئی۔"
"بہت اچھی بات ہے۔ تو پھر کچھ کام کی بات ہو جائے؟" وہ اپنا ناشتا ختم کر چکی تھیں۔ نیپکن سے منہ صاف کرنے لگیں۔
وہ ایک گلاس میں اپنے لیے جوس نکالتے ہوئے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"آفس کب سے جوائن کر رہے ہو؟"
"آفس؟ مما! میں کل رات کو آٹھ سال بعد پاکستان واپس آیا ہوں۔ اب کیا آج سے آفس جوائن کر لوں؟" وہ سراپا احتجاج بنتے ہوئے بولا۔
"میں نے تم سے یہ کب کہا کہ آج سے آفس جوائن کر لو میں نے تو صرف پوچھا ہے۔" اس کے اس انداز پر شائستہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
"سب سے پہلے تو میں اپنے تمام فرینڈز سے ملوں گا۔ اور مجھے لگتا ہے میں ان آٹھ سالوں میں پاکستان کو بھول چکا ہوں۔ اسی لیے اک ٹرپ ناردرن ایریاز کا ہو گا۔ اس لیے کم از کم ایک مہینہ تو آپ مجھے بھول ہی جائیں۔" وہ سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے اپنے آئندہ دنوں کی مصروفیت بتانے لگا۔
"تو اس ایک مہینے تک ہم اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے کو بھی ترسیں گے۔" وہ ٹیبل پر ہاتھ ٹکاتے

ہوئے شاکی لہجے میں بولیں۔

"مما! میں خود آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے بہت بے قرار ہوں۔" اس کے چہرے پر ماں کے لیے محبت کا خوب صورت عکس تھا۔ شائستہ مسکرانے لگیں۔

"کل رات تمہارے آنے کی خوشی میں گھر میں پارٹی ہے۔ اسی بہانے تمہارا ہمارے بزنس فرینڈز سے تعارف بھی ہو جائے گا اس لیے کل تم فری رہنا۔"

"اوکے مما!" فاتح نے ایک بار پھر زینا کو اپنی نظروں کے حصار میں لیا تھا۔ وہ ناشتا ختم کر چکی تھی اور بے مقصد ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"میں آفس جا رہی ہوں۔ اب تم سے رات کو ہی ملاقات ہو گی۔" شائستہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"اللہ حافظ مما!" اس نے دیکھا کہ شائستہ کے کھڑے ہوتے ہی زینا بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکل گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی فاتح نے اک سرد آہ بھری تھی۔

☼ ☼ ☼

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے آسمان کی سطح سرخ رنگ میں تبدیل ہو رہی تھی صبح سے رزق کی تلاش میں سرگرداں پرندے بھی اب اپنے گھونسلوں کی طرف پلٹ رہے تھے۔

زینی چھت پر بیٹھی اپنی گود میں کتاب رکھے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دن کے اس وقت سے اسے عشق تھا شام ہوتے ہی بے اختیار اس کے قدم سیڑھیوں کی طرف اٹھنے لگتے تھے۔

اب بھی وہ آسمان کی طرف نظریں کیے ہل ہل کر اپنا ٹیسٹ یاد کر رہی تھی کہ اچانک پیچھے سے آکر ایاز نے پکارا۔

"کیا ہو رہا ہے ملکہ حسن؟"

"ٹیسٹ یاد ہو رہا ہے اور کیا۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"چھوڑو اس ٹیسٹ ویسٹ کو اور مجھ سے باتیں کرو۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ایاز! تنگ مت کرو۔ کل کالج میں بہت اہم ٹیسٹ ہے اور میری کوئی تیاری بھی نہیں ہے۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولی۔

"چلو بھئی! اب ہم سے زیادہ ٹیسٹ اہم ہو گیا ہے۔" ایاز کے شکایتی لہجے میں کہنے پر زینی بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔

"بھلا تم سے زیادہ کوئی چیز اہم رہی ہے میرے لیے۔" جواباً وہ بھی شکایتی لہجے میں بولی۔

"نہیں کرتی پڑھائی۔ اب خوش! کرو باتیں۔" وہ تھوڑی دیر مجنونانہ انداز سے اسے دیکھتا رہا۔

"اتنا پیار کرو گی مجھ سے تو تمہارے قدموں میں جان ہی وار دوں گا۔"

"اللہ نہ کرے ایاز!" اس نے بے اختیار ہی اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

تھوڑی دیر وہ اس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار پوچھنے لگا۔

"زینی! اگر ہم نہ مل سکے تو تم کیا کرو گی؟"

"میں مر جاؤں گی۔" زینی اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی تو ایاز ہنس پڑا۔

"پاگل لڑکی! یہ جو رٹے لگانے میں اتنا دماغ لگاتی ہو نا تو تھوڑا سوچنے میں بھی لگا لیا کرو۔ ہم ضرور ملیں گے۔ کیونکہ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں ہے۔" ایاز کی بات پر زینی کے چہرے پر سکون بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔

"اتنی خوب صورت مسکراہٹ تم اپنے چہرے پر لا کر مجھے امتحان میں ڈال دیتی ہو۔" اس کے گمبھیر آواز میں کہنے پر زینی جھینپ گئی۔

"چلو اس خوب صورت مسکراہٹ کے صدقے میں آج رات کے کھانے پر کوئی اچھی سی ڈش بنا لو۔"

"آج پھر فرمائش!" زینی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"آج تو خالہ میرا گلا دبا دیں گی۔ ایاز! تم کتنے پیٹو ہوتے جا رہے ہو مجھے تو لگتا ہے شادی کے بعد میرا پورا دن کچن میں گزرا کرے گا۔" وہ تصور میں خود کو کچن میں مصروف دیکھتے ہوئے بولی۔

"شادی کے بعد ہی کیوں؟ میں تو تمہیں اب بھی کچن میں مصروف رکھتا ہوں۔" ایاز اس کے انداز پر مسکرانے لگا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" زینی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ایاز کی نظریں زینی کے حسین سراپے سے الجھنے لگیں۔ اس کی نظروں اور لہجے کے غیر معمولی پن سے زینی کو کوفت سی محسوس ہوئی تھی۔

"ایاز دن بہ دن عجیب ہوتا جا رہا ہے۔" یہ بات اس نے دل میں کہی۔

"ایاز! میں نیچے جا رہی ہوں۔" وہ اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے بولی۔ اس کی نظریں وہ مسلسل اپنے اوپر محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فاتح! ان سے ملو یہ جاوید صاحب ہیں ہماری کمپنی کے ہیڈ اکاؤنٹنٹ۔" شائستہ فاتح کو پارٹی میں موجود لوگوں سے متعارف کروا رہی تھیں۔

"اور جاوید صاحب! یہ میرا بیٹا فاتح ہے۔"

"ہیلو سر!" فاتح نے جاوید صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"ہیلو! کیسے ہیں آپ فاتح؟"

"آپ کی دعا ہے سر!" فاتح نے عاجزی سے جواب دیا۔

"اتنے عرصے بعد پاکستان آکر کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔" فاتح نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر پلٹ کر شائستہ سے کہنے لگا۔

"مما! زینا نظر نہیں آ رہی؟"

"بیٹا! اسے پارٹیز پسند نہیں ہیں۔ اور آج تو اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" شائستہ نے اس کی غیر موجودگی کی وجہ بیان کی۔

"تم انجوائے کرو نا اتنی شاندار پارٹی میں نے تمہارے لیے ہی Arrange کی ہے۔" یہ کہہ کر شائستہ دیگر مہمانوں کی طرف بڑھ گئیں اور وہ کچھ سوچ کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

دوبارہ دستک دینے پر زینا نے دروازہ کھولا تو فاتح اس کی صورت دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشا سوجی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کافی دیر روتی رہی ہے۔

"جی کہیے؟" فاتح کو سامنے دیکھ کر وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"زینا آپ پارٹی میں نہیں آ رہیں؟" وہ اس کے چہرے سے اس کے رونے کی وجہ کھوجنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے پارٹیز پسند نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کرنے لگی تو فاتح پھر پوچھ بیٹھا۔

"آپ رو کیوں رہی ہیں؟" اس نے حیرت سے سامنے کھڑے اپنے اس کزن کو دیکھا جو اس سے اس طرح سوال کر رہا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہے۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے نہیں پسند کہ کوئی میرے ذاتی معاملے میں دخل دے۔" سخت لہجے میں جواب دے کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا گیا۔

فاتح حیران کھڑا دروازے کو تکتا رہا۔

"آخر یہ رو کیوں رہی تھی؟" اس نے الجھن بھرے انداز میں خود سے سوال کیا پھر کندھے اچکا کر بولا۔

"فاتح بیٹا! تمہیں ہمیشہ سے چیلنج پسند ہے یہ تو اک حسین راز ہے۔ اسے کھوجنے میں تو اور بھی مزا آئے گا۔" اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

"آخر ضرورت ہی کیا ہے ابھی ایاز کی شادی کرنے کی پہلے اسے کسی ڈھنگ کے کام دھندے پر لگنے دو پھر اس کی شادی کے بارے میں سوچنا۔" ساجدہ نے اپنے

شوہر الیاس کے سامنے کھانا لگاتے ہوئے ایاز اور زینی کی شادی کا ذکر کیا تو وہ جھلا گئے۔

"ارے تو میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ ابھی ان دونوں کی شادی کر دو اور ایاز کی نوکری اتنی بری بھی نہیں ہے۔ اچھا خاصا کما رہا ہے وہ پھر گھر کی لڑکی ہے ہمیں کون سا دنیا کو دکھانا ہے۔ بس چھوٹی سی تقریب کر لیں گے۔" ساجدہ نے ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"ساجدہ بیگم! تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ارے وہ تمہاری غریب بہن تمہیں کیا دے سکتی ہے؟ ہمارے بیٹے میں کیا کمی ہے جو تم اس لڑکی کے لیے مری جا رہی ہو؟ ایاز کے لیے کسی بڑے گھر کی اچھی لڑکی کو بیاہ کر لاؤ جو ساتھ میں قیمتی جہیز لائے اور اس گھر کو بھر دے۔" الیاس اپنی لالچی فطرت سے مجبور ہو کر بولے۔

"تمہارا بیٹا مرا جا رہا ہے زینی کے لیے ورنہ میں بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھی۔" ساجدہ آواز دبا کر بولیں۔

"اور ویسے بھی نسرین اتنی بھی غریب نہیں ہے۔ اپنی شادی کا ڈھیر سارا قیمتی زیور ہے اس کے پاس جو اس نے زینی کے لیے سنبھال کر رکھا ہے۔"

"دیکھ لو تمہاری مرضی ہے پھر بعد میں میرے آگے بیٹھ کر بہو کے جہیز نہ لانے کا رونا مت رونا۔" قیمتی زیور کا سن کر الیاس کے لہجے میں نرمی آگئی۔

"تم بے فکر رہو۔ میں نے دیکھ پرکھ کر ہی اپنی رضا مندی ظاہر کی ہے۔" ساجدہ نے مکاری سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور الیاس کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"فاتح! تمہاری تیاری ہو گئی ہے؟" شائستہ فاتح کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! تمہاری فلائیٹ میں تھوڑی ہی دیر ہے۔ پھر تمہیں ایئرپورٹ بھی جانا ہے۔"

"جی مما! میں تیار ہوں۔" فاتح آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال بنا رہا تھا۔ بلیو جینز اور بلیو ٹی شرٹ پر وائٹ کوٹ کی آستینیں تھوڑی سی اوپر چڑھائے وہ بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

"ماشاء اللہ میرے بیٹے کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔" شائستہ اس کے قریب چلی آئیں۔

"ویسے مما! صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔" وہ شرارت سے بولا۔

"آپ کوئی تعویذ مجھے باندھ دیں تاکہ ہنزہ کی کوئی حسینہ مجھے اپنی نظروں سے باندھ نہ لے اور میں وہیں کا ہو کر نہ رہ جاؤں۔"

"چل ہٹ بدتمیز!" شائستہ نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"دنیا کی کسی حسینہ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین سکے۔" وہ فخریہ بولی تھیں۔

"صحیح کہا آپ نے اب کسی حسینہ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتے پہنتے ہوئے بولا۔

"آپ نے ایک اپسرا جو مجھے دکھا دی ہے۔ اب تو کوئی لڑکی نظروں کو نہیں جچے گی۔"

"شرم کرو۔ زینا تمہارے ماموں کی بیٹی ہے فاتح۔" اس کا اشارہ سمجھ کر شائستہ نے اسے ٹوکا اور ساتھ میں ہدایت بھی کرنے لگیں۔

"اور اس سے دور ہی رہا کرو۔ زیادہ تنگ مت کیا کرو۔"

"دور رہنے کی بات تو تب ہے جب وہ پاس آنے دے۔" وہ اک آہ بھر کر بولا۔

"ویسے مما! اس کے ساتھ کوئی پرابلم ہے کیا؟ وہ اتنی الگ تھلگ سی اور چپ کیوں رہتی ہے؟ اتنے دنوں میں میں نے اسے باہر آتے جاتے بھی نہیں دیکھا۔" وہ اپنے دل میں دبا سوال زبان پر لے آیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایک خاموش طبع اور سنجیدہ مزاج کی لڑکی ہے۔ کسی سے ملنا جلنا اسے پسند نہیں۔" وہ فاتح کو ٹالنے لگیں۔

"تمہاری فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ تمہارے لیے گاڑی نکلواؤں؟"

"نہیں میرے فرینڈز مجھے لینے آئیں گے۔" اچانک اس کا موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھ کر وہ بولا۔

"بلکہ آگئے ہیں اوکے مما! اللہ حافظ۔" اس نے شائستہ کے گال پر پیار کیا۔

"اللہ حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔" وہ اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

"اوکے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور اپنا بیگ اٹھا کر جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"نسرین! میں نے الیاس سے بھی بات کر لی ہے۔" نسرین کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھیں جب ساجدہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"وہ بھی سن کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

"زینی تو بہت سمجھدار اور باصلاحیت بچی ہے میں تو شروع سے اسے دیکھ کر سوچتا تھا کہ اگر یہ میرے ایاز کا نصیب بن جائے تو اس کی زندگی بن جائے گی۔" وہ چالاکی سے کہانی بنانے لگیں۔

"یہ تو الیاس بھائی کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے میری زینی کو اس قابل سمجھا۔" نسرین خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔

"وہ تو کہہ رہے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ نیک کام کرو۔ تاکہ ہم بھی اپنے پوتوں کا منہ دیکھیں۔" وہ منہ میں پان رکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں۔

"لیکن میں نے تو کہہ دیا کہ تھوڑا تو صبر کرنا پڑے گا۔ چاہے چھوٹی ہی سہی لیکن تقریب تو ہم کریں گے اس میں کم از کم پانچ چھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ آخر ہمارے بچوں کی پہلی خوشی ہے۔ کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟" آخر میں وہ نسرین سے پوچھنے لگیں۔

"ساجدہ! میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ پانچ چھ مہینے میں تیاری کیسے ہو گی؟ میری ایک ہی بچی ہے میں اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔" نسرین بیٹی کی محبت میں چور لہجے میں بولیں تو ساجدہ کے چہرے پر مخصوص سی چمک آگئی۔ وہ جو جاننا چاہتی تھی جان گئی تھیں۔

"ہاں ہاں جو کرنا چاہتی ہو شوق سے کرنا اور ابھی تو بہت ٹائم ہے ہمارے پاس میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ دونوں بہنیں مل کر خریداری کریں گی۔" ساجدہ نے نسرین کے قریب آکر ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے میٹھے لہجے میں دلاسا دیا تو وہ ان کے اس خلوص پر مسکرانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

زینا لان میں چیئر پر بیٹھی دھیرے دھیرے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ اس کی نظریں لان کے خوب صورت پھولوں پر جمی تھیں۔ شائستہ پھپھو کے خوب صورت گھر میں اسے سب سے زیادہ یہ لان ہی بھایا تھا۔ بے شمار مختلف قسم کے پھولوں سے آراستہ اس لان میں اک عجیب سا ذہنی و دلی سکون ملتا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آجایا کرتی تھی۔

"کیسی ہو زینی بیٹا!" شائستہ اس کے نزدیک ایک چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں ٹھیک ہوں پھپھو!" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

شائستہ کچھ دیر اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھتی رہیں۔ انہیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں تھا کہ اتنی خوب صورت آنکھیں انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔ ان آنکھوں میں ٹھہرے سوگوار تاثر نے انہیں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔

"بیٹا! اس طرح کمرے میں بند نہ رہا کرو۔ باہر نکلو۔ فرینڈز بناؤ۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لو مصروف رہو گی تو پرانی یادیں تمہیں پریشان نہیں کریں گی۔" زینا نے اک نظر شائستہ کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔

"جی پھپھو! میں سوچوں گی اس بارے میں۔"

"تم سوچو گی تو سوچتی رہو گی اور کچھ کر نہیں پاؤ گی میں تمہارے لیے ایڈمیشن فارم منگوا دوں گی تم فل کر

کے مجھے دے دینا۔"
"لیکن پھپھو! میں ابھی۔۔۔"
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" انہوں نے ممتا بھری سختی سے زینا کی بات کاٹی۔
"بس میں اور تمہیں اس طرح خود کو ضائع کرتے نہیں دیکھ سکتی، بہت کرلی تم نے اپنی من مانی۔" ان کے اس انداز پر زینا خاموش ہو گئی اور نظریں جھکا کر اپنے ہاتھ میں پکڑے خالی کپ کو دیکھنے لگی۔
"فاتح اچھا لڑکا ہے۔ اس سے دوستی کرو۔ وہ ایک اچھا اور ہمدرد دوست ثابت ہو گا۔ تمہارے اکیلے پن میں بھی کمی آجائے گی میں تو ہر وقت مصروف رہتی ہوں تمہیں زیادہ ٹائم نہیں دے پاتی۔" وہ مزید اس کے لیے زندگی کی طرف لوٹنے کے بہانے تلاش کر رہی تھیں۔
"پھپھو! آپ نے اسے میرے بارے میں بتایا تو نہیں؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔
"نہیں میری جان! میں جانتی ہوں کہ تمہارے نزدیک تمہاری عزت نفس کی کیا اہمیت ہے۔" اسی پل ان کے موبائل کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ انہوں نے نمبر دیکھا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"اپنا خیال رکھا کرو۔" جاتے جاتے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دلہن ہم لے جائیں گے۔" زینی مگن انداز میں آئرن اسٹینڈ کے پاس کھڑی اپنے کپڑے استری کر رہی تھی کہ قریب سے ہی ایاز کی گنگناہٹ کانوں میں پڑی تو اسے سارے جسم کا خون چہرے پر سمٹتا محسوس ہوا۔
ایاز دیوار سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ زینی مسلسل اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ذرا کی ذرا اپنی پلکیں اٹھائیں اور مزید گھبرا گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ سجی تھی اور چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔
"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"
"پھر کیسے دیکھوں؟" اس نے شرارتی لہجے میں جواباً سوال کیا۔
"کسی طرح بھی مت دیکھو۔" زینی کی آواز کانپنے لگی۔
"کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں گا بھئی اپنی ہونے والی بیوی کا دیدار کر رہا ہوں کسی غیر کا نہیں۔" ایاز ہنسنے لگا۔
"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کوئی سن لے گا۔" زینی اس کے انداز پر گھبرا رہی تھی۔
"کوئی نہیں سنے گا۔ میں دیکھ کر آیا ہوں اماں اور خالہ دونوں سو رہی ہیں۔" وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا۔
زینی اپنے آپ میں سمٹ گئی اور جلدی جلدی دوپٹے پر استری پھیرنے لگی۔
"زینی!" ایاز نے اسے پکارا تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔
"ہاں!"
"تم خوش تو ہو نا؟" ایاز اس کے چہرے پر نظریں جمائے پوچھ رہا تھا۔
"بہت خوش ہوں۔" جواب دیتے ہوئے زینی کا چہرہ چمکنے لگا۔ سچی خوشی کے سارے رنگ اس وقت اس کے چہرے پر سجے تھے۔
"میں بھی بہت خوش ہوں۔" ایاز نے اچانک دوپٹہ طے کرتی زینی کا ہاتھ تھاما تو وہ کانپ سی گئی اور جھٹکے سے اس سے دور ہو گئی۔
"ایاز!"
"کیا ہوا؟" وہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ یک ٹک خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"تم اس طرح۔۔۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں تمہارا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکتا؟" ایاز کی خوش مزاجی پل بھر میں غصے میں بدل گئی۔

"منگیتر ہو میری پانچ چھ مہینے بعد میری بیوی بن جاؤ گی۔"
"لیکن ابھی بیوی بنی تو نہیں ہوں ایاز! تم جانتے ہو مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔" وہ نرم لیکن مضبوط لہجے میں بولی تھی۔
"لیکن مجھے پسند ہے اور میں اب سے لے کر شادی تک کا تمام عرصہ پوری طرح انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تمہاری یہ دقیانوسیت سارا موڈ خراب کر دیتی ہے۔" وہ تیز لہجے میں کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا تو زینی حق دق اسے جاتا دیکھتی رہی۔
اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وہ آہستہ سے زمین پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔
"آخر ایاز کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے تو یہ ایسا نہیں تھا؟" زینی نے خود سے سوال کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"زینا!" زینا ٹیرس کی سیڑھیوں پر بیٹھی نہ جانے کون سی الجھی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی جب شائستہ نے اسے پکارا۔
"جی پھپھو؟" وہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔
"تمہارا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو گیا ہے اور پرسوں سے تمہاری کلاسز بھی اسٹارٹ ہو رہی ہیں اوکے۔" شائستہ نے مصروف سے انداز میں اسے اطلاع دی۔ اس نے شائستہ کے نک سک سے تیار سراپے پر نظر ڈالی۔ شاید وہ کہیں جا رہی تھیں۔
"اوکے پھپھو!" وہ فرمانبرداری سے بولی۔
"میں ایک پارٹی میں جا رہی ہوں۔ تم کھانا کھا لینا۔ میرا انتظار مت کرنا۔" وہ جاتے جاتے اسے ہدایت دے گئیں۔
وہ ڈھیلے ڈھیلے انداز میں چلتے ہوئے لاؤنج میں آگئی اور ٹی وی آن کر کے بے مقصد چینل بدلنے لگی جب اس کام سے بھی اکتا گئی تو ٹیبل پر دھرا اک میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔
اسی وقت ٹیلی فون بجنے لگا۔ اس نے بے زاری سے ٹیلی سیٹ کی طرف دیکھا پھر یہ سوچ کر کہ کوئی ملازم آکر دیکھ لے گا پھر سے میگزین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن جب کوئی نہ آیا اور فون مسلسل بجتا رہا تو اسے ہی اٹھنا پڑا۔
"ہیلو!" ریسیور کان سے لگا کر اس نے کہا۔
"کون؟" دوسری طرف دلکش آواز میں پوچھا گیا۔
"شائستہ پھپھو تو گھر پر نہیں ہیں۔" زینا سمجھ ہی نہیں پائی کہ کیا جواب دے۔
"اوہ! زینا! آپ ہیں میں فاتح بات کر رہا ہوں۔" فاتح خوشگوار لہجے میں بولا۔ جواباً زینا خاموش رہی۔
"مما کہاں گئی ہیں؟ فاتح نے اس کی خاموشی سے اکتا کر سوال کیا۔
"وہ کسی پارٹی میں گئی ہیں۔"
"آپ نہیں گئیں؟"
"نہیں۔"
"وجہ؟"
"ایک بات مجھے بار بار دہرانا پسند نہیں۔" زینا ناگواری سے بولی۔
"اوہ! سوری میں بھول گیا تھا کہ آپ کو پارٹیز پسند نہیں۔ ویسے آپ اتنی آدم بے زار کیوں ہیں؟" آخر میں اس کا لہجہ شرارتی ہو گیا۔
"میں آدم بے زار ہوں یا جو بھی ہوں آپ میرے بارے میں اتنا سوچ کر اپنی توانائی ضائع مت کیا کریں مجھے نہیں پسند کہ کوئی میرے بارے میں اتنا غور کرے۔" زینا نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔
فاتح جب بھی زینا سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو اسے اسی طرح غصہ آجاتا حالانکہ پھپھو نے کہا تھا کہ وہ فاتح سے دوستی کر لے۔ لیکن وہ تو اس سے دو منٹ بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔
زینا پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو نسیم نے اسے روک لیا۔
"زینا بی بی! کھانا لگ گیا ہے۔"
"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ پلٹنے لگی تو نسیم پھر

بولی۔
"بڑی بی بی نے مجھے سختی سے آپ کے کھانے کے لیے کہا تھا۔ اگر انہیں پتا چلا کہ آپ نے کھانا نہیں کھایا تو وہ ناراض ہوں گی۔"
نسیم کی بات سن کر وہ طوہا" کرہا" ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

زینی ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی اور جائے نماز تہ کر رہی تھی جب ایاز کمرے میں داخل ہوا۔
"زینی! یہ لو۔" اس نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔
"یہ کیا ہے؟" زینی پیکٹ الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔
"خود ہی دیکھ لو۔" اس نے پیکٹ کھولا تو اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس میں گلابی اور سفید رنگ کی خوب صورت سی کانچ کی چوڑیاں تھیں اور کانچ کی چوڑیاں زینی کی کمزوری تھیں۔
"تھینک یو ایاز! بہت خوب صورت چوڑیاں ہیں۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔
"تمہیں اچھی لگیں؟" ایاز نے دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
"بہت۔" وہ ہنسنے لگی۔
"اسی طرح ہنستی رہا کرو تمہیں ہنستے ہوئے دیکھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔" ایاز نے کہا تو زینی جھینپ گئی۔
"تمہارے لیے چائے بناؤں؟"
"ہاں! بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ ذرا کڑک سی چائے بنانا جب تک میں تازہ دم ہو جاؤں۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد زینی نے بھی کچن کا رخ کیا۔
کچن میں امی اور خالہ مل کر رات کے کھانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے چائے کا پانی رکھنے لگی۔
"کیا بات ہے زینی بڑی خوش نظر آ رہی ہو؟"
ساجدہ نے تولتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"کچھ نہیں خالہ! بس ایسے ہی۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔
"اوہو! میں بھی بڑی بے وقوف ہوں۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ شادی نزدیک آجائے تو لڑکیوں کے دلوں میں ایسے ہی لڈو پھوٹتے ہیں۔" وہ بے ہنگم انداز میں ہنستے ہوئے بولیں تو زینی مزید شرمندہ ہو گئی۔
"چھوڑو ساجدہ! کیوں بچی کو تنگ کرتی ہے۔ حالت تو دیکھ اس کی کتنی گھبرا رہی ہے۔" نسرین نے ساجدہ کو ٹوکا اور نظروں ہی نظروں میں زینی کی نظر اتاری دن بہ دن اس پر بے پناہ روپ چڑھ رہا تھا اور اس وقت تو وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اور ادھر زینی ایاز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے قدرے سکون ہوا تھا کہ ایاز کا رویہ بدل گیا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نسیم! فاتح کو جا کر دیکھو اٹھایا نہیں اس سے کہو کہ میں ان کا ناشتے پر انتظار کر رہی ہوں۔" شائستہ نے ملازمہ سے کہا فاتح دو دن پہلے نادرن ایریاز سے واپس آیا تھا اور آج سے اسے آفس جوائن کرنا تھا۔
فاتح کا ذکر سن کر زینا کے تاثرات میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ فاتح کی موجودگی میں وہ عجیب قسم کی بے چینی محسوس کرتی تھی۔
"کیا ضرورت تھی اسے ابھی پاکستان آنے کی۔ دو چار سال اور امریکہ میں نہیں گزار سکتا تھا۔" وہ ناگواری سے سوچے جا رہی تھی جب فاتح نے ڈائننگ روم میں قدم رکھا۔
"گڈ مارننگ ایوری باڈی!" کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"گڈ مارننگ بیٹا!" جواب صرف شائستہ کی طرف سے آیا تھا۔
"کیسا رہا تمہارا ٹرپ؟"
"بہت زبردست مما! یہ میری زندگی کا اک اور

یادگار ٹرپ تھا۔" زینا نے ایک نظر فاتح کی طرف اٹھائی وہ بہت خوش لگ رہا تھا کچھ لوگوں کے لیے زندگی کتنی خوب صورت اور آسان ہوتی ہے۔ یہ بات زینا صرف سوچ ہی سکی پھر ہاتھ میں پکڑے چائے کے کپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے! تو پھر آج سے گھومنا پھرنا ختم اور کام شروع؟" شائستہ مطلب کی بات پر آ گئیں۔
"آف کورس مما! اسی لیے تو اتنی صبح تیار ہو گیا۔" فاتح نے سینڈوچ کھاتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔
"لیکن تمہاری یہ تیاری آفس کے لیے موزوں نہیں ہے۔" ان کا اشارہ اس کے لباس کی طرف تھا۔ اس نے بلیو جینز پر وائٹ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔
"اوہ مما! اب کیا مجھے وہ بورنگ سوٹ پہننا پڑے گا؟" وہ ناگواری سے پوچھنے لگا۔
"ظاہر ہے مینرز بھی کوئی چیز ہے فاتح! تم دودھ پیتے بچے نہیں ہو جسے ہر بات سمجھانی پڑے گی۔ بی میچیور۔" شائستہ کو اس کی اس بچکانہ بات پر بہت غصہ آیا۔
زینا حیرت سے شائستہ کو دیکھنے لگی وہ انہیں پہلی بار اتنے غصے میں دیکھ رہی تھی۔
"اوکے مام! میں چینج کر لیتا ہوں آئم سوری۔" فاتح نرمی سے بولا۔
"اٹس اوکے بیٹا!" انہیں اپنے سخت لہجے کا احساس ہوا تھا۔
"آج کل بزنس کا بہت برڈن ہے کام کا غصہ میں نے تم پر نکال دیا بیٹا میں تھک گئی ہوں اکیلے یہ سب دیکھتے ہوئے اب تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولیں تو فاتح نے اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آ گیا اور انہیں کندھوں سے تھام کر بولا۔
"مما! میں آ گیا ہوں نا۔ اب سب کچھ دیکھ لوں گا۔ آپ کا ساتھ دینے ہی تو آیا ہوں۔ آپ دیکھیے گا بزنس کو کہاں سے کہاں پہنچا دوں گا۔" شائستہ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں انہوں نے بے اختیار اس کا ماتھا چوم لیا پھر سنبھل کر بولیں۔
"میں آفس جا رہی ہوں تم جلدی آجانا اور آتے ہوئے زینا کو یونیورسٹی ڈراپ کر دینا۔" شائستہ کی بات سن کر زینا فورا" بولی۔
"نہیں پھپھو میں پوائنٹ سے چلی جاؤں گی۔"
کہاں وہ اس کی موجودگی برداشت نہیں کر پاتی تھی اور کہاں پندرہ منٹ کا سفر اس کے ساتھ طے کرنا پڑتا۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے پوائنٹ سے جانے کی جب گھر میں گاڑی ہے فاتح تمہیں چھوڑ دے گا۔" وہ نرمی سے کہتے ہوئے ڈائننگ سے باہر نکل گئیں۔ زینا بھی پاؤں پٹختی ان کے پیچھے ہی نکل گئی۔
زینا کے برعکس فاتح بہت خوش تھا کہ اسے زینا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔
زینا لاؤنج میں تیار کھڑی غصے بھرے انداز میں فاتح کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دو بار نسیم کو اسے بلانے کے لیے بھیج چکی تھی۔ اس بار وہ خود اسے بلانے کے ارادے سے آگے بڑھی تو وہ سیڑھیوں سے اترتا دکھائی دیا۔ گرے سوٹ زیب تن کیے وہ خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔
"معافی چاہتا ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" اس نے نزدیک آکر معذرت کی۔ کچھ دیر پہلے وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھی لیکن اب بولی تو صرف اتنا۔
"کوئی بات نہیں۔"
"چلیے۔" فاتح کے کہنے پر وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔
"کیسی جا رہی ہے آپ کی اسٹڈیز؟" زینا جو بھاگتے دوڑتے مناظر پر نظریں جمائے بیٹھی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
"جی؟ کچھ کہا آپ نے؟"
"جی میں نے کہا کیسی جا رہی ہے آپ کی اسٹڈیز؟"
وہ اس کے انداز پر مسکرانے لگا۔
"اچھی جا رہی ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اسٹڈیز کے علاوہ اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"کچھ خاص نہیں۔"

"یونیورسٹی میں فرینڈز تو خوب بنی ہوں گی آپ کی؟"

"کچھ خاص نہیں۔"

"لگتا ہے یہ آپ کا پسندیدہ جملہ ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔

"کیا؟" زینا نے الجھ کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" زینا فاتح کے چہرے پر شرارت دیکھ کر جھینپ سی گئی۔

"مجھے دوستی کرنا بہت پسند ہے۔" کچھ لمحوں بعد فاتح نے کہا۔

"میرے بہت سارے دوست ہیں جب میں اپ سیٹ ہوتا ہوں تو اپنے دوستوں کو کال کرتا ہوں۔ پارٹی کرتا ہوں بہت انجوائے کرتا ہوں۔ اس طرح میری ساری ٹینشن دور ہو جاتی ہے آپ بھی دوست بنایئے خوش رہیں گی۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے نظر بھر کر زینا کے چہرے کو دیکھا۔

"ضروری تو نہیں کہ آپ کا فارمولا مجھ پر بھی کام کر جائے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اور ویسے بھی مجھے تنہا رہنا زیادہ پسند ہے۔"

فاتح نے پھر ایک نظر زینا پر ڈالی وہ اسے اک مقفل قلعے کی طرح لگی تھی۔ اس نے گاڑی یونیورسٹی کے آگے روک دی۔

"میرے دوست کہتے ہیں کہ میں بہت اچھا دوست اور رازدار ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھے بتائیں کہ وہ کتنا صحیح کہتے ہیں۔"

زینا کوئی جواب دیے بغیر گاڑی سے باہر نکل گئی اور فاتح کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

☆ ☆ ☆

نسرین اور ساجدہ بے شمار شاپرز سے لدی پھندی ابھی بازار سے لوٹی تھیں۔ زینی نے دونوں کو ٹھنڈا پانی پیش کیا۔

"توبہ! آج تو گرمی نے حد کر دی۔" ساجدہ نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ لوگوں سے صبح ہی کہا تھا کہ آج گرمی بہت ہے۔ لیکن آپ لوگ ہی نہیں مانے۔"

زینی ایک ایک شاپر کھول کر دیکھنے لگی۔

"زینی! یہ ساڑھی دیکھو۔" نسرین نے اس کے آگے فیروزی رنگ کی زرتار ساڑھی کھول کر رکھی۔

"بہت خوب صورت ہے امی!"

"ارے! یہ ساڑھی چھوڑ تو یہ میرون کلر کا سوٹ دیکھ سب کچھ بھول جائے گی۔" ساجدہ نے ایک اور جوڑا اس کے آگے کیا۔

"خالہ! یہ تو بہت زیادہ خوب صورت ہے۔" اس نے میرون کلر کا خوب صورت بنارسی کپڑا اپنے ساتھ لگا کر دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے میں نے کیا کیا سوچا ہوا ہے۔ یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا۔" نسرین کے لہجے سے زینی کے لیے محبت پھوٹ رہی تھی۔

"امی! اتنا سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کون سا میں کہیں دور جا رہی ہوں۔ اسی گھر میں تو رہنا ہے مجھے۔"

ساجدہ جو نسرین کی بات پر پوری طرح خوش بھی نہیں ہو پائی تھی کہ زینی کے جواب پر تڑخ کر بولی۔

"تجھے کوئی ضرورت نہیں ہے بڑوں کی باتوں میں بولنے کی اور جب ماں خوشی سے یہ سب کر رہی ہے تو تیرا اس طرح ناشکری کرنا تو نحوست بھی ڈال سکتا ہے۔"

"زینی! ساجدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" نسرین نے ساجدہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن امی! اتنا خرچہ کرنے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ آپ نے کہیں سے قرض تو نہیں لے لیا؟" زینی نے شکی لہجے میں کہا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی سے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے تمہارے ابو کو وہ تمہارے لیے بہت کچھ جمع کر کے گئے ہیں۔" نسرین آبدیدہ لہجے میں بتا رہی تھیں۔

"بہت پیار کرتے تھے تمہارے ابو تم سے۔ اگر آج موجود ہوتے تو تمہارے تصور سے بھی زیادہ خوشیاں دیتے تمہیں۔" نسرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو زینی بھی رونے لگی نسرین نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

ساجدہ نے ایک نظر اس جذباتی منظر پر ڈالی پھر بھناتے ہوئے سوچنے لگیں۔ یہ نسرین بھی بڑی گھنی ہے اتنا کچھ جمع کر رکھا ہے اور آج تک مجھے ہوا بھی لگنے نہیں دی۔

☆ ☆ ☆

فاتح ابھی آفس سے لوٹا تھا اپنے کمرے سے جب وہ فریش ہو کر باہر آیا تو زینا کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اور اندر عقیدت سے نماز پڑھتی زینا نظر آ رہی تھی وہ اس وقت اتنی حسین، اتنی پاکیزہ لگ رہی تھی کہ فاتح یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ نہ جانے کتنے لمحے گزر گئے لیکن فاتح کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا۔

"صاحب جی!" سامنے کھڑی نسیم کے پکارنے پر فاتح چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ نے تو چائے بنا کر لان میں پہنچانے کا کہا تھا۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ حیرت سے کبھی اسے اور کبھی زینا کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

فاتح دل ہی دل میں تو اس کے اس انداز پر بڑا شرمندہ ہوا مگر الٹا اسے ڈانٹنے لگا۔

"تمہارا انتظار کر رہا ہوں اسٹوپڈ! کہاں رہ گئی تھیں تم؟ چائے بننے میں اتنی دیر لگتی ہے کیا؟ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں تمہارے انتظار میں کیا پورا دن یہاں کھڑا رہوں؟"

"صاحب جی! میں تو......"

"اب چلو آگے صاحب جی کی بچی۔" فاتح نے منہ بنا کر اس کی نقل اتاری تو نسیم اس کے تیوروں سے گھبرا کر آگے بڑھ گئی فاتح بھی اپنی حرکت پر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"آیئے، آیئے جناب! آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔" زینا نماز پڑھ کر لان میں آئی تو کرسی پر فاتح کو براجمان پایا۔ وہ دوبارہ پلٹ جانا چاہتی تھی لیکن اس کے پکارنے پر آگے بڑھنا پڑا۔

"کون کر رہا تھا میرا انتظار؟" چیئر پر بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"میں کر رہا تھا آپ کا انتظار۔"

"کیوں؟"

"کیا میں آپ کا انتظار نہیں کر سکتا؟"

"نہیں۔"

"لگتا ہے آپ نے میری پیشکش قبول نہیں کی؟"

"کون سی پیشکش؟"

"دوستی کی پیش کش۔"

"آپ نے مجھے دوستی کی پیش کش کب کی؟"

"ارے! آپ بھول گئیں۔ اس دن میں نے آپ کو یونیورسٹی ڈراپ کرتے وقت آپ سے کچھ کہا تھا۔" فاتح نے اسے یاد دلایا۔

"لیکن آپ نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ میں آپ کو بتاؤں کہ آپ کتنے اچھے دوست ہیں۔" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تو فاتح کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"میں آپ کو اتنا کند ذہن نہیں سمجھتا تھا۔" فاتح نے صاف کہا تو وہ تڑخ کر بولی۔

"میں کند ذہن نہیں ہوں۔"

"چلیں مان لیا کہ آپ بہت سمجھ دار ہیں تو کیا میں سمجھوں کہ یہ سمجھدار لڑکی میری دوست ہے۔" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا تو زینا اسے دیکھنے لگی۔

"ضروری تو نہیں کہ دوستی کرنے کے لیے عہد و پیمان کیے جائیں، زبانی کلامی معاہدہ ہو دوستی تو بس ہو جاتی ہے۔"

فاتح نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی گہری بات کہہ جائے گی۔

"تو کیا ہم دوست ہیں؟"
"اگر نہیں ہیں تو بن جائیں گے۔" وہ لان میں لگے پھولوں پر نظریں جما کر بولی۔
"فاتح اس کے اور اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ زینا مسلسل پھولوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔
"تمہیں پھول بہت پسند ہیں؟" چائے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے فاتح نے پوچھا۔
"ہاں! بہت پسند ہیں۔ بالکل زندگی کی طرح ہوتے ہیں دونوں میں ایک چیز Similer ہوتی ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔
فاتح گہری نظروں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔
"کیا؟"
"دونوں کانٹوں سے پر ہوتے ہیں۔" زینا کے چہرے پر ایسا ہی تاثر آیا تھا جیسے کوئی کانٹا اسے چبھا ہو
فاتح نے الجھن بھرے انداز میں اس قفل زدہ قلعے کی طرف دیکھا۔ جو شاید اپنے در اب کھولنے کا خواہش مند تھا۔

☼ ☼ ☼

"زینی! امی اور خالہ کہاں ہیں؟" ایاز ابھی آفس سے آیا تھا۔ گھر خالی لگا تو زینی کو ڈھونڈتا کچن میں چلا آیا جو رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔
"وہ دونوں بازار گئی ہیں۔ تمہارے لیے چائے بناؤں؟" وہ سلیب صاف کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولی۔
یہ سن کر کہ گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے ایاز کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آئی تھی جسے زینی اس کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے نہ دیکھ سکی۔
"ہاں! ایک کپ زبردست سی چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔
وہ خوشی خوشی چائے بنانے لگی۔ ایاز کا کوئی بھی کام کرتے ہوئے وہ ہمیشہ ایسے ہی خوشی محسوس کرتی تھی۔
کچھ دیر بعد زینی چائے لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو جھجک کر رک گئی وہ بنا شرٹ کے صرف جینز میں ملبوس تھا۔
"آؤ نا زینی! رک کیوں گئیں۔" وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ سنبھل کر آگے بڑھی۔ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ ایاز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"زینی جان! تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو۔" اس کے گمبھیر لہجے میں کہنے پر زینی کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا اس نے آہستگی سے اپنی نازک کلائی اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔
"مجھے کچن میں کچھ کام کرنے ہیں۔" وہ لرزتی آواز میں بولی تھی۔
"کام تو ہوتے رہیں گے جان! لیکن یہ وقت دوبارہ نہیں آئے گا۔" وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آگیا۔
زینی پھٹی آنکھوں سے اپنے مقابل کھڑے اس انسان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پورے وجود سے کانپ رہی تھی۔
"میرا ہاتھ چھوڑو ایاز!" اس نے سسک کر کہا۔
"اوہو! زینی! بچوں کی طرح بی ہیومت کرو منگیتر ہو تم میری کچھ عرصے بعد میری بیوی بن جاؤ گی۔" اس نے ایک جھٹکا دے کر زینی کو کھینچا تو وہ اس کے سینے سے آ کر لگی۔
"تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو مجھے جانے دو پلیز۔" زینی ایک نازک پرندے کی طرح اس کی گرفت میں پھڑپھڑا رہی تھی لیکن اپنے آپ کو چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ ایاز اسے کھینچتے ہوئے بیڈ کی طرف لے جانے لگا تو نا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ ایاز کو دھکا دے کر وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اس کا دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ اپنے راستے میں حائل تمام دیواریں گرا کر جسم سے

باہر نکل آئے گا۔
"زینی! دروازہ کھولو۔" ایاز زور زور سے دروازہ بجانے لگا۔ زینی بے آواز روئے جا رہی تھی۔
"دروازہ کھولو زینی! تم اس طرح میری بے عزتی نہیں کر سکتیں دروازہ کھولو۔" وہ اب دروازہ پیٹنے لگا تھا۔ زینی کے آنسوؤں میں اب تیزی آگئی تھی اور اس کا وجود اب جھٹکے کھانے لگا تھا۔
"بہت اکڑ ہے نا تم میں، میں تمہاری یہ اکڑ نکال کے رہوں گا۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔
"اب جب تک تم میرا یہ تقاضا پورا نہیں کرو گی تب تک تم سے شادی نہیں کروں گا۔" وہ دروازے پر ٹھوکریں مارتا ہوا چلا گیا۔
زینی بے اختیار نیچے بیٹھ گئی تھی اور اب زور زور سے رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زینی! اب طبیعت کیسی ہے؟" نسرین اور ساجدہ جب گھر واپس آئیں کچن میں ساری چیزیں پھیلی ہوئی دیکھ کر نسرین زینی کے کمرے میں آئیں تو اسے بستر میں نڈھال پایا پھر سارا کام انہوں نے خود کیا اور اسے باہر آنے سے منع کر دیا تھا۔
"ٹھیک ہوں امی!" اس نے نقاہت بھری آواز میں جواب دیا۔
نسرین پیار سے اس کے ماتھے پر بکھرے بال سمیٹنے لگیں تو ٹھٹک کر رک گئیں۔
"زینی! تمہارا چہرہ اتنا سفید کیوں ہو رہا ہے؟"
"امی! طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید اس لیے۔" اس نے نسرین سے نگاہیں چرائیں۔
"نہیں ایک ماں کی نظر کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" نسرین نے شک بھری نظروں سے اس کے چہرے کو کھوجا۔
"امی! ابو اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔" زینی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تو نسرین نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا۔
"میری جان! تمہارے ابو بہت اچھے انسان تھے اور اچھے لوگوں کو اللہ اپنے پاس جلدی بلا لیتا ہے۔" نسرین نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔
"ابو کو میرا اور آپ کا خیال کیوں نہیں آیا؟" اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔
"پگلی! ایسے نہیں کہتے زندگی اور موت کا تو وقت مقرر ہے میری یا تمہاری کیا اوقات کہ اس میں کوئی ردوبدل کر سکیں۔" زینی بچوں کی طرح نسرین کے سینے پر اپنا سر رگڑ رہی تھی ماں کی گود ملتے ہی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے آنسو پھر بہنے لگے۔
"میری جان کو آج اپنے ابو بہت یاد آ رہے ہیں؟" نسرین نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔
"ہاں امی! آج مجھے ابو کی بہت یاد آ رہی ہے۔" نسرین نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں کچھ دیر بعد زینی گہری نیند سو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

فاتح بہت محنت اور لگن سے بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ شائستہ اس سے بے حد خوش تھیں۔ اب بھی وہ رات گئے اپنے کمرے میں بیٹھا آفس کے کام میں مصروف تھا۔ چائے کی طلب محسوس ہوئی تو کچن میں چلا آیا۔
یہ دیکھ کر کہ زینا پہلے ہی کچن میں موجود ہے ایک بھرپور مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔
"کیا کر رہی ہیں آپ؟" اس کے نزدیک جا کر فاتح نے دھیرے سے کہا تو وہ چونک کر پلٹی اچانک پکارے جانے پر فطری خوف کی ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر آئی تھی کچھ پل بعد وہ نارمل لہجے میں بولی۔
"چائے بنا رہی ہوں۔"
"اگر تکلیف نہ ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی بنا دو۔" دوستانہ لہجے میں کہتا ہوا وہ ایک کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔

وہ خاموشی سے اس کے اور اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر زینا نے فاتح کے سامنے ٹیبل پر چائے کا کپ رکھا اور اپنی چائے لے کر کچن سے باہر جانے لگی تو فاتح نے اسے پکارا۔

"زینا! میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے میں کیا برائی ہے؟"

"دراصل میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر اسٹڈی کر رہی تھی چائے کی طلب محسوس ہوئی تو کچن میں چلی آئی۔" زینا نے توجیہ پیش کی سچ تو یہ تھا کہ وہ رات کے اس پہر فاتح کے ساتھ بیٹھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"واؤ! عجیب اتفاق ہے۔" فاتح اس کی بات پر ہنسنے لگا۔

"میں بھی اپنے کمرے میں آفس کا کام کر رہا تھا چائے کی طلب محسوس ہوئی تو یہاں چلا آیا اب جس طرح میں کچھ وقت خود کو دے رہا ہوں اسی طرح آپ بھی کچھ وقت خود کو دے سکتی ہیں پھر اسٹڈی تو ہوتی رہے گی۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا تو زینا کو مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا فاتح نے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے گہری نظروں سے زینا کا جائزہ لیا۔ وہ پنک کلر کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کی جھکی جھکی دراز پلکیں بے حد گھنی تھیں۔ فاتح ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

زینا اپنے چہرے پر اس کی نگاہیں محسوس کر رہی تھی اور بے چینی سے پہلو بھی بدل رہی تھی۔

"آپ جیسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" فاتح اچانک بولا تو وہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"لڑکیاں فاتح مصطفیٰ سے دو منٹ کے لیے بھی گفتگو کرنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہیں اور ایک آپ ہیں۔" فاتح نے خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت کی تو زینا ناگواری سے بولی۔

"وہ اور قسم کی لڑکیاں ہوتی ہوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ اپنا کپ لے کر سنک کی طرف بڑھ گئی اور چائے کے برتن دھونے لگی۔ فاتح نے بھی خالی کپ سنک پر رکھا اور خاموشی سے اسے برتن دھوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں زینا کے خوب صورت ہاتھوں پر تھیں۔

"زینا! تم کیا شروع ہی سے ایسے کام کرتی رہی ہو۔"

"کون سے کام؟" زینا نے الجھ کر پوچھا۔

"مطلب یہ برتن دھونا وغیرہ؟"

"ہاں! اور اس میں برائی کیا ہے گھر کے کام کرنا تو اچھی بات ہے۔"

"اس کے باوجود تمہارے ہاتھ بہت سوفٹ اور خوب صورت ہیں۔" فاتح نے بے اختیار کہا تو زینا کے ہاتھ سے کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس کے چہرے پر اچانک سختی در آئی تھی جلدی جلدی برتن خشک کر کے اسٹینڈ پر رکھنے لگی۔

فاتح اس کے اندر آنے والی اس اچانک تبدیلی کو محسوس نہیں کر پایا تھا۔ کیونکہ اس کی نظریں اب بھی اس کے ہاتھوں پر تھیں۔ اس کے دل میں اچانک خواہش جاگی کہ وہ یہ ہاتھ چھو کر دیکھے اور وہ اپنی اس خواہش کو دبا بھی نہ سکا یہ ایسی ہی معصوم خواہش تھی جو کسی چھوٹے سے بچے کے دل میں کسی خوب صورت چیز کو دیکھ کر اسے چھونے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔

زینا کو کرنٹ سا لگا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ کھینچا اور فاتح کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

فاتح حق دق اسے دیکھنے لگا۔ زینا سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بری طرح لرز رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"سمجھتے کیا ہیں آپ مجھے؟" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔

"کوئی زر خرید غلام، بازار میں رکھی کوئی گری پڑی چیز؟ جسے جب جس کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر چھو لے۔ جس کی کوئی عزت کوئی وقار نہیں۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چلائے جا رہی تھی اور فاتح اپنے گال پر ہاتھ رکھے نا سمجھنے والے انداز میں اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔

"نہیں! زینا افتخار کوئی گری پڑی چیز نہیں ہے۔ سمجھے آپ زینا افتخار بازار میں رکھی کوئی چیز نہیں

ہے۔" وہ بھاگتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

فاتح نا جانے کتنی دیر تک حیرت بھرے انداز میں کچن کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور جب اس کی حیرت ٹوٹی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا بڑا الزام اس کی ذات پر لگا گئی ہے اور یہ احساس ہوتے ہی اس نے اپنے اندر ابال اٹھتا ہوا محسوس کیا تھا۔

فاتح کے دماغ میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ غصے اور شرمندگی کی لہر بہت شدید تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا زینا کے کمرے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ زینا سے پوچھنا چاہتا تھا۔ جواب مانگنا چاہتا تھا کہ کس بنیاد پر اس پر انگلی اٹھائی گئی تھی کس جرم کی پاداش میں اس کی ذات کی دھجیاں بکھیری گئیں —— کیا اس کا ہاتھ پکڑنا اتنا بڑا جرم ہو گیا تھا کہ وہ اسے نیچ لوگوں کی فہرست میں شامل کر گئی تھی کیا صرف وہ ہی عزت والی ہے اور فاتح مصطفیٰ گرا پڑا ہے۔ لیکن دروازہ کھولنے کے لیے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

وجہ زینا کی بلند ہچکیاں تھیں۔ وہ بہت بری طرح رو رہی تھی۔ بلکہ شاید تڑپ رہی تھی جیسے بہت تکلیف میں ہو جیسے کوئی انسان اپنی بہت پیاری چیز کھونے پر روتا ہے یا اپنے کسی بہت ہی پیارے کے مرنے پر۔

نا جانے کیوں فاتح کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ جو اس سے اپنی ذات پر اچھالے جانے والے کیچڑ کی وجہ پوچھنے آیا تھا اب نڈھال قدموں سے پلٹنے لگا لیکن اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ رات کے اس پہر گاڑی لے کر باہر سڑکوں پر نکل آیا۔

وہ باہر آ تو گیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ وہ باہر کیوں آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زینا کی سسکیاں اس سے کیوں برداشت نہیں ہوئیں۔ اس نے اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے کیوں محسوس کیے۔ وہ تو اس سے اپنی بے عزتی کا جواب مانگنے گیا تھا پھر واپس کیوں لوٹ آیا۔ کیوں وہ اس کے کمرے میں نہ گیا۔ کیوں اسے جھنجھوڑ کر اپنی بے عزتی کا جواب نہ مانگا۔

وہ رو رہی تھی تو فاتح کو تکلیف کیوں ہو رہی تھی؟ کیا اس کا دل زینا سے ایک انوکھا رشتہ جوڑ چکا ہے؟ اور اسے خبر بھی نہیں۔ فاتح نے اچانک بریک لگائی۔ یہ خیال جو ابھی اس پر ظاہر ہوا تھا بہت خوش کن تھا۔ کیا وہ زینا سے محبت کرنے لگا ہے؟ یہ سوال فاتح کی رگوں میں مسرت کی لہر دوڑا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن کے بعد سے زینی کا ایاز سے سامنا کم ہی ہوا تھا۔ ہر بار سامنا ہونے پر ایاز زینی سے کترا کر گزر جاتا۔ اس کے اس انداز پر زینی سمجھی کہ وہ اپنی اس دن کی حرکت پر شرمندہ ہے زینی نے سکون کا سانس لیا تھا اور اپنے آپ کو روزمرہ کے معمولات میں مصروف کر کے اس دن کے واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی۔

اب بھی وہ کچن کی تفصیلی صفائی کرنے میں مصروف تھی کہ اسے عجیب سا احساس ہوا اس نے چونک کر کچن کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں ایاز کو ایستادہ پایا اس کی گہری نظریں زینی کے سراپے پر جمی تھیں زینی کو جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں وہ بے اختیار سیدھی کھڑی ہو گئی۔

ایاز اسے سابقہ انداز میں دیکھتے ہوئے دو قدم آگے آیا تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہوئی۔

زینی کی اس حرکت کو دیکھ کر وہ وہیں رک گیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اس وقت ایاز کو سامنے دیکھ کر زینی کے دماغ میں اس دن والا واقعہ پھر تازہ ہو گیا اس کے دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

ایاز نے گہری نظروں سے اس کے یہ گھبرائے گھبرائے انداز دیکھے۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا؟" ایاز کے اچانک پوچھنے پر وہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"ک ـــ کس ـــ بارے میں؟" زینی کے منہ سے لفظ ٹوٹ کر برآمد ہوئے تھے۔

"میری خواہش کے بارے میں؟ اس دن اظہار کیا تھا نا میں نے تم سے اپنی خواہش کا۔" ایاز بے رحم لہجے

میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ زینی بے ساختہ سسک اٹھی۔

"ایاز تمہیں کیا ہو گیا ہے تم پہلے تو ایسے نہ تھے۔"

"میں ہمیشہ ہی سے ایسا تھا بس صحیح وقت کا انتظار کر رہا تھا۔" زینی کے آنسو بھرے چہرے کو اپنی نظروں میں رکھتے ہوئے اس نے سفاکی سے جواب دیا۔

"ایاز! کچھ عرصے بعد تو ویسے بھی ہماری شادی ہونے والی ہے۔ تم....."

"میں شادی تک انتظار نہیں کر سکتا۔" ایاز نے تیزی سے اس کی بات کاٹی "میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں تمہیں میری خواہش کا احترام کرنا ہو گا۔"

"میں..... میں یہ نہیں کر سکتی۔" زینی بچوں کی طرح بلکنے لگی۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر مجھ سے دست بردار ہو جاؤ۔"

"ایاز.....!" اس کی آواز میں حیرت تھی، التجا تھی "ایسے مت کہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"تو پھر میری بات مان لو۔ آج رات تک کا ٹائم ہے تمہارے پاس رات سب کے سونے کے بعد تم میرے کمرے میں آؤ گی۔ اگر تم میرے کمرے میں آ گئیں تو ایک خوب صورت شادی شدہ، محبت بھری زندگی تمہاری منتظر ہو گی۔ اور اگر تم نہیں آئیں تو....." اس نے ٹھہر کر ایک نظر ساکت کھڑی زینی پر ڈالی۔

"تو پھر بھول جانا کہ ایاز کبھی تمہاری زندگی میں تھا۔" بے رحم لہجے میں اپنی بات ختم کر کے وہ پلٹ گیا اور زینی ساکت وجود لیے وہیں کھڑی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

جب فاتح گھر واپس لوٹا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے گھر سے نکلتے وقت وہ بہت بے چین اور بے قرار تھا لیکن اس وقت جیسے اس کے بے چین دل کو قرار آ گیا تھا۔ ایک عجیب سی خوشی اور سرمستی اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ جب اس نے زینا کو پہلی بار دیکھا تھا تو اس کے اندر کچھ کلک ضرور ہوا تھا لیکن آگہی کا یہ پل جو آج اسے ملا تھا وہ بے حد حسین تھا دل اچانک سے بالکل شانت ہو گیا تھا جو سکون اور خوشی اسے ملی تھی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اگر اس وقت کوئی اسے دیکھ لیتا تو ضرور جان جاتا کہ فاتح کے ساتھ کچھ خاص ہوا ہے۔ زینا کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ٹھہر گیا۔

"زینا بی بی! آج تم نے اچھا نہیں کیا اچھی بھلی پر سکون زندگی میں یہ کیا ہلچل مچا دی تم نے؟" اس کے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ زینا کے تصور سے لڑنے لگا پھر اپنی اس بچکانہ حرکت پر خود ہی ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ اوندھے منہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔

تمہارے ماضی میں تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے جس کی دھند میں آج تمہیں میری نیت کی سچائی نظر نہ آئی اب تو تمہارا ماضی جاننا میرے لیے اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن میرا وعدہ ہے تم سے زینا افتخار کہ اپنے بارے میں سب کچھ تم خود مجھے بتاؤ گی۔

فاتح کی نیند سے بوجھل آنکھیں بند تھیں۔ لیکن ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

زینی بے چین روح کی طرح اپنے کمرے میں ادھر ادھر منڈلا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ شدت ضبط کے مارے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر آنے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن وہ ان آنسوؤں کو باہر آنے کا راستہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک بار رو دیتی تو اپنا ضبط کھو بیٹھتی پھر اپنی ماں کو ان آنسوؤں کی کیا وجہ بتاتی۔

سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ ایاز کا تقاضا تو وہ کسی صورت میں بھی پورا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ اس کے بس میں ہی نہیں تھا وہ اپنی فطرت کے خلاف نہیں جا سکتی تھی۔ اپنی

زندگی کو وہ پچھتاوؤں اور شرمندگی کی نذر نہیں کر سکتی تھی۔

بالفرض اگر وہ ایسا کر بھی لیتی ہے تو کس منہ سے اپنی ماں کا سامنا کرے گی۔ کس منہ سے اپنی آئندہ نسل کا سامنا کرے گی اور خود ایاز کا ہی سامنا کیا وہ کر پائے گی۔ اپنی انا اور خودداری کو کچل کر اپنے نسوانی غرور کو کھو کر کیا وہ زندہ بھی رہ پائے گی۔

"نہیں! میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی پھر میں کیا کروں" اس نے رک کر اپنے آپ سے سوال کیا۔

"کیا سب کچھ امی کو بتا دوں؟ نہیں یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے خود ہی اپنے خیال کو رد کیا۔

"اگر میں نے امی کو بتا دیا تو کیا عزت رہ جائے گی امی کی نظروں میں ایاز کی کیا مجھے اک اور بار ایاز سے بات کرنی چاہیے۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"لیکن وہ تو کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے اپنے دوسرے خیال کو بھی رد کر دیا اور پھر سے کمرے میں چکر لگانے لگی۔

"کیا میں ایاز کے بغیر رہ سکتی ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"نہیں میں اس کے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔ اس کے بغیر تو زندگی کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

"لیکن میں ایسا سوچ ہی کیوں رہی ہوں کہ ایاز مجھے چھوڑ دے گا۔" اچانک یہ خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ایک بار پھر رک گئی۔

"یہ سب کرنا اس کے لیے اتنا آسان نہیں شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی ہے۔ کارڈ چھپنے کے لیے جا چکے ہیں۔ سارے خاندان کو پتا چل چکا ہے ہماری شادی کے بارے میں۔"

اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے کی تازگی لوٹ آئی۔ "میں فضول میں ہی اتنا ڈر رہی تھی ایاز ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔" یہ فیصلہ کرتے ہی کہ وہ ایاز کی بات نہیں مانے گی وہ بالکل ہلکی پھلکی ہو گئی اور کمرے سے باہر آ کر معمول کے کام ختم کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی ٹیبل پر فاتح نے بغور زینا کا جائزہ لیا تھا اس کے چہرے پر رات کے واقعہ کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ بے حد نارمل انداز میں ناشتا کرنے میں مصروف تھی۔ وہ فاتح کی موجودگی کو اس طرح نظر انداز کر رہی تھی جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔ وہ خوش گوار انداز میں شائستہ کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہی تھی۔ ناشتا ختم کر کے وہ گھڑی دیکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"اوکے پھپھو! میں چلتی ہوں۔"

"فاتح! تم نے اب تک ناشتا نہیں کیا اب زینا اکیلے جائے گی کیا؟" وہ فاتح کو گھورنے لگیں۔

"اٹس اوکے پھپھو! میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" زینا نے فوراً منع کر دیا اور ویسے بھی فاتح کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔

"ڈرائیور کے ساتھ کیوں جاؤ گی جب فاتح بھی آفس جا رہا ہے۔" وہ پیار بھری خفگی سے اسے ڈانٹنے لگیں۔

"مما! مجھے ابھی ٹائم لگے گا اگر یہ میرے ساتھ جائیں گی تو انہیں یونیورسٹی سے دیر ہو جائے گی۔" اس نے مصروف سے انداز میں سلائس پر جیم لگاتے ہوئے کہا تو شائستہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"میں چلتی ہوں پھپھو! اللہ حافظ۔" زینا تیزی سے ڈائننگ روم سے باہر نکل گئی۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" شائستہ نے اچنبھے سے اپنے وجیہہ بیٹے کو دیکھا۔

"مما! آپ دیکھ تو رہی تھیں وہ میرے ساتھ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے تھے۔

☼ ☼ ☼

"امی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ایاز نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر کہا تو الیاس اور ساجدہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

ایاز کی آنکھیں بے تحاشا سرخ تھیں، بال بکھرے

ہوئے تھے اور نقوش تنے ہوئے تھے۔

"ایاز! میرے بچے! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" ساجدہ فکر مند لہجے میں کہتے ہوئے اس کے نزدیک آئیں۔

"ٹھیک ہوں میں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔" اس نے جھلا کر ساجدہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ جھٹکے۔

"ایاز! بات کیا ہے؟ یہ کس انداز میں تم اپنی ماں سے بات کر رہے ہو؟" الیاس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ابو! مجھے آپ دونوں سے ضروری بات کرنی ہے۔ بلکہ ضروری فیصلہ سنانا ہے۔" اس کے تیز لہجے میں انتقامی جذبے کی بو محسوس کر کے ساجدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ایسی کیا بات ہو گئی ہے ایاز! جس نے تیری یہ حالت بنا دی ہے۔"

"اسے بیٹھنے بھی دے گی یا وہیں دروازہ میں روک کر پوچھ گچھ کرتی رہے گی۔" اب کے الیاس نے اپنی بیوی کو ٹوکا اور ایاز کو اندر آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد ساجدہ اور الیاس بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہاں! اب بولو۔ کیا ضروری بات کرنی ہے تم نے؟" ساجدہ نے کہا۔

"امی! ابو!" اس نے باری باری دونوں کو دیکھا "میں زینی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیا؟" ساجدہ کو لگا انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"کیا کہا تم نے ابھی؟"

"میں نے کہا۔ میں زینی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو ساجدہ غصے میں کھڑی ہو گئیں۔

"دماغ چل گیا ہے کیا تیرا؟ یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟"

"کیوں؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے جو آپ مجھ پر اتنا چلا رہی ہیں؟" ساجدہ کی نسبت الیاس پر سکون بیٹھے تھے اور بغور ایاز کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔

"شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ تو شادی نہیں کرنا چاہتا۔ جبکہ یہ شادی تیری اپنی مرضی سے طے ہوئی ہے۔ کسی نے تیرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔" ساجدہ ہاتھ نچا نچا کر بولیں تو ایاز جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"میری مرضی سے ہی طے ہوئی تھی نا تو میں اب اپنی مرضی سے ہی ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ساجدہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا تو الیاس بولے۔

"اگر یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تو تو بھی زبردستی مت کر۔ میں تو پہلے ہی اس رشتے کے خلاف تھا۔ اب لگتا ہے کہ اسے بھی عقل آگئی ہے۔ ارے اس لڑکی کے پاس بے تحاشا حسن کے علاوہ اور ہے کیا خوب صورتی کا اچار ڈالنا ہے کیا تمہیں؟"

"لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو۔" شوہر کی حمایت کرنے پر ساجدہ کا جوش بھی سرد پڑ گیا۔

"کیا اتنی وجہ کافی نہیں کہ میں اسے اپنی بیوی بنانے کے قابل نہیں سمجھتا کہہ دیجیے گا اپنی بہن سے کہ اس کی بیٹی کا کردار اس قابل نہیں کہ کوئی عزت دار مرد اس سے شادی کرے۔" ساجدہ سوچتی ہوئی نظروں سے ایاز کو دیکھنے لگیں۔

"اور ہاں! بہت ساتھ دے دیا آپ نے ان لوگوں کا یتیموں کو آسرا دے کر جتنا ثواب کمانا تھا آپ نے کما لیا۔ اب چلتا کریں انہیں یہاں سے ہم نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ کمرے سے نکل گیا تو الیاس نے بھی اس بات پر زور دیا۔

"صحیح کہہ رہا ہے وہ کہہ دو ان لوگوں سے کہ اب کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈیں اور وہ کون سی تمہاری سگی بہن ہے۔ جس کے لیے تمہارے دل میں اتنا درد اٹھ رہا ہے۔"

"یہ باپ بیٹے تو میری سمجھ سے باہر ہیں۔" جھلا کر کہتے ہوئے ساجدہ بھی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

فاتح جھلا کر ہارن پہ ہارن دیے جا رہا تھا۔ ٹریفک بہت بری طرح جام تھا۔ گاڑیاں رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس کا پورا دن آفس میں کام کرتے ہوئے گزرا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اب یہ ٹریفک اس کی تھکن میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے تھک کر سیٹ سے ٹیک لگالی اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اچانک اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے بے اختیار اپنے دائیں طرف دیکھا۔ ایک بہت ہی خوب صورت مسجد تھی جس میں عشاء کی اذان دی جا رہی تھی۔ فاتح کے تصور میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے زینا کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ زینا کے چہرے کی پاکیزگی اس کے تصور میں اب بھی تازہ تھی۔ اس کے چہرے پر اک خوب صورت مسکراہٹ آگئی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس نے اپنی گاڑی مسجد کی دیوار کے نزدیک پارک کی اور کیسے وہ مسجد کے اندر داخل ہوا۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی انجانی قوت اس سے یہ سب کروا رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ تخت پر بیٹھی پان لگا رہی تھیں جب نسرین ان کے نزدیک چلی آئیں۔

"ساجدہ! آج تو ہمیں بازار جانا ہے۔ تم اب تک تیار نہیں ہوئیں؟" ساجدہ نے رک کر اک نظر نسرین کی طرف دیکھا پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

نسرین ان کی اس بے نیازی پر حیران رہ گئیں۔

"ساجدہ! میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔"

"کیا کرنا ہے بازار جا کر؟ فضول میں وقت اور پیسے برباد کرو گی۔" ساجدہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو نسرین ان کے ان بدلے تیوروں کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"زینی کی شادی میں اتنا کم وقت رہ گیا ہے ابھی اتنی خریداری باقی ہے اور تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"بس بی بی! رہنے دو یہ سب تمہاری بیٹی جیسی لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔" تخت سے اتر کر ساجدہ ہاتھ نچا نچا کر بولیں تو نسرین حق دق انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔

اسی پل زینی گھر میں داخل ہوئی تھی۔

"یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو ساجدہ؟" نا چاہتے ہوئے بھی نسرین کی آواز بلند ہوئی تھی۔

"بھئی صاف بات ہے۔ میں تو پہلے ہی نہیں چاہتی تھی اس لڑکی کو بہو بنانا۔ وہ تو ایاز کی ضد کے آگے میں ہار مان گئی۔ لیکن اب وہ اس لڑکی پر دو حرف بھیج رہا ہے۔" ساجدہ تمسخرانہ لہجے میں بولیں تو انہیں لگا۔ جیسے ان کے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔

"لیکن کیوں؟" صدمے سے لرزتی آواز میں انہوں نے پوچھا۔

"آگئی ہے تمہاری بیٹی کالج سے اسی سے پوچھ لو کہ کیا گل کھلانے جاتی ہے وہاں یہ ہی جانتی ہو گی وجہ روز بن ٹھن کر جاتی ہے کچھ تو بات ضرور ہے۔" ساجدہ نے حقارت سے زینی کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔

"ساجدہ تم زینی کے بارے میں کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"ویسی ہی باتیں کر رہی ہوں جیسی مجھے کرنی چاہئیں۔ ایاز نے صاف کہا ہے کہ اسے زینی کے کردار پر شک ہے اور بد کردار لڑکی سے وہ شادی نہیں کر سکتا۔ ارے مرد ذات ہے باہر گھومتا ہے کچھ تو دیکھا ہی ہو گا اس نے اس لڑکی میں ایسا اور آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے بھلا۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ میرے بیٹے کی شادی کسی ایسی ویسی لڑکی سے ہو جائے۔" ساجدہ ہاتھ ہلا ہلا کر زینی کے کردار کی دھجیاں بکھیر رہی تھیں۔

نسرین نے زینی کا چہرہ دیکھا جو لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

وہ تیزی سے ساجدہ کے قریب گئیں اور التجائیہ لہجہ میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"ضرور ایاز کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی ساجدہ زینی

تمہاری نظروں کے سامنے بڑی ہوئی ہے کیا تم نے اس میں کوئی غلط بات دیکھی ہے۔" نا چاہتے ہوئے بھی ان کے آنسو بہنے لگے۔

"ارے مجھے کیا معلوم تھا کہ اس بھولے چہرے والے نقاب کے پیچھے اس کا اصلی چہرہ کتنا غلیظ ہے۔"

"میری بیٹی پر غلط بہتان لگانے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے ساجدہ۔" نسرین بری طرح روتے ہوئے بول رہی تھیں۔ "میری بیٹی بہت شفاف کردار کی مالک ہے اس کی پاکبازی پر مجھے کوئی شک نہیں۔"

"تمہاری پاکباز بیٹی تمہیں ہی مبارک ہو ہم یہ گند نہیں سمیٹ سکتے۔" وہ حقارت سے بولیں تو نسرین چیخ پڑیں۔

"ساجدہ!"

"بس بس زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں اک بات اور سن لو۔ ایاز اور اس کے ابو دونوں چاہتے ہیں کہ تم اس لڑکی کو لے کر جہاں جانا چاہو چلی جاؤ اب ہم مزید تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکتے اس گرے ہوئے کردار کی لڑکی کی وجہ سے ہماری برسوں کی کمائی ہوئی عزت پر حرف آسکتا ہے۔" ساجدہ بے حسی سے کہتی ہوئی تن فن کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ نسرین لرزتے وجود کے ساتھ ساجدہ کو دیکھ رہی تھیں کہ دھڑام کی آواز پر مڑ کر دیکھا تو بے ہوش پڑی زینی کو دیکھ کر ان کی چیخ نکل گئی۔

☼ ☼ ☼
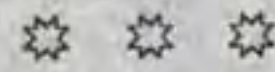
زینی ہوش میں آچکی تھی آنکھیں بند کیے ساکت وجود کے ساتھ وہ نسرین کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اس کے احساسات اس وقت برف سے بھی زیادہ سرد تھے۔ اتنے سرد کہ مسلسل اس کے بالوں میں نسرین کے گم ہوتے آنسو بھی انہیں پگھلا نہ پائے۔

"زینی! تو کچھ بولتی کیوں نہیں؟ اتنی خاموش کیوں ہے؟ میں جانتی ہوں ایاز کو غلط فہمی ہوئی ہے تو ڈر مت پریشان مت ہو تیری شادی ضرور ہوگی۔" نسرین اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے بولنے کے لیے اکسا رہی تھیں۔

"امی!" زینی نے کرب سے نسرین کو پکارا۔

"ہاں! بیٹا بول۔" نسرین کے چہرے پر رونق آگئی اس نے چپ کا روزہ تو توڑا۔

"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ زینی نے اپنی آنکھیں کھول کر نسرین کا تھکا تھکا چہرہ دیکھا۔

نسرین نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"امی! کچھ دن پہلے ایاز نے مجھ سے ۔۔۔" وہ دھیرے دھیرے ساری بات نسرین کو بتانے لگی جیسے جیسے وہ بولتی جارہی تھی ویسے ویسے نسرین کے چہرے کا رنگ بدلتا جارہا تھا۔

اپنی بات ختم کر کے زینی بلک بلک کر رونے لگی تو نسرین نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

"مجھے تجھ پر فخر ہے زینی! مجھے تجھ پر فخر ہے کھوٹ تجھ میں نہیں کھوٹ تو اس کے اپنے کردار میں ہے تو رومت میری بچی اب تو میں خود بھی نہیں چاہتی کہ یہ شادی ہو۔"

"ہم کل خود ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"ہم کہاں جائیں گے امی؟" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تمہاری پھپھو کے گھر وہ یہیں رہتی ہیں کراچی میں میں ان سے کبھی ملی نہیں کوئی تعلق نہیں رکھا یہ سوچ کر کہ ساجدہ میری بہن ہے ماں جائی نہ سہی لیکن باپ تو ہمارا ایک ہی تھا۔" وہ بے اختیار سسک اٹھیں۔

"لیکن سوتیلا آخر سوتیلا ہوتا ہے ایک نہ ایک دن اپنا رنگ دکھا دیتا ہے۔" ایاز نے اپنے کردار کی گندگی کو چھپانے کے لیے تجھے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ تو نے اس کا تقاضا نہ پورا کر کے اسے ذلیل کیا۔ جس کا بدلا وہ یہ شادی توڑ کر لے رہا ہے جو بھی یہ شادی ٹوٹنے کی وجہ پوچھے گا تو یہ لوگ تیرے ہی کردار کو نشانہ بنا لیں گے اس سے پہلے کہ لوگ تجھ پر انگلیاں اٹھائیں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

وہ پرسوچ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ زینی نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔ ان کے چہرے پر بے انتہا کرب تھا۔ آنے والے وقت کی خوفناک پرچھائیاں ان کے چہرے پر صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔

نسرین نے چونک کر زینی کا چہرہ دیکھا پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

"زینی! سو جاؤ پھر صبح اٹھ کر یہاں سے جانے کی تیاری بھی کرنا ہے نا۔" وہ بھی اس کے ساتھ ہی لیٹ گئیں۔

زینی نے لیٹے لیٹے ترچھی نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ نسرین آنکھیں بند کیے شاید سونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن نا جانے کیوں زینی آج رات سونا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

زینا بے زاری سے ٹیبل پر رکھی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ کہاں چلی گئی؟ یہیں تو رکھی تھی۔ تیسری بار بھی پوری ٹیبل الٹ پلٹ کرنے کے باوجود بھی اسے اپنی مطلوبہ کتاب نہ ملی تو وہ جھلا کر نسیم کو پکارنے لگی۔

"نسیم ۔۔۔۔ نسیم!"

"جی زینا بی بی!" نسیم بوتل کے جن کی طرح فوراً ہی حاضر ہو گئی۔

"شام کو میں یہاں ایک کتاب بھول گئی تھی جواب نہیں ہے۔" اس نے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

"یہیں ہوگی زینا بی بی! یہاں سے کہاں جائے گی۔" وہ بھی میگزینز کے ڈھیر میں اس کی کتاب ڈھونڈنے لگی۔ لیکن کچھ پل کے بعد بولی۔

"زینا بی بی! یہاں تو کوئی کتاب نہیں ہے۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ تم مجھے بتا سکو کہ اب میری کتاب کہاں ہے۔" زینا بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"کچھ دیر پہلے فائح صاحب کی فائلیں بھی یہاں رکھی تھیں انہیں وہ تو غلطی سے اپنی فائلوں کے ساتھ آپ کی کتاب نہیں لے گئے۔" اچانک یاد آنے پر وہ جلدی جلدی بولی تھی۔

اسی پل فاتح لاؤنج میں بولتے بولتے داخل ہوا۔
"نسیم! یہ کتاب ــــ" زینا پر نظر پڑنے پر اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی۔ زینا نے اک نظر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو۔
"یہ کتاب غلطی سے فائلوں سمیت میرے کمرے میں آگئی تھی۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ کتاب کو ٹیبل پر رکھ کر واپس پلٹ گیا۔
زینا نے بغور اس کے اس سنجیدہ انداز کو دیکھا تھا زینا نے مشاہدہ کیا تھا کہ اس دن کے بعد سے فاتح بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنکھ کھلتے ہی زینی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ماں کو دیکھنے لگی وہ پرسکون حالت میں سو رہی تھیں۔ زینی نے گھڑی دیکھی جو صبح کے سات بجا رہی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باہر آئی تو نسرین کو اسی طرح سوتے پایا۔
"امی! اٹھ جائیں صبح ہو گئی ہے۔" نسرین کو پکارتے ہوئے وہ الماری کی طرف بڑھ گئی اور اپنے کپڑے نکالنے لگی۔
پھر چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگی پہلی پکار میں اٹھ جانے والی نسرین اب تک سو رہی تھیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر چارپائی کے نزدیک آگئی۔
"امی!" دھیرے سے پکارا۔
جواب نہ پا کر فکر مندی سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔
"کہیں بیمار تو نہیں ہو گئیں۔" اس نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو دنگ رہ گئی ماتھا بے حد سرد ہو رہا تھا۔
وہ بے اختیار نسرین کا کندھا ہلا کر انہیں پکارنے لگی۔
"امی! امی! اٹھیں نا آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں۔" اب وہ نسرین کو جھنجوڑ رہی تھی۔ لیکن نسرین گہری نیند سو چکی تھیں کبھی نہ جاگنے کے لیے۔
اب وہ زور زور سے روتے ہوئے نسرین کو پکار رہی تھی۔
"آنکھیں کھولیں امی! جواب دیں میری بات کا آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟" وہ رک کر ساکت لیٹی نسرین کو دیکھنے لگی اور دوسرے پل اس کی فلک شگاف چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔
اس کی چیخوں کی آواز سن کر الیاس، ساجدہ اور ایاز بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ نسرین کے ساکت وجود پر گری چیختی چلاتی زینی کو دیکھ کر تینوں اپنی جگہ گنگ سے کھڑے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج ڈنر پر شائستہ بھی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں۔ زینا نے انہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تو وہ مسکرانے لگیں۔
"میں تو آج موجود ہوں لیکن یہ فاتح کہاں غائب ہے؟" انہوں نے زینا سے پوچھا تو اس نے کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر وہ ٹیبل پر کھانا چنتے نوعمر ملازم شاکر سے پوچھنے لگیں۔
"بی بی جی! وہ تو شاید نماز پڑھنے گئے ہیں۔" وہ انہیں جواب دے کر چلا گیا شائستہ مسکرانے لگیں۔
"بہت اچھی عادت اپنالی ہے فاتح نے کہیں تم نے تو مجبور نہیں کر دیا اسے نماز پڑھنے پر؟"
"پھپھو! کسی کو نماز پڑھنے کی طرف راغب کرنا تو بڑی سعادت کی بات ہے۔ لیکن افسوس یہ سعادت مجھے نصیب نہیں ہوئی۔" وہ انکساری سے مسکرا کر بولی تو شائستہ اس کے اس انداز پر ہنس پڑیں۔
"چلو اب کھانا شروع کرو بہت باتیں کر لیں۔ انہوں نے اپنی ہنسی روک کر اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔
وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ میں چاول نکالنے لگی۔ وہ لاعلم تھی اس بات سے کہ فاتح کو نماز کی طرف راغب کرنے کی سعادت اسے ہی نصیب ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ کا گھر اس وقت ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ آس پڑوس اور رشتہ دار خواتین ساجدہ کے گھر میں جمع تھیں نسرین کی تدفین کی جا چکی تھی۔ زینی ایک کونے میں

ڈری سہمی دبکی ہوئی تھی۔ نسرین کو رخصت کرتے وقت زینی ایسے تڑپ کر روئی تھی کہ اسے دیکھنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی اور اب بھی اس کی حالت دیکھ کر دیکھنے والوں کے دل تڑپ رہے تھے۔
ساجدہ بھی سب کچھ بھلا کر اس کی دل جوئی کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ بار بار اسے سینے سے لگا کر تھپکیاں دے کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن اسے تو اب ہر شخص دشمن نظر آرہا تھا اور خاص طور پر ساجدہ خالہ انہیں کی وجہ سے تو اس کی ماں کی موت ہوئی تھی۔
زینی نے نفرت سے ساجدہ کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔
"میں نہیں رہوں گی یہاں میں چلی جاؤں گی پھپھو کے پاس۔ ان کا ایڈریس ڈھونڈ کر میں چلی جاؤں گی۔"
وہ ہسٹریائی انداز میں الماری کھول کر ایڈریس تلاش کرنے لگی بہت تلاش کرنے کے باوجود بھی جب اسے کچھ نہ ملا تو وہ زمین پر بیٹھ کر بچوں کی رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج نسرین کا سوئم تھا۔ عورتیں لاؤنج میں سپارے پڑھنے میں مصروف تھیں زینی بھی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔
اسی پل لاؤنج میں ساجدہ کے ساتھ ایک پروقار سی عورت داخل ہوئی زینی نے اک نظر اس انجان عورت کو دیکھا جو اپنے لباس سے ہی اس طبقے کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔
"زینی! یہ تمہاری پھپھو شائستہ مصطفیٰ ہیں۔" ساجدہ کے تعارف کرانے پر زینی بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔
آنے والی عورت نے محبت سے اپنی بانہیں پھیلائیں تو وہ بھاگتے ہوئے ان کے سینے سے جا لگی۔
"پھپھو! امی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔" اپنی پھپھو کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا یہ خیال دور ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں اب اس کا کوئی نہیں۔
"چپ ہو جاؤ میری جان! بس چپ ہو جاؤ۔ اب میں آگئی ہوں نا۔" شائستہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ پیار سے اس کے بال سہلا رہی تھیں۔
"بھائی کے گزرنے کے بعد میں نے نسرین کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اس نے مجھے منع کر دیا میں اس پر زور بھی نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن اب میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتی میں اپنے بھائی کی اکلوتی نشانی کو یہاں رہنے نہیں دے سکتی۔" اس طرح وہ شائستہ کے ساتھ ان کے گھر چلی آئی۔ شائستہ اس کے تمام حالات سے واقف تھیں اور اسے سب کچھ بھول کر زندگی کی طرف بڑھنے کے لیے مجبور کرتی رہیں۔
وہ حیران ہوتی کہ اتنے بڑے گھر میں شائستہ اور نوکروں کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا لیکن پھپھو نے بتایا تھا کہ وہ بہت سالوں سے پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ میں مقیم ہے۔ لیکن اب اسے کسی بھی بات میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آج کل اپنی پڑھائی کے سلسلے میں بے حد مصروف تھی یونیورسٹی میں سیکنڈ سمسٹر ہونے والے تھے اور وہ بہت محنت سے تیاری کر رہی تھی۔
اب بھی وہ پڑھائی سے تھک کر چائے پینے کی غرض سے نیچے چلی آئی۔
"زینا!" لاؤنج کے پاس سے گزر رہی تھی جب شائستہ نے اسے پکارا۔
"جی پھپھو!"
"بیٹا! ذرا اندر آنا مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ زینا خاموشی سے ان کے نزدیک جا کر بیٹھ گئی۔

"زینا! تمہارے لیے اک پرپوزل آیا ہے۔" شائستہ نے اسے بتایا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ شائستہ نے اس کا دایاں گال تھپتھپایا۔

"تمہارا یونیورسٹی فیلو ہے شاہ میر۔" زینا کی نظروں میں ڈیسنٹ سا شاہ میر گھوم گیا۔

"پھپھو! شادی کرنا بہت ضروری ہے کیا؟" اس کے دھیمی آواز میں سوال کرنے پر شائستہ مسکرانے لگیں۔

"ہاں! شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ ساری زندگی اکیلے نہیں گزاری جاسکتی بیٹا۔ اک ہم سفر، اک زندگی کا ساتھی انسان کی فطری ضرورت ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھولنا مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں دنیا کے سارے لڑکے ایاز جیسے نہیں ہوتے۔" وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہی تھیں" تمہیں اس تلخ تجربے کو بھول کر زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے میری جان۔"

"اوکے پھپھو! میں سوچوں گی اس بارے میں۔" وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

"ضرور سوچو، شاہ میر اچھا لڑکا ہے۔ بیک گراؤنڈ بھی مضبوط ہے۔ لیکن اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور پرپوزل بھی موجود ہے۔" شائستہ کی بات پر زینا سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"فاتح اچھا لڑکا ہے زینا! اس کے بارے میں بھی ضرور سوچنا۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور اسے حیران چھوڑ کر لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھٹن کا احساس ہونے پر زینا لان میں نکل آئی۔ سارا لان چاند کی روشنی سے روشن تھا۔ مختلف پھولوں کی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ زینا نے گہرا سانس لے کر اس مہک کو اپنے اندر اتارا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں لان میں چہل قدمی کرنے لگی۔ تھوڑا سا آگے بڑھی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔

دائیں طرف بنی سنگی بینچ پر فاتح نیم دراز تھا فاتح کی نظر بھی اسی وقت زینا پر پڑی تو وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گیا۔

زینا نے کچھ پل ہی سوچنے میں لگائے پھر دھیرے دھیرے چل کر اس بینچ پر تھوڑے فاصلے سے بیٹھ گئی۔ بے شمار پل خاموشی کی نذر ہو گئے فاتح جانتا تھا کہ وہ بے مقصد اس کے پاس نہیں آئی ہے۔ ضرور کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کہنے کی ہمت نہیں کرپا رہی۔

"اس دن جو میں نے آپ کے ساتھ کیا۔ اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔" زینا نے بات کی شروعات کی "میں آپ کو سمجھ نہیں پائی تھی۔" وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس کر بولی اور سمجھ بھی کیسے پاتی ہر انسان کو ایک ہی نظر سے جو دیکھنے لگی تھی آپ کو کافی برا بھلا بول گئی کسی اور کے کیے کی سزا آپ کو دے گئی۔ میری غلطی آپ کو معافی کے قابل لگے تو پلیز مجھے معاف کر دیں۔" وہ بھولپن سے کہتی فاتح کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

"معاف تو کردوں گا لیکن اس کی ایک شرط ہے۔" فاتح کے مبہم انداز میں کہنے پر زینا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں مجھے یہ بتانا ہو گا کہ تم نے کس کے کیے کی سزا مجھے دی تھی۔" فاتح کی اس انوکھی فرمائش پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے اک گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ رخ پھیر کر وہ نیلے آسمان کے دامن میں چمکتے چاند کو دیکھنے لگی۔

فاتح اس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔

"یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ میرا بچپن باپ کے سائے کے بغیر گزرا۔" زینا نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ فاتح کو لگا جیسے وہ خود سے باتیں کر رہی ہو۔

"لیکن امی نے کبھی مجھے ابو کی کمی محسوس ہونے ہی نہیں دی۔ وہ بیک وقت میرے لیے ماں بھی تھیں اور باپ بھی میں نے اپنے نزدیک بہت کم رشتوں کو پایا تھا امی، خالہ، خالو اور ایاز یہ ہی لوگ میری کل کائنات تھے۔ خالا نے ہمیشہ امی کے جیسے ہی میرے لاڈ اٹھائے تھے۔ شاید وہ اپنی بیٹی نہ ہونے کی کمی کو پورا کرتی

تھیں۔ ایاز میرے بچپن کا ساتھی بچپن کی محبت۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ تلخ انداز میں ہنسی تھی چاند کو گھورتے گھورتے شاید وہ تھک گئی تھی۔ اس لیے نظروں کا زاویہ بدل کر چنبیلی کے پودے دیکھنے لگی جو بے شمار ادھ کھلی کلیوں سے بھرا پڑا تھا۔

"کہتے ہیں بچپن کی محبت بڑی انمول ہوتی ہے لیکن میرے لیے تو یہ کانٹوں بھرے ماضی کی حیثیت رکھتی ہے۔" زینا کے لہجے کا درد فاتح اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔

"ایاز کے وہ جذبے جو میرے لیے تھے میں انہیں محبت کا نام دیتی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو پتا چلتا ہے کہ محبت تو کہیں تھی ہی نہیں محبت کی آڑ میں وہ اپنے ناپاک جذبوں کی تسکین چاہتا تھا۔ جو میں نہ کر سکی۔" دو آنسو خاموشی سے پلکوں کی باڑ توڑ کر زینا کے گالوں پر پھسلے تھے۔

فاتح نے محبت سے اس سادہ لڑکی کو دیکھا۔ اس پل اسے فخر محسوس ہوا تھا کہ اسے جس لڑکی سے محبت ہوئی وہ ایسے مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ جس کی خواہش ہر مرد کرتا ہے۔

سب کچھ کہہ کر زینا اب پرسکون بیٹھی تھی اسے ایسا لگا جیسے اس نے اپنے اندر کی گھٹن سے چھٹکارا پالیا ہو۔ وہ اب کھل کر سانس لے پا رہی تھی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی جب فاتح کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"تم نے اپنے بارے میں سب کچھ کہہ دیا اب میرے بارے میں بھی سن لو۔" زینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے شمار ان کہے جذبے انگڑائی لے رہے تھے زینا نے گھبرا کر چہرہ جھکا لیا۔

"میں نے اپنی زندگی کا اک بڑا حصہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں گزارہ، اب تم اسے پاپا کے خون کی تاثیر کہو یا ممی کی تربیت کہ ایسی آزاد فضاؤں میں بھی میرے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ ہاں! حسن پرست میں ضرور ہوں اس لیے خوب صورت لڑکیوں سے دوستی بھی خوب رہی۔ لیکن صرف دوستی کی حد تک اسی لیے تو جب تمہیں دیکھا۔۔۔ تو کام ہو گیا۔" وہ ہنسنے لگا۔

اتنے کھلے ڈلے اظہار پر زینا کی ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔

"اور سونے پر سہاگہ تمہارا وہ تھپڑ۔" اس نے شرارتی نظروں سے زینا کے گھبرائے ہوئے روپ کو دیکھا۔

"زینا!" فاتح نے سرگوشی کے انداز میں اسے پکارا زینا نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور دوبارہ نظریں جھکا لیں اس کی اس حرکت پر فاتح کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ آئی تھی۔

"ممانے مجھ سے ایک سوال پوچھا ہے۔ شاید یہی سوال وہ تم سے بھی کر چکی ہیں۔ میں نے تو انہیں ہاں کہہ دیا ہے تم کیا کہو گی؟" فاتح کے شرارتی لہجے پر وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ نظر اٹھا کر فاتح کو دیکھا تو وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زینا کے لب مسکرا اٹھے۔

"اس کا جواب میں پھپھو کو ہی دوں گی۔" وہ بھی شرارت سے کہہ کر تیزی سے وہاں سے اٹھ گئی۔

فاتح نے بڑی محبت سے جاتی ہوئی زینا کو دیکھا تھا۔ اپنی بات کا جواب تو اسے مل ہی گیا تھا۔

☼ ☼

شعاع عمیر
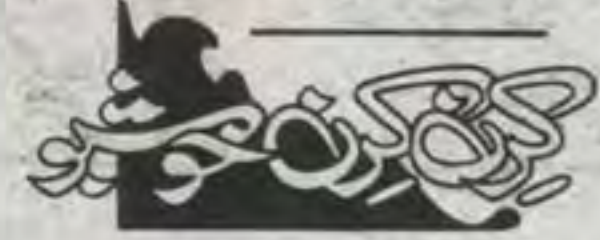
ایک جامع نصیحت

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس نے اپنے بھائی پر اس کی آبرو (برباد کرکے) یا کسی چیز کے ذریعے ظلم کیا ہو تو اسے چاہیے کہ آج ہی اس دن (قیامت) کے آنے سے پہلے پہلے اس سے معافی مانگ لے کہ اس دن نہ تو دینار کام آئے گا اور نہ ہی درہم۔ اگر کسی ظالم کے نیک عمل ہوں گے تو اس کے ظلم کے برابر مظلوم کو دے دیے جائیں گے اور اگر ظالم کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہ ظالم کے سر ڈال دیے جائیں گے۔"
(صحیح بخاری)

(صغریٰ یاسین۔۔۔ کراچی)

دانش روی

باہمی اختلاف جہالت کی وجہ ہے

چند ہندوستانی ایران میں نمائش کے لیے ایک ہاتھی لے گئے۔ اس ہاتھی کو ایک تاریک گھر میں داخل کیا گیا' تاکہ اسے کوئی بے چراغ نہ دیکھے۔ چار شوقین رات کو ہاتھی دیکھنے آئے' انہیں کہا گیا کہ یہ وقت دیکھنے کا نہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم ابھی دیکھیں گے باخدا دیکھ کر ٹلیں گے۔ ہمیں چراغ کی حاجت نہیں' جو مانگو لے لو' مگر ہاتھی ابھی دکھا دو۔ چنانچہ ان میں سے ایک ہاتھی کے قریب گیا' اس کا ہاتھ اس کے سونڈ سے جا لگا۔ وہ باہر آکر کہنے لگا۔ ہاتھی نلکے کی طرح گول' مخروط اور لمبا ہے۔ دوسرا اندر گیا' تو اس کا ہاتھ اس کی ٹانگوں پر پڑا' وہ بولا میں نے ہاتھی کو دیکھ لیا۔ ہاتھی ستون کی طرح ہے۔ تیسرے نے اس کے کانوں کو چھوا اور کہا کہ ہاتھی تو پنکھے اور چھاج کی طرح ہے' ہاں کچھ چوڑا اور نرم سا ہے۔ چوتھے کا ہاتھ اس کی پشت پر پڑا تو بولا کہ ہاتھی تو تخت کی مانند ہے۔ اگر ان کے ہاتھ میں شمع ہوتی تو ان میں اختلاف نہ ہوتا۔

دنیاداروں میں جو باہمی اختلاف ہے۔ وہ جہالت کی تاریکی کی وجہ سے ہے' اگر وہ نور علم سے مستفید ہوں تو نہ لڑیں' نہ جھگڑیں۔

حمیرہ مہتاب۔۔۔ سعودی عرب

محبت

ایک دفعہ ایک عورت کا بچہ گم ہو گیا۔ وہ اسے قافلے میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک ایک آدمی سے بچے کے بارے میں پوچھتی۔ بالآخر اس کا کھویا ہوا جگر گوشہ مل گیا۔ اس نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا' مگر اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ بار بار اس کا منہ دیکھتی اور خوب پیار کرتی۔ ہر شخص اس کی کیفیت سے متاثر ہو رہا تھا۔

عین اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟"

سب نے عرض کی۔ "نہیں یہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی کیونکہ اسے اپنے بیٹے سے بے پایاں محبت ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس سے کئی گنا زیادہ محبت ہے' وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے بندے دوزخ کی آگ میں جائیں۔"

طویل سے طویل تقریر بھی محبت الٰہی کے بارے میں وہ اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فقرے نے اس نفسیاتی ماحول میں پیدا کیا۔

نجمہ حفیظ۔۔۔ کورنگی' کراچی

محبت

کبھی کبھی زندگی اس قدر مشکل ہو جاتی ہے کہ جینے کا تصور بھی خوف زدہ کر دیتا ہے۔ کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ زندگی ایسے لوگوں سے جا ٹکراتی ہے' جو ہماری منزل نہیں بن سکتے۔ لیکن وہی لوگ آنکھوں میں اس طرح سما جاتے ہیں کہ ہم انہیں نکالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں۔

کبھی کبھی ہماری آنکھوں میں آنسو تو ہوتے ہیں۔ لیکن پونچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ درد تو ہوتا ہے۔ مگر دوا نہیں ہوتی۔ احساس تو ہوتا ہے۔ مگر محسوس کوئی نہیں کرپاتا اور سب سے بڑھ کے جس سے ہم محبت کرتے ہیں۔ جس کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ جس کی یادیں ہی ہمارا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اسے ہی ہماری محبت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ وہ ہمیں نہ ملا تو کیا ہے۔ خوشی تو اسی میں ہے کہ وہ جسے چاہے اسے حاصل ہو جائے۔ لیکن ہم اس کی خوشی کے لیے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور سب کچھ کھو دیتے ہیں سب کچھ۔۔۔

ارم رومان۔۔۔ عبدالحکیم

لینڈ اسکیپ

دور' سنسان سے ساحل کے قریب
ایک جواں پیڑ کے پاس
عمر کا درد لیے' وقت کی مٹیالی نشانی اوڑھے
بوڑھا سا پام کا ایک پیڑ کھڑا ہے کب سے
سینکڑوں سال کی تنہائی کے بعد
جھک کے کہتا ہے' جواں پیڑ سے۔۔۔ "یار
سرد سناٹا ہے!
تنہائی ہے!
کچھ بات کرو" (گلزار)

فاطمہ طارق۔۔۔ کراچی

روشن ستارے

☆ دنیا کی سب سے بڑی مسرت یہ ہے کہ آپ وہ کام کر دکھائیں جس کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں آپ نہیں کرپائیں گے۔
☆ آسمان پر نگاہ رکھو' لیکن یہ مت بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی رہیں گے۔
☆ فضول بحث بہترین دوست سے جدا کر دیتی ہے۔
☆ آپ جنت نہ مانگیں' بلکہ دنیا میں ایسے اچھے کام کریں کہ جنت آپ کو مانگے۔
☆ خاموشی بغیر تخت کے بادشاہی ہے۔
☆ تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو غریب مفلس لوگوں کو سلام کرو۔
☆ چہرے پڑھنا سب سے مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے۔
☆ مصیبت کی جڑ انسان کی گفتگو ہے۔
☆ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جا سکتا ہے۔

نوشین اقبال نوشی۔۔۔ گاؤں بدر مرجان

حلیم

لقمان حکیم فرماتے ہیں کہ تین شخص تین باتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ حلیم غصہ کے وقت' بہادر لڑائی کے وقت اور دوست حاجت کے وقت۔ ایک حلیم کے یہاں اس کا ایک دوست آیا اس نے ماحضر پیش کیا۔ حلیم کی بیوی بدمزاج تھی دسترخوان کو اٹھا لیا اور شوہر کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ مہمان غصہ سے اٹھ کر چلا گیا۔ حلیم اس کے پیچھے گیا اور اس سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے کہ ایک بار ہم تمہارے گھر کھانا کھا

رہے تھے اتنے میں ایک مرغی آئی اس نے دستر خوان پر رکھی چیزوں کو خراب کر دیا تھا۔ تب ہم میں سے کوئی شخص بھی غصہ ہوا تھا؟"
اس نے کہا "کوئی نہیں۔"
حلیم نے کہا "تو اب بھی ویسا ہی خیال کرو۔" وہ شخص ہنس پڑا خفگی جاتی رہی اور کہنے لگا۔
"حکماء کا قول درست ہے حلیم ہر درد کی ہر چوٹ کی دوا ہے۔"

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

اقوالِ اختری

☆ تھکن سود کی طرح ہوتی ہے' ادائیگی نہ ہو تو بے حساب بڑھتی اور جمع ہوتی رہتی ہے۔ جب تک کوئی بھلا آدمی بھلے طریقے سے بے باق نہ کروا دے۔
☆ فیصلہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے اندر غلطی کا امکان گھاس کی اس نرم کونپل کی طرح ضرور ہوتا ہے، جو کسی بھی جگہ' کسی بھی لمحے سر اٹھائے چپ چاپ لہرانے لگتا ہے۔
☆ ہمت بھی عجیب پھولے ہوئے غبارے جیسی ہوتی ہے۔ ذرا ناموافق بات کی سوئی چبھی' شکل ہی نہیں حالات و حالت تک بدل دیتی ہے۔
☆ "جعلی عکس ڈالنے والا علم ہو یا اعداد و شمار' ہمیشہ نتیجہ توقعات کے برعکس ہی لاتا ہے۔"
☆ نقصان وہ نہیں جو آپ کو ذاتی دکھ سے دوچار کردے نقصان تو وہ ہے، جو کسی کو آپ کی نظروں سے گرا دے۔
☆ رویوں میں اندھیرا آئے تو صرف انہیں کوسنے مت بیٹھ جائیے' ممکن ہے آپ کے ایک چراغ جلانے سے کسی کے اندر کی کچھ تاریکی کم ہو جائے۔
☆ جو دوسروں کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے وہ حقیقت میں اپنے کردار کی برائیاں دوسروں میں تلاش کر رہا ہوتا ہے۔

فرزانہ منصور۔۔۔ کراچی

سجدہ

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "اے انسان اگر تجھے یہ معلوم ہو جائے کہ سجدے کے دوران کتنی رحمتیں نازل ہوتی ہیں تو۔۔۔ تو کبھی سجدے سے سر نہ اٹھائے۔"

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

سکون

سکون حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ دینے کی فکر کرو تو سکون مل جائے گا اللہ کے فیصلوں پر تنقید نہ کرنا۔ سکون مل جائے گا۔ بے سکونی ناکام تمنا ہے۔ جب تمنا تابع فرمان الہٰی ہو جائے تو سکون شروع ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں آپ کو جو چیز سب سے اچھی نظر آتی ہے اسے تقسیم کرنا شروع کر دو سکون آجائے گا۔

نسرین حنان۔۔۔ کراچی

حرفِ تسلی

جان بہ لب ہیں' مگر اک حرفِ تسلی کے لیے
زندگی ہم تیری دہلیز پہ آ بیٹھے ہیں

صابرہ یاسین۔۔۔ کراچی

سوچ ریزے

☆ شہر' دکھ اور محبتیں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں' کبھی پرانے نہیں ہوتے ہمیشہ نئے ہی لگتے ہیں۔
☆ پھول' زخموں' یادوں' موسموں' رنگوں اور منظروں کو پرانا نہیں ہونے دیتے۔
☆ دیواریں صرف کمروں کی نہیں ہوتیں' دل کے گرد بھی ہوتی ہیں کئی خواب' کئی خیال' انہی میں قید رہ جاتے ہیں۔
☆ منفرد لوگوں کو ہمیشہ مار سہنی پڑتی ہے طعنوں کی یا تنہائی کی۔
☆ پتھروں سے واسطہ پڑے یا پتھر دلوں سے زندگی کا سفر رکتا نہیں۔
☆ ہر کوئی الفاظ کو اپنی سمجھ کے مطابق ڈھال لیتا ہے اس لیے ہر انسان کا نظریہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

بشریٰ محمود

شازیہ ہاشم میو، کی ڈائری میں تحریر
میر تقی میر کی غزل

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

امیدوار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یاروں قیامت کو کیا ہوا

کب تک تظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں
کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا

اس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم جوشِ اشک ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر کو
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی نظم

اس نے کہا تھا سن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے ٹوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
سمندر سمندر اپنی پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں اترو
میری تنہائی تمہیں آواز نہ دے گی
مگر جب
میری خواہش اور چاہت کی لے
اتنی اونچی اور اتنی تیز ہو جائے
کہ دل رو دے
تو۔ لوٹ آنا

صائمہ امتیاز ساہی، کی ڈائری میں تحریر
قتیل شفائی کی غزل

وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

رہے گا ساتھ ترا زندگی بن کر
یہ اور بات میری زندگی وفا نہ کرے

یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں
خدا کسی کو کسی سے مگر جدا نہ کرے

اگر وفا پہ بھروسا رہے نہ دنیا کو
تو کوئی شخص محبت کا حوصلہ نہ کرے

سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے

بجھا دیا ہے نصیبوں نے میرے پیار کا چاند
کوئی دیا میری پلکوں پہ اب جلا نہ کرے

زمانہ دیکھ چکا ہے پرکھ چکا ہے اسے
قتیل جان سے جائے پر التجا نہ کرے

رابعہ، کی ڈائری میں تحریر

ریاض مجید کی غزل

جب اگلے سال یہی وقت آرہا ہوگا
یہ کون جانتا ہے، کون کس جگہ ہوگا

تو میرے سامنے بیٹھا ہے اور میں سوچتا ہوں
کہ آنے لمحوں میں جینا بھی اک سزا ہوگا

یہی دمکتے ہوئے پل دھواں دھواں ہوں گے
یہی چمکتا ہوا دن بجھا بجھا ہوگا

لہو رلائے گا وہ دھوپ چھاؤں کا منظر
نظر اٹھاؤں گا جس سمت جھٹپٹا ہوگا

یہی جگہ جہاں آج ہم مل کے بیٹھے ہیں
اس جگہ پر خدا جانے کل کو کیا ہوگا

بچھڑنے والے تجھے دیکھ دیکھ سوچتا ہوں
تو پھر ملے گا تو کتنا بدل چکا ہوگا

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر

فرحت عباس شاہ کی نظم

محبت کی ادھوری نظم

آ کسی شام کسی یاد کی دہلیز پہ آ
عمر گزری تجھے دیکھے ہوئے بہلائے ہوئے
یاد ہے...؟
ہم تجھے دل مانتے تھے
اپنے سینے میں مچلتا ہوا ضدی بچہ
تیرے ہر ناز کو انگلی سے پکڑ کر اکثر
نت نئے خواب کے بازار میں لے آتے تھے
تیرے ہر نخرے کی فرمائش پر
ایک جیون کہ تمناؤں کی بینائی سے
ہم دیکھتے تھکتے ہی نہ تھے، سوچتے تھے
ایک چھوٹا سا نیا گھر
نیا ماحول
محبت کی فضا
ہم دونوں
اور کبھی [illegible] پلکوں سے لڑائی اپنی
پھر لڑائی میں کبھی ہنستے ہوئے رو پڑنا
اور کبھی روتے روتے ہنس پڑنا
اور تھک ہار کے گر پڑنے کا معصوم خوش بخت خیال
یاد ہے...؟
ہم تجھے سکھ جانتے تھے
رات ہنس پڑتی تھی بے ساختہ درشن سے تیرے
دن تیری دوری سے رو پڑتا تھا
یاد ہے...؟
ہم تجھے جاں کہتے تھے
تیری خاموشی سے ہم مر جاتے
تیری آواز سے جی اٹھتے تھے
تجھ کو چھو لینے سے اک زندگی
آجاتی تھی شریانوں میں
تھام لینے سے کوئی شہر سا بس جاتا تھا ویرانوں میں
یاد ہے...؟
ہم تجھے ملنے کے لیے
وقت سے پہلے پہنچ جاتے تھے
اور ملاقات کے بعد
ہم بہت دیر سے گھر آتے
تو کہتے کہ ہمیں کچھ نہ کہو
ہم بہت دور سے گھر آئے ہیں
اس قدر دور سے آئے ہیں
کہ شاید ہی کوئی آپائے
یاد ہے...؟
ہم تجھے بھگوان سمجھتے تھے مگر کفر سے ڈر جاتے تھے
تیرے چھن جانے کا ڈر ٹھیک سے رکھتا تھا مسلمان ہمیں
آ کسی شام کسی یاد کی دہلیز پہ آ
تیرے بھولے ہوئے رستوں پہ
لیے پھرتا ہے ایمان ہمیں
اور کہتا ہے کہ پہچان ہمیں
یاد ہے
ہم تجھے ایمان کہا کرتے تھے

شگفتہ سلیمان

ثمرہ، اقراء ــــــ کراچی
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

سعدیہ ــــــ شریف آباد
منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہوگئی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

عذرا ناصر ــــــ کراچی
بس اتنی بات پہ چھینی گئی ہے رہبری ہم سے
کہ ہم سے کارواں منزل پہ لٹوائے نہیں جاتے

فائزہ اکرم ــــــ نواب شاہ
گھر سے نکل کھڑے ہوئے پھر پوچھنا ہی کیا
منزل کہاں سے پاس پڑے گی کہاں سے دور

حنا خان ــــــ کوئٹہ
عین منزل پہ ہوئی شام تو پھر کیا ہوگا
جستجو یوں ہوئی ناکام تو پھر کیا ہوگا
شمع امید جلائی تو ہے ڈرتے ڈرتے
بجھ گئی یہ بھی سر شام تو پھر کیا ہوگا

صائمہ سندھو ــــــ کراچی
منزل ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں
جن کی آنکھوں میں ہوں آنسو انہیں زندہ سمجھو
پانی مرتا ہے تو دریا بھی اتر جاتے ہیں

آسیہ جاوید ــــــ علی پور چٹھہ
منزل پہ آکے شاد عجب حادثہ ہوا
میں ہم سفر کو بھول گیا ہم سفر مجھے

صدف عمران ــــــ کراچی
یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

اقصیٰ ناصر ــــــ کراچی
اک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

فوزیہ کاشف ــــــ فیصل آباد
تم ساتھ تھے تو ہم بھی تھے منزل سے آشنا
اب تم نہیں تو لگتے ہیں رستے عجیب سے

عائشہ، تحریم ــــــ گوجرہ
ہر اک پاؤں مجھے روندتا ہوا گزرا
نہ جانے کون سی منزل کا مسافر ہوں میں

نادیہ، طوبیٰ فیصل ــــــ گجرات
اب بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشان منزل
زندگی تو ہی بتا کتنا سفر باقی ہے

ندا، مدیحہ ــــــ فیصل آباد
مجھے آگیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سر راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

مریم شہباز ــــــ اورنگی ٹاؤن
یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم تیری تمنا میں جئیں
لطف منزل نہ سہی حسرت منزل ہی سہی

ایمن ــــــ گوجر خان
بچھڑ کے تجھ سے ہزاروں طرف خیال گیا
تری نظر مجھے کن منزلوں میں چھوڑ گئی

فوزیہ ثمر بٹ ــــــ گجرات
دو قدم کا فاصلہ تھا دو دلوں کے درمیان
ایک منزل تھی ہماری جس کو سر اس نے کیا

انیقہ انا ــــــ چکوال
اب خیال آتا ہے منزلوں کی سختی میں
کوئی یار تو اپنا ہم سفر بنا لیتے

ام رومان ــــــ عبدالحکیم
قریب آئے تو گم کردہ راہ دکھائی دیے
جو دور سے نظر آتے تھے منزلوں کی طرف

جویریہ طارق ــــــ آسٹریلیا
تلقین اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہ طلب میں جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

آسیہ بلوچ ______ نواب شاہ
شاید کہ مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

خالدہ بشیر ______ ترنڈہ محمد شاہ
یوں ہی رنجشوں میں گزر گئے کبھی وہ خفا کبھی میں خفا
چاہتوں کے موڑ پہ کبھی وہ رُکا کبھی میں رُکا
وہی رنجشیں، وہی چاہتیں نہ اسے خبر نہ مجھے پتا
ہم اپنی اپنی انا میں گم، کبھی وہ جدا کبھی میں جدا

امبر گل ______ جھڈو (سندھ)
رُت پلٹتی نہیں، وقت رُکتا نہیں
زور اپنا مقدر پہ چلتا نہیں
جینے والوں کا ماتم ہے چاروں طرف
جانے والوں کو اب کوئی روتا نہیں

ندا ______ کراچی
یوں ہی تاریک ہے فردا ابھی موسم نہیں بدلا
چمن کا زرد ہے چہرا، ابھی موسم نہیں بدلا
فضا میں جال پھیلے ہیں، نہیں جاتے امان امجد
کہ ہے صیاد کا پہرا، ابھی موسم نہیں بدلا

نزہت جاوید ______ علی پور چٹھہ
آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا

نادیہ، فوزیہ ______ فیصل آباد
رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے مقام کس کا تھا

زبیدہ ریاض ______ کراچی
دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

صائمہ سلیم ______ کراچی
اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کہتا ہے
کوئی نہ ہو تو مجھے وہ بُرا بھی کہتا ہے

صائمہ ______ کراچی
سینۂ سنگ سے دریا نہیں بہتے دیکھے؟
کون کہتا ہے کہ ہیں درد سے عاری پتھر

مدیحہ ______ فیصل آباد
درد غیر دل کا جو سینے میں بساتے ہیں ظفر
ایسے بھی لوگ زمانے میں ہوا کرتے ہیں

ربیعہ ______ خانیوال
یہ درد کے ٹکڑے ہیں اشعار نہیں ساغر
ہم کانچ کے دھاگوں میں زخموں کو پروتے ہیں

شازیہ ہاشم ______ قصور
میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی
ہر دل سے، ہر گروہ سے، ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں سوا اس کے اور کچھ
یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے

صائمہ امتیاز ساہی ______ منگووال غربی
رازِ دل نہ بتانا دُنیا کو ساغر
دُنیا میں سب ہم راز بدل جاتے ہیں
یہ سچ ہے نہیں مرتا کوئی کسی کی جدائی میں
بس جینے کے انداز بدل جاتے ہیں

مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہو گا حسب روایت ہم اپنی قارئین سے کچھ دلچسپ سوالات کر رہے ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے ان سوالات کے جوابات اور اپنی ایک عدد تصویر (اگر دینا چاہیں تو) ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ جوابات سالگرہ نمبر میں شامل اشاعت ہو سکیں۔

سوالات

(1) کیا سالگرہ کا دن آپ پر آپ کی زندگی کے مقصد کو واضح کرتا ہے؟
(2) سالگرہ کا یادگار اہتمام آپ نے کب اور کس کے لیے کیا؟
(3) سالگرہ پر ملنے والا کوئی حیران کن گفٹ جو آپ کو ملا یا آپ نے کسی کو دیا؟
(4) اب تک کی گزری زندگی میں آپ نے کیا کھویا کیا پایا؟

ریحانہ امجد بخاری

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں

اختر صاحب یہ سوچ کر تیز بارش میں ریڈی میڈ شرٹ خریدنے کے ارادے سے گھر سے نکلے کہ بارش کی وجہ سے دکانوں پر گاہک نہیں ہوں گے اور دکان دار رعایت کے ساتھ شرٹ دے دے گا۔ مگر وہ اس وقت حیران رہ گئے۔ جب دکان دار نے شرٹ کی قیمت چھ سو روپے بتائی، جبکہ ان کے اندازے کے مطابق وہ شرٹ چار سو روپے سے زیادہ کی نہیں تھی۔

"بھئی کمال ہے۔۔۔!" اختر صاحب نے غصے سے کہا۔ "میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ایسے خراب موسم میں شرٹ رعایتی قیمت میں مل جائے گی۔"

"اسے رعایت ہی سمجھیں جناب!" دکان دار ناصحانہ انداز میں بولا۔ "ہمیں اندازہ ہے کہ جو آدمی اتنی تیز بارش میں شرٹ خریدنے نکلا ہے اسے شرٹ کی کتنی شدید ضرورت ہو گی۔"

مصباح۔۔۔ بورے والا

جنون

گل بہادر کو حفاظتی بیلٹ باندھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اپنی کار میں کم سے کم فاصلے پر جاتے ہوئے بھی وہ حفاظتی بیلٹ باندھنا نہیں بھولتا تھا یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ ایک دن اس نے اپنے دوست کی کار دو گھنٹے کے لیے لی اس کی کار سروس کے لیے گئی ہوئی تھی۔ دوست کی کار میں حفاظتی بیلٹ نہیں تھا گل بہادر نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کار مصروف ترین شاہراہ پر بینک کے سامنے کھڑی کر دی اور اطمینان سے اپنی بیلٹ کھولی اور کار سے باہر آگیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بوکھلا کر اپنی آدھی اتری ہوئی پینٹ کو چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اکبر گل۔۔۔ جھڈو (سندھ)

نمکین غزل

کبھی جیت ہے، کبھی ہار ہے، کبھی عشق ہے کبھی وشق ہے
کبھی گالیاں، کبھی پیار ہے، کبھی عشق ہے، کبھی وشق ہے

مرا دل کہاں ہے، پتا نہیں، ترا کوئی تیر خطا نہیں
کبھی آر ہے، کبھی پار ہے، کبھی عشق ہے، کبھی وشق ہے

نہ دلائی میں، نہ رضائی میں، نہ غلاف میں، نہ لحاف میں
مجھے چین ہے، نہ قرار ہے، کبھی عشق ہے، کبھی وشق ہے

یہ فلک پہ بھیڑ نجوم کی، کرو تم نہ بات ہجوم کی
میری حسرتوں کا شمار ہے، کبھی عشق ہے، کبھی وشق ہے

تو ڈنر پہ آ مری دلربا، تو پلاؤ قورمہ خوب کھا
میرا ہوٹلوں میں ادھار ہے، کبھی عشق ہے، کبھی وشق ہے

کبھی میں جو "کیو" میں کھڑا ہوا مری جاں مجھے تو یہی لگا
ترے عاشقوں کی قطار ہے، کبھی عشق ہے، کبھی وشق ہے
(تشنہ بریلوی)

خدیجہ۔۔۔ کراچی

سگ سعادت مند

لندن کے ایک اسکوائر پر دو عورتیں گھبرائی گھبرائی سی ایک پولیس مین کے پاس پہنچیں۔ پولیس مین نے

ان کی گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو ان میں سے ایک بولی۔ ہم شاپنگ کے لیے آئے تھے۔ سامان خرید کر جب واپس پہنچے تو ہماری کار میں کسی کا کتا بیٹھا تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن وہ کار سے نہیں نکل رہا۔ پولیس مین نے عورتوں کے ساتھ آکر دیکھا کار میں واقعی لمبے سیاہ ریشمی بالوں والا ایک کتا براجمان تھا۔ اس کے پٹے پر مالک کا نام اور فون نمبر درج تھا۔ پولیس مین نے عورت سے اس کا موبائل لے کر مالک کو فون کیا اور کتے کے بارے میں شکایت کی مالک نے کہا فون ذرا کتے کو دیجیے۔ پولیس مین نے قدرے حیرت سے فون کتے کے کان سے لگایا مالک نے ڈانٹ کر کہا ٹامی! یہ کیا بدتمیزی ہے فوراً گھر پہنچو۔ کتا کچھ معذرت خواہانہ سے انداز میں بھونکا۔ پھر چھلانگ لگا کر گاڑی سے اترا اور تیزی سے دوڑتا ہوا غائب ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد پولیس مین نے دوبارہ اس نمبر پر تصدیق کی تو پتا چلا کہ کتا گھر پہنچ چکا تھا۔

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ ہانیہ عمران۔ گجرات

رائیگاں

شوہر اور بیوی کے درمیان شدید جھگڑے کے بعد شوہر نے خودکشی کی ٹھان لی چنانچہ وہ بازار گیا اور زہر خرید لایا۔ پھر بیوی کو دکھاتے ہوئے کھالیا کافی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ مرا نہیں، بس طبیعت ذرا ست ہو گئی۔ بیوی نے سر پیٹ لیا "سو بار کہا ہے کہ چیزیں دیکھ بھال کر خریدا کرو اتنے پیسے بھی بے کار گئے اور جس کام کے لیے لائے وہ کام بھی نہیں ہوا۔"

زوہا۔۔۔ عارف والا

رمضان مبارک

ڈیوڈ اور مائیکل صحرا میں کھو گئے جب وہ پیاس سے مرنے کے قریب ہو گئے تو وہ ایک نخلستان میں پہنچے وہاں پر ایک عمارت تھی جو دیکھنے میں مسجد لگ رہی تھی ڈیوڈ نے مائیکل سے کہا۔

"دیکھو ہم یہ ظاہر کریں گے کہ ہم مسلمان ہیں ورنہ ہمیں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا میں اپنے آپ کو عبداللہ ظاہر کروں گا۔" مائیکل نے اپنا نام بدلنے سے انکار کر دیا۔

مسجد کے پیش امام دونوں کے ساتھ پرتپاک انداز میں پیش آئے ڈیوڈ نے کہا۔

"میرا نام عبداللہ ہے۔" مائیکل نے کہا "اور میرا نام ہے مائیکل" پیش امام صاحب اپنے مددگار کی جانب مڑے اور کہا "مہربانی فرما کہ مائیکل کے لیے کھانے پینے کو کچھ لاؤ۔" پھر وہ ڈیوڈ کی طرف مڑتے ہوئے بولے "بھائی عبداللہ، رمضان مبارک ہو۔"

عائشہ۔۔۔ کراچی

ڈراپ سین

ایک فرانسیسی ہواباز اپنا جہاز رن وے پر اتارتے ہوئے بہت خوش تھا۔ نیچے عملے نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک ایئرمین اس کی وردی اور ہیلمٹ اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

ہواباز نے بڑے فخر سے کہا۔ "آج میں نے جرمنوں کا بہت نقصان کیا ہے، دو جہاز گرائے، ایک آبدوز تباہ کی اور ایک بحری جہاز اڑا دیا۔"

"لیکن سر جی! آپ سے ایک بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔"

"وہ کیا بھئی۔۔۔؟"

"دراصل سر جی! آپ غلطی سے جرمنوں کے ہوائی اڈے پر ہی لینڈ کر گئے ہیں۔"

کار کردگی

"میرا خیال ہے کہ باس نے مجھے مستقل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" ایک نئی اسٹینوگرافر نے اپنی سہیلی کو بتایا۔

"کیوں! باس نے آج کچھ کہا اس بارے میں؟" سہیلی نے دریافت کیا۔

"نہیں! باس نے آج میرے لیے ڈکشنری منگوائی ہے۔" اسٹینوگرافر نے خوشی خوشی بتایا۔

قمر ناز دہلوی۔۔۔ کراچی

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

فش شاشلک

اشیاء:

فش (بون لیس) (کیوبز میں کاٹ لیں)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ (تازہ کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ کا پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
شملہ مرچ (کیوبز میں کٹی ہوئی)	ایک عدد
ٹماٹر (کیوبز میں کٹے ہوئے)	دو عدد
تیل	فرائنگ کے لیے حسب ضرورت

ترکیب:

مچھلی کو ایک پیالے میں ڈال کر نمک، کالی مرچ، لیموں کا رس، سرکہ، چلی پیسٹ اور تیل اچھی طرح مکس کر کے بیس سے پچیس منٹ کے لیے میرینیٹ ہونے دیں۔ اب شاشلک اسٹک پر سب سے پہلے شملہ مرچ کا کیوب، اس کے بعد مچھلی کا کیوب پھر ٹماٹر اس کے بعد پیاز کا کیوب لگائیں۔ یہی ترتیب دو مرتبہ دہرائیں اور اسی ترتیب سے تمام شاشلک اسٹکس کو فل کر لیں۔ اب ایک نان اسٹک فرائی پین میں تقریباً دو کھانے کے چمچے تیل ڈال کر ان اسٹکس کو تل لیں۔ فش دونوں سائیڈوں سے گولڈن ہو جائے تو نکال لیں۔ اسی طرح تھوڑا تیل ڈال کر فرائی کرتی رہیں۔ اب فرائیڈ رائس کے اوپر فش شاشلک اسٹک رکھ کر سرو کریں یا ایک سرونگ ڈش میں چاول ڈال کر دبائیں اور ساتھ میں فش شاشلک رکھ کر سرو کریں۔

کریسی اینڈ اسپائسی فش

اشیاء:

بڑی مچھلی کے قتلے (دھو کر صاف کر لیں)	دو عدد
کاجن مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
مکھن	ایک چوتھائی کپ
سالسہ کے لیے	
پپیتا ایک عدد	
پیاز (درمیان میں سے کاٹ لیں) ایک عدد	
تازی لال مرچ	ایک عدد
ہرا دھنیا (چوپ کر لیں)	تین کھانے کے چمچے
لیموں (باریک چھلکا اتار کر الگ کر لیں اور رس نکال لیں)	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

پپیتے کو درمیان سے کاٹ کر اس کے بیج نکال کر الگ کر لیں اور اس کا چھلکا اتار لیں۔ پپیتے کے کیوبز کاٹ کر اسے ایک باؤل میں ڈالیں۔ اس میں پیاز، لال مرچ، ہرا دھنیا، لیموں کا چھلکا، لیموں کا رس اور نمک ڈال کر مکس کریں۔ نان اسٹک فرائی پین کو گرم کر کے اس میں کاجن مسالا ڈال کر گرم کریں۔ مچھلی کے قتلوں پہ مکھن لگائیں اور اسے فرائی پین میں کاجن مسالا کے اوپر ڈالیں۔ مچھلی جب دونوں طرف سے پک کر براؤن ہو جائے تو نکال کر سرونگ پلیٹ میں رکھیں۔ مزے دار کریسی اینڈ اسپائسی فش تیار ہے۔ تیار کیے ہوئے سالسہ کے ساتھ سرو کریں۔

تھائی گرین فش کری

اشیاء :
مچھلی ایک کلو
(بڑی مچھلی لیں صاف کرکے کیوبز کاٹ لیں)
ہری مرچیں حسب ذائقہ
(بیج نکال کر چوپ کرلیں)
ہری پیاز (چوپ کرلیں) چار عدد
پیاز (چوپ کرلیں) ایک گٹھی
لہسن کے جوے (کوٹ لیں) دو عدد
لیمن گراس دو عدد
(صرف سفید حصہ لیں اور اسے چوپ کرلیں)
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں) چھ کھانے کے چمچے
ثابت سیاہ مرچ چھ عدد
دھنیا پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر دو چائے کے چمچے
لیموں کا چھلکا (چوپ کرلیں) دو چائے کے چمچے
ہلدی پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ
نمک حسب ذائقہ
تیل تین کھانے کے چمچے
کوکونٹ ملک ڈھائی کپ
ادرک (سلائس کاٹ لیں) ایک انچ کا ٹکڑا
فش سوس ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :
فوڈ پروسیسر میں ہری مرچیں، ہری پیاز، پیاز، لہسن، لیمن گراس، ہرا دھنیا، سیاہ مرچ، دھنیا پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، لیموں کا چھلکا، ہلدی پاؤڈر، نمک اور دو کھانے کے چمچے تیل ڈال کر بلینڈ کرکے پیسٹ تیار کرلیں۔ سوس پین میں باقی بچا ہوا تیل گرم کریں اور اس میں تیار کیا ہوا پیسٹ ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں کوکونٹ ملک، ادرک اور فش سوس ڈال کر مکس کریں۔ مچھلی ڈال کر ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ تک پکائیں۔ اس کے بعد نمک شامل کریں اور مچھلی کے گل جانے تک پکائیں۔ سرونگ پلیٹ میں نکال لیں۔

کریبین فش اسٹکس

اشیاء :
مچھلی کے قتلے، چار عدد
(دھو کر کچن پیپر پر رکھ کر خشک کرلیں)
تیل تین کھانے کے چمچے
پیاز چھ گٹھے (باریک چوپ کرلیں)
لہسن کا جوا (کوٹ لیں) ایک عدد
ہری مرچ (بیج نکال کر چوپ کرلیں) ایک عدد
ٹماٹر (چوپ کیا ہوا) ایک چوتھائی کپ
تیزپات دو عدد
لال مرچ پاؤڈر ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پنج پورن مسالا ایک چائے کا چمچہ
لیموں (رس نکال لیں) دو عدد
براؤن شوگر ایک چائے کا چمچہ
نمک حسب ضرورت
بھنڈی (ڈیپ فرائی کرلیں) چھ عدد

ترکیب :
نان اسٹک سوس پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد لہسن اور ہری مرچ ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد ٹماٹر، تیزپات، لال مرچ پاؤڈر، پنج پورن مسالا، نمک، براؤن شوگر اور لیموں کا رس ڈال کر چمچہ چلائیں اور پندرہ منٹ تک پکانے کے بعد اس میں مچھلی ڈال کر احتیاط سے مکس کریں۔ ڈھکن ڈھک کر درمیانی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ مچھلی کے پک جانے کے بعد اسے سرونگ ڈش میں نکال لیں اور فرائی کی ہوئی بھنڈی کے ساتھ سرو کریں۔

پران ود گرین کوکونٹ کری

اشیاء :
جھینگے تین کپ
(صاف کرکے شیلو فرائی کرلیں)

گرین مسالا ایک کپ
کوکونٹ ملک تہائی کپ
ہرا دھنیا حسب ضرورت
(گارنشنگ کے لیے)
باسمتی چاول ایک کپ
(نمک ملے پانی میں ابال لیں)
نمک حسب ضرورت
زیرہ پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :
گرین مسالا بنانے کے لیے ہرا دھنیا چوپ کرلیں۔ پودینہ کے پتے الگ کرکے چوپ کرلیں۔ ہری مرچوں کو چوپ کرلیں۔ لہسن کے جوے کو چوپ کرلیں۔ فوڈ پروسیسر میں ہرا دھنیا، پودینہ، لہسن، ہری مرچ، نمک اور آدھا چائے کا چمچہ زیرہ پاؤڈر ڈال کر بلینڈ کرکے پیسٹ تیار کرلیں۔ گرین مسالا تیار ہے۔
نان اسٹک سوس پین میں گرین مسالا اور کوکونٹ ملک ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ پانچ منٹ کے بعد اس میں جھینگے ڈال کر پانچ منٹ تک ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ نمک شامل کریں اور جھینگوں کے پک جانے کے بعد انہیں سرونگ باؤل میں نکالیں اور ہرا دھنیا سے گارنش کریں۔ مزے دار پران ود گرین کوکونٹ کری تیار ہے، ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

پران ود گارلک مایونیز

اشیاء :
جھینگے بیس عدد
(بڑے سائز کے جھینگے لیں اور صاف کرکے دھولیں۔)
تازہ لال مرچ ایک عدد
پیپریکا پاؤڈر آدھا چائے کا چمچہ
لہسن کا جوا (کوٹ لیں) ایک عدد
لیموں ایک عدد
(آدھا لیموں کا رس نکال لیں)
زیتون کا تیل کھانے کے چمچے
سیاہ مرچ پاؤڈر حسب ضرورت
نمک حسب ضرورت
گارلک مایونیز بنانے کے لیے:
مایونیز ایک کپ
لہسن کے جوے (کوٹ لیں) دو عدد
مسٹرڈ پیسٹ ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :
گارلک مایونیز بنانے کے لیے ایک کپ میں مایونیز، لہسن اور مسٹرڈ پیسٹ ڈال کر مکس کرکے ایک طرف رکھ دیں۔ ایک الگ پیالے میں لال مرچ، پیپریکا پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، لہسن، لیموں کا رس، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور زیتون کا تیل ڈال کر مکس کریں۔ اس مکسچر کو جھینگوں پر لگائیں اور اسے ڈھک کر تیس منٹ تک کے لیے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا لیں۔ میرینیٹ کیے ہوئے جھینگوں کو سیخوں میں پروئیں اور انگیٹھی پر رکھ کر گولڈن براؤن ہوجانے تک سینک لیں۔ جھینگوں کے پک جانے کے بعد انہیں سرونگ پلیٹ میں نکال لیں اور تیار کیے ہوئے گارلک مایونیز کے ساتھ سرو کریں۔

عربی مچھلی

اشیاء :
ہیمفورٹ یا کوئی بھی ثابت مچھلی ایک کلو
(کٹ لگا کر نمک لگادیں)
ادرک ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن چار جوئے
ہری مرچ ایک عدد
(ادرک، لہسن اور ہری مرچ کو پیس لیں اور اس میں دھنیا ــــ زیرہ مسٹرڈ پاؤڈر چٹکی بھر نمک ملا کر پیسٹ بنالیں)
سفید زیرہ آدھا چائے کا چمچہ

دھنیا پسا ہوا — آدھا چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ — آدھا چائے کا چمچہ
پودینہ (کٹا ہوا) — ایک کھانے کا چمچہ
کری پتے — چھ عدد
ہرا دھنیا (کٹا ہوا) — ایک کھانے کا چمچہ
سویا سوس — دو کھانے کے چمچے
لیموں کا رس — دو کھانے کے چمچے
مکھن — ایک چھوٹی ٹکیہ
پیاز (آٹھ ٹکڑے کرلیں) — ایک عدد
ٹماٹر (آٹھ ٹکڑے کرلیں) — دو عدد
شملہ مرچ (آٹھ ٹکڑے کرلیں) — ایک عدد
بڑی مرچ (ثابت رکھیں) — ایک عدد
تیل — آدھا کپ

ترکیب :

نمک لگی مچھلی کو فرائی کرلیں۔ اب اس میں پیسٹ والا مسالا لگائیں اور بیکنگ ٹرے میں رکھیں۔ اب سویا سوس لیموں کا رس اور اجینو موتو والا مکسچر پیاز، شملہ مرچ اور ٹماٹر کو لگادیں اور مچھلی کے برابر میں گارنش کی طرح رکھیں۔ اب مچھلی پر کری پتے اور مکھن کی ٹکیہ لگا کر اوون میں بیک کریں تقریباً" آدھے گھنٹے تک۔ اس مچھلی کو کھانے / سرو کرنے سے پہلے بیک کریں۔ پہلے سے بیک کرنے پر اس کا مزا خراب ہو سکتا ہے۔

ٹماٹر مچھلی

اشیاء :

مچھلی (قتلے) — آدھا کلو
ٹماٹر — ایک پاؤ
لہسن — 35 گرام
بیسن — ایک کھانے کا چمچہ
دہی — 100 ملی لیٹر
گرم مسالا (پسا ہوا) — ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ (پسی ہوئی) — ایک چائے کا چمچہ
زعفران — چند ریشے
(تھوڑے سے دودھ میں حل کرلیں)
تیل — تین کھانے کے چمچے
ہلدی — ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
لونگ — چار عدد
ہری مرچ (باریک کاٹ لیں) — پانچ عدد
ہرا دھنیا (باریک کاٹ لیں) — بیس گرام
ادرک (باریک کاٹ لیں) — پندرہ گرام
زیرہ — ایک چائے کا چمچہ
الائچی — چار عدد
نمک — ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

مچھلی کے قتلوں کو بیسن سے دھولیں۔ ٹماٹروں کو مکسچر میں گرائنڈ کرلیں۔ پھر ٹماٹروں کا گودا نچوڑ لیں اور اسے ایک طرف رکھ دیں۔ دہی کو مسکچر میں پھینٹ لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ ادرک کو گرائنڈ کرکے پیسٹ سا بنالیں۔ پھر پھینٹے ہوئے دہی، ادرک کے پیسٹ، نمک (حسب ذائقہ) پسا ہوا گرم مسالا، ہری مرچ، نصف ہرا دھنیا اور سرخ مرچ پسی ہوئی آپس میں مکس کرلیں اور مچھلی کے قتلوں کو اس مکسچر میں لیپ کرکے نصف گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

ایک نان اسٹک پین میں تیل گرم کریں اور اس میں ادرک کٹی ہوئی، ہلدی، زیرہ، لونگ اور الائچی ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کریں۔ پھر ٹماٹر کا گودا شامل کرکے پانچ منٹ تک فرائی کریں اور چمچہ چلاتے رہیں۔ اب مسالا لگی مچھلی کے قتلے شامل کرکے مزید دس منٹ یا مچھلی کے گلنے تک پکائیں۔ پھر اوپر سے زعفران چھڑک دیں اور بقیہ ہرے دھنیے سے گارنش کرکے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

☆ ☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

حکیمہ جبیں..... کوئٹہ، سید آباد

س ۔ کس موسم میں محبت سستی ہوتی ہے؟
ج ۔ گرمی کے موسم میں۔
س ۔ عورت کے پاس سب سے قیمتی چیز کون سی ہے؟
ج ۔ حیا۔

عاکفہ صدیقی.... کراچی

س ۔ کیا بات ہے آخر آپ ہماری بھابھی کو سمجھتے کیا ہیں، ہاں نہیں تو؟
ج ۔ میں آپ کی بھابھی کو سمجھنے والا کون؟

توحید صدیقی.... کراچی

س ۔ سنا ہے محبت اندھی ہوتی ہے۔ بہری اور گونگی وغیرہ بھی ہوتی ہے کیا، یہ ٹھیک ہے؟
ج ۔ سنی سنائی باتوں پر اچھے بچے کان نہیں دھرتے

نازنازش گل.... کراچی

س ۔ فروری کے شمارے میں کالم (نہلے پہ دہلا) کے اوپر جو تصویر شائع ہوئی ہے وہ آپ کی ہے؟ اگر آپ کی ہے تو کتنے سال پرانی ہے؟
ج ۔ میری نہیں ہے۔
س ۔ ماہنامہ "کرن" کے فروری کے شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ میں نے انشاء کا اضافہ دیکھا۔ کیا آپ پیارے انشاء جی کے بیٹے ہیں؟
ج ۔ جی ہاں۔

رابعہ مختار روبی

س ۔ پڑوسی اگر عیب دار ہوں تو؟
ج ۔ چپ سادھے رہیے۔

فرحت جبیں..... کراچی

س ۔ آپ اتنے پیارے پیارے جواب کیسے دے دیتے ہیں؟
ج ۔ کرسی پر بیٹھ کر، قلم سے لکھ کر

شمیم مصطفیٰ قریشی..... کراچی

س ۔ السلام علیکم! کیا وجہ ہے کہ کرن کے ذوالقرنین صاحب میرے سوالوں کے جواب نہیں دیتے؟
ج ۔ انہیں سمجھاؤں گا کہ آپ کے سوالوں کے جواب ضرور دیا کریں۔

گلنار شگفتہ گل.... راولپنڈی

س ۔ اوئے ہوئے.... آخر نہ رہ سکے اور تصویر چھپوا دی۔ مگر حیرت ہے کہ تصویر کے "سر" پر کافی بال ہیں۔

جبکہ بقول آپ کے سر پر فقط "دس" بال ہیں۔ سچ سچ بتائیں یہ تصویر کس کی ادھار لی ہے؟

ج ۔اپنے پڑوسی کی۔

فیروز جہاں..... خانیوال

س ۔اس انسان کی کیا سزا ہو جو گزرا ہوا وقت بھول جائے؟

ج ۔اس کو سزا خداوند خود ہی دے دے گا۔ آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔

صائمہ گل..... بہاول پور

س ۔اگر کوئی مرد شادی کے دن سہرے کے پیچھے روئے تو کیا سمجھنا چاہیے؟

ج ۔نکاح کے وقت اس نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اس کے والد بزرگوار نے زبردستی کروائی ہے "ہاں"

آنسہ شفق رحمن..... بہاول پور

س ۔سنا ہے تم نے ماسی مصیبتے کا "دمڑ" چرالیا ہے؟

ج ۔کھا بھی لیا۔

س ۔جلدی کا کام شیطان کا دیر کا کام؟

ج ۔انسان کا

دلشاد انصاری..... سکھر

س ۔میں نے سنا آپ ایک دن مٹھائی کا ٹوکرا سر پر دھرے جلوس میں سب سے آگے سٹ پٹائے چلے جارہے تھے! کیا یہ سچ ہے؟

ج ۔پھر وہی کہ سنا ہے آپ گنجے ہیں سنا ہے آپ مٹھائی کا ٹوکرا لیے جارہے تھے۔ بھئی جو آنکھوں سے نہ دیکھے صرف سنا ہو اس کا کیا اعتبار۔

شہناز فیضی..... کراچی

س ۔سنا ہے کہ آپ نے جو فلسفیانہ تصویر اوپر دی ہے وہ آپ کی نہیں کسی اور کی ہے؟

ج ۔درست سنا ہے، میری تصویر گم کردی اور جس کسی کی تصویر بھی ہاتھ لگی وہ چھاپ دی ایڈیٹر صاحب نے۔

فوزیہ ناز..... کراچی

س ۔میں نے آج تک مردوں کو روتے نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ؟

ج ۔خود میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی۔

س ۔تارے کب نظر آتے ہیں؟

ج ۔جب آنکھیں کھلی ہوں۔

س ۔آپ کی تصویر آئی دیکھی ہم نے غور سے سب ادا اچھی مگر یہ خاموشی کی ادا اچھی نہیں؟

ج ۔تردید کرتے کرتے میں تو تھک ہی گیا۔

عینی طفیل..... کراچی

س ۔سنا ہے آپ اس محفل سے برخاست ہونے والے ہیں کیا بہنوں کے سوالات سے گھبرا گئے؟

ج ۔یہ کسی دشمن کی اڑائی لگتی ہے، سال بھر سے جما بیٹھا ہوں، مگر یہ افواہ ساتھ نہیں چھوڑتی۔

شہلا تبسم نقوی..... کراچی

س ۔یہ فروری کے شمارے میں سوالات کی تعداد زیادہ کیوں ہے؟

ج ۔تاکہ آپ لوگوں کے شکووں سے محفوظ رہ سکیں۔

نسیم سحر فوزیہ..... سیالکوٹ

س ۔کل میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ سر جھکائے ٹوپی پہنے بڑی مسکین سی صورت بنائے سڑکوں پر جھاڑو دے رہے تھے کیا یہ واقعی درست ہے یا... یا؟

ج ۔یہ بات آخر سیالکوٹ والیو آپ کے ذہن میں کیوں آئی۔

س ۔ذرا یہ بتائیں کہ آپ اپنی بیگم کو الو بناتے ہیں یا وہ آپ کو الو بناتی ہیں، سوال گول مت کیجیے گا؟

ج ۔بنے بنائے کو کوئی کیا بناتا ہوگا آپ خود ہی سوچیے

مدیرہ

نامے میرے نام

ماریہ الماس..... ہارون آباد

السلام علیکم! جنوری 2012ء کا کرن ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل اچھا تھا لیکن پچھلی دفعہ بھی ماڈل کا ڈریس سرخ ہی تھا۔ اب پھر... تھوڑا مختلف ہونا چاہیے تھا۔

سب سے پہلے "ساڈا چڑیا دا چنبا" پڑھا ماشاءاللہ نفیسہ جی نے بہت اچھا لکھا۔ اگرچہ ہمیں امید تھی کہ نبیرہ کی سنان سے شادی ہوجائے گی لیکن ایسے بھی بہت اچھا لگا۔ سکندر کی تلملاہٹ پر ہمیں بہت مزا آیا۔

سمیرا شریف کا ناول بھی اچھا تھا۔ ناولٹس میں "تشنگی" بہت پسند آیا۔ "وہ اک پری ہے" میں شاعری کا انتخاب بہت زبردست ہوتا ہے۔ افسانے سارے ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔

"کرن کرن خوشبو" میں حمیرا عروش کا انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا۔ نیا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ ہماری حسرت ہے کہ کبھی "یادوں کے دریچے سے" میں ہمارا انتخاب بھی شائع ہوجائے۔ "مجھے شعر پسند ہے" میں مسرت طارق آزاد کشمیر اور کرن، بینش فیصل آباد کے انتخاب میری ڈائری کی زینت بنے۔ باقی سب کچھ بھی خوب تھا دعا ہے کہ کرن یوں ہی کامیاب رہے۔ (آمین)

نمرہ ثمرین انوار..... راولپنڈی

سب سے پہلے تو کرن کے اسٹاف مصنفین اور قارئین کو میری طرف سے نئے سال کی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک نیا سال سب کے لیے خوشیاں لائے۔ (آمین)

اب آتی ہوں تبصرے کی جانب، زیادہ تو نہیں پڑھا لیکن پڑھا ہے۔ انٹرویو میں سوہائے علی ابرو سے ملاقات اچھی لگی کافی محنتی لگتی ہیں۔ میکال ذوالفقار تھوڑے خود پسند اور مغرور لگے۔ باقی ایک ناولٹ پڑھا ہے۔ "اک نئی محبت" بہت اچھا تھا۔ شہریار کے ساتھ جو ہوا اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ افسانوں میں "بند ہونٹوں کی بات" اور "احترام محبت" پڑھے۔ دنوں ہی اپنی جگہ بہت اچھے تھے باقی پڑھ نہیں سکی۔ اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

آپ سے ایک اور بات پوچھنی تھی۔ میں نے ایک ناولٹ اور دو افسانے آپ کو ارسال کیے تھے۔ "نادان دل قیدی محبت کی" اور "انا" کے نام سے۔ آپ پلیز بتادیں کہ وہ قابل اشاعت ہیں کہ نہیں پلیز میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا ..... سب کو میری طرف سے دعا اور سلام۔ اگر میرے افسانے قابل اشاعت نہیں ہیں تو پلیز وجہ ضرور بتائیے گا، تاکہ میں اپنی غلطیاں سدھارنے کی کوشش کروں۔

شمع مسکان..... جام پور

ویسے تو کرن کو بہت پڑھا ہے۔ مگر مستقل قاری صرف شعاع کی تھی۔ پچھلے تین ماہ سے کرن بھی میرے مستقل مطالعاتی رسالوں میں شامل ہوچکا ہے۔ کرن کو میں نغمہ باجی، صبا اور خالدہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ کرن اپنے نام کا بالکل عکس ہے اپنے لفظوں کی روشن شعاعوں سے معاشرے میں سانس لیتے بے شمار ایسے کرداروں سے شناسائی کراتا ہے۔ جن سے اپنے اردگرد بکھرے ہونے کے باوجود ہم انجان ہوتے ہیں۔ یہ بہت معیاری ڈائجسٹ ہے۔ جب سے کرن سے مستقل رشتہ جڑا ہے تو گزشتہ جمع شدہ تمام ڈائجسٹ میں سلسلے وار ناولز بھی پڑھ ڈالے۔ فیورٹ ناول "دردل" کے متعلق تو تشنگی برقرار ہے کہ شروع سے پڑھتی خیر...

اس ماہ کرن 14 تاریخ کو سردیوں کی ٹھنڈی گرم جاتی دھوپ کے سنگ ملا۔ جسے پاکر ایسا لگا گویا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ سرورق کو دیکھ کر ایک شعر ذہن میں آیا۔

دیکھ کر اس حسین پیکر کو
نشہ سا آگیا سمندر کو

سب سے پہلے حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد اداریہ پڑھا۔ سلسلے وار ناولز نہ دیکھ کر جہاں مایوسی ہوئی' وہیں نفیسہ جی کے ناول کی آخری قسط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی جلد از جلد نفیسہ جی کے ناول پر پہنچے۔ ویل ڈن! نفیسہ جی بہت خوب اینڈ کیا گرچہ ہماری سوچ کے برعکس کیا۔ ہم تو نیرہ کو سنان کے ساتھ سوچے بیٹھے تھے۔ فردوس خان اور شمریز کے ساتھ کاشف بھی بہت خوب صورت کردار تھا۔ دیار غیر میں ایک باکردار تنہا لڑکی جن مشکلات کا شکار ہوئی اس پر دل دکھ سے بھر گیا۔ واقعی جب نیرہ ایئرپورٹ پر اپنی پاک زمین کا بوسہ لیتی ہے اور اس کا رونا' اس سین نے تو ہماری آنکھیں بھی نم کردیں اس پورے ناول میں نیرہ کے حوصلے اور پختہ عزائم کو داد دیتی ہوں۔ نیرہ کی ایک بات دل کو لگی کہ سکندر نے مجھے طلاق دی تو ہلیزا کے لیے اور سنان نے طلاق دی' مرینہ کو میری خاطر۔ دونوں نے اپنے اپنے مفاد کے لیے قربان تو عورت ہی کو کیا پتا نہیں ساری قربانیاں عورت کے حصے میں ہی کیوں آتی ہیں۔

سمیرا شریف کا ناول تو اس ماہ کرن کی جان تھا۔ بازل کا جذباتی انداز پسند نہیں آیا کہ بغیر انویسٹیگیشن کے ربدا کو کڈنیپ کرانا بعد میں سب کچھ واضح ہوا تو پھر ضمیر کی ملامت و شرمندگی نے بے چین کردیا بے شک اس نے ربدا سے شادی کرلی ربدا نے اسے معاف بھی کردیا لیکن ایک اٹل حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ اغوا ہوئی تھی۔ جسے ہمارے معاشرے میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے یقیناً" سب ہی جانتے ہیں۔ کیا معاشرے میں اسے واپس وہ عزت ملے گی؟ کیا اغوا شدہ کا لیبل اس کی زیست سے ہٹ جائے گا؟ ناولٹ "وہ اک پری ہے" کی یہ قسط بھی بہت اچھی تھی کنول کی موت کا بہت افسوس ہوا مگر اپنی عصمت و آبرو کا سودا اگر موت سے کیا تو کوئی مہنگا نہیں تھا۔ فاروق ملک کو اس کے کیے کی کڑی سزا ملنی چاہیے اسے بھی جینے کا کوئی حق نہیں۔ اذان کا کردار تو میرا فیورٹ کردار ہے پلیز ادارہ سے ریکویسٹ ہے کہ ناولٹ کا ذرا پچھلا خلاصہ دے دیں تاکہ کچھ کردار واضح ہو سکیں۔

لبنیٰ طاہر کی "تشنگی" اچھی تحریر تھی۔ فاخرہ کی خود غرضی اور ہوس نے اپنی ہی بیٹی کو برباد کردیا۔ شوہر کیا احسان تو اس نے جتا جتا کر ہی ضائع کردیا۔ باقی ایاز کی سادگی و شرافت سے کھیلتی رہی۔ برے کام کا برا انجام تو ہونا ہی تھا۔ مگر مرد کو ایاز کی طرح عقل کا اندھا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ الماس کے احساس دلانے پر بھی احساس نہ ہوا جب تک ٹھوکر نہ کھالی۔ ہمیں تو سین بہت اچھی لگی۔ ریاض صاحب نے ایاز کو صرف اپنے گھر میں جگہ دی تھی کوئی اپنی دولت اس کے نام نہیں کی جو ایاز کی کمائی پہ فاخرہ کا حق بنتا۔

"اک نئی محبت" حیا بخاری کے الفاظ کے سحر نے ایک عام سی کہانی کو بھی خاص بنادیا۔ کومل نے عالی کے حق میں فیصلہ کرکے بالکل ٹھیک کیا شہریار جیسے مرد کبھی نہیں سدھر سکتے۔ عالی اور زینی کی نوک جھوک نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی کومل کا کہاں تو شہریار سے ڈرنا اور کہاں ہوا کہ کے مردوں کو بال کی طرح اچھالنا اچھا لگا۔ اس ماہ سے شروع "مقابل ہے آئینہ" ہم جیسی بہنوں کے لیے تو نہیں ہے۔ (شرعی پردہ) تاہم پھر بھی دوسری بہنوں کے بارے [illegible] کر اور انہیں دیکھ کر خوشی ہوگی۔

"نامے میرے نام" میں امبر گل کے خط نے آنکھیں نم کردیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور گھر والوں کو صبر کی توفیق دے۔ (آمین) "یادوں کے دریچے سے" فوزیہ ثمر بٹ کا انتخاب پسند آیا۔ اچھا اب تبصرہ بہت طویل ہوگیا ہے۔ پتا نہیں مدیرہ جی شائع کریں گی یا ہمیں ردی کی نذر کریں گی' اجازت چاہتی ہوں۔ (اللہ حافظ۔)

ج پیاری شمع! "مقابل ہے آئینہ" کے لیے تصویر کی شرط ضروری نہیں آپ اپنے جوابات بغیر تصویر کے بھی بھیج سکتی ہیں۔

امبر گل۔۔۔ جھڈو (سندھ)

آخر کار ہمارا انتظار 12 تاریخ کو ختم ہوا اور پورا مہینہ جس کے انتظار میں دن گن گن کے گزارتے رہے۔ اس محبوب کرن نے ہمیں اپنے درشن کروا ہی دیے۔ ٹائٹل سب سے پہلے جس پہ نظر پڑتی ہے' جی بڑا ہی پسند آیا ہمیں تو' ماڈل' ڈریس' جیولری اور سب سے پیارا صوفہ لگا۔ (بے چاری ماڈل کی توہین کرڈالی ہم نے تو۔) اینی ویز سب سے پہلے نامے میرے نام میں جھانکی ماری اور اپنا خط دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

اب بات ہوجائے سمیرا کے ناول "وہ اک لمحہ محبت کی" تو جناب نہ تو بہت زیادہ پسند آیا نہ ہی بہت برا لگا حالانکہ سمیرا جب بھی لکھتی ہیں۔ بہت بہترین ہوتا ہے۔ مگر سمیرا یار معذرت کے ساتھ' ناول میں کافی جھول محسوس ہو رہے تھے کہیں پر تیزی' کہیں پر سستی' ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کئی سبق پہلے کے پڑھے ہوئے ہوں' خیر محنت کرتی رہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔۔۔

حیا بخاری کا "اک نئی محبت" بالکل مزا نہیں آیا۔ اس ناولٹ کو پڑھ کر تو' پہلی بات تو یہ کہ پشتو بہت اچھی زبان ہے۔ اس کا اگر اچھے طریقے سے استعمال کیا جاتا تو اچھا بھی لگتا اب پورے ناولٹ میں صرف دو تین جملے ڈالے گئے جن کا کوئی مقصد سمجھ نہیں آیا مجھے تو' اور پھر دوبار کومل بی بی کا مارشل آرٹ کے جوہر دکھانے والا چکر بھی کچھ پلے نہیں پڑا' بھئی جو چیز بھی ہو ناول میں اس کا کم از کم کوئی واضح مقصد تو ہونا چاہیے نا' کافی مایوس کیا حیا صاحبہ نے تو۔۔۔ لبنیٰ طاہر کا "تشنگی" اچھا لگا مگر بھئی یہ ایاز جیسے بے وقوفی کی حد تک حساس اور سادہ دل لوگ آج کل کے زمانے میں کہاں رہ گئے ہیں بھلا؟ افسانوں میں بشریٰ جی کے افسانے نے بہت امپریس کیا۔ فرح طاہر کی کوشش بھی اچھی لگی لائٹ سا افسانہ تھا۔ کیپ اٹ اپ فرح جانو۔

"ہمارے اور ہی روگ تھے" نہ جانے کیوں کافی پہلے کا پڑھا ہوا افسانہ محسوس ہوا۔

فنکاروں سے سال نو کا انٹرویو بس سو سو ہی لگا۔ میکال کے انٹرویو میں ایسا لگا کہ محترم کافی حد تک سچ بول رہے ہیں آگے اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر جانتا ہے نیا سلسلہ بہت اچھا لگا میں تقریباً" دو تین مہینے سے یہی سوچ رہی تھی کہ ان اداکاروں اور رائٹرز وغیرہ کے انٹرویوز پڑھ' پڑھ کر اب بوریت محسوس ہونے لگی ہے۔ میں کرن والوں کو مشورہ دوں گی کہ اب قارئین کا انٹرویو کرنا شروع کردیں اور ماشاء اللہ سے ہمارے کرن والے اتنے نزدیک ہیں ہمارے دلوں کے کہ جوبات ابھی ہم سوچ ہی رہے ہوتے ہیں اور آپ لوگ اس پر عمل بھی کرڈالتے ہیں۔

حمیرا' حریم اور ثنا کی تحریریں بھی اچھی لگیں۔ حمیرا مہتاب کا انٹرویو بھی بہت پسند آیا کافی اچھے جواب دیے انہوں نے۔ "یادوں کے دریچے" میں اپنے علاوہ صائمہ رانی اور فوزیہ کا انتخاب اچھا لگا۔ اشعار میں اکثر شعر ایک جیسے چھپے ہوئے تھے۔ لیکن اچھے تھے۔

"مسکراتی کرنیں" پڑھ کر اس بار بالکل ہنسی نہیں آئی مزے کی جو نہیں تھیں۔ اب باری آتی ہے ناموں کی جو کہ تقریباً" سب ہی زبردست تھے سب سے پہلے فوزیہ جی کیا بات ہے طبیعت کیوں خراب ہوگئی ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا' ویسے آپ کی تلاش میں' میں نے اپنی بیسٹ فرینڈ آسیہ عبدالعزیز بٹ کو لگایا ہوا ہے یار کچھ تو ایسا کرو کہ ڈائریکٹ رابطے کی کوئی سبیل نکلے۔ انیقہ جی ہمیں تو آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگتا ہے آپ کو خود کیوں نہیں پسند آتا۔ اب مجھے اپنے تبصرہ پر سب کی آرا کا انتظار رہے گا۔ نواب زادی سو لنگی اور کنول شاہین پلیز یار و کم بیک کرو نا' جب میں آگئی ہوں تو تم لوگ بھی لوٹ آؤ نا۔

اب سب سے اہم بات کہ یکم فروری کو میرے عزیز از جان ابو جی کی ہے۔ سوئیٹ ابو جی آپ کو ہم سب کی طرف سے سالگرہ مبارک ہو۔ آج میں کرن کے توسط سے آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں اب آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں میری اپنے مالک سے یہی دعا ہے کہ وہ آپ کا سایہ تاعمر ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے آمین۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

سال نو کا کرن اس بار بارہ تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق نہایت خوب صورت تھا۔ جیولری' مہرون لہنگے میں ماڈل اچھی لگ رہی تھی۔ حسب عادت سب سے پہلے نامے میرے نام میں دیکھا اور خوشی ہوئی۔ سب نے کرن کے بارے میں اچھا لکھا۔ امبر گل کی واپسی اچھی لگی انٹرویوز میں نئے چہروں سے ملاقات اچھی لگی۔ میکال ذوالفقار پہ غصہ تھا اس لیے اس بار ان کا انٹرویو اچھا نہیں لگا۔ ابن انشا کا کلر ڈیپیشنٹ بہت پسند آیا۔

سب سے پہلے جس تحریر کا شدت سے انتظار تھا وہ پڑھی۔ مطلب نفیسہ سعید کا ناول بہترین تحریر اور خوب صورت اینڈ واقعی ہم نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا مگر یہ تو سوچا ہی نہیں کہ نیرہ ایک سچی اور اپنے فیصلے پر اٹل رہنے والی لڑکی تھی تو پھر وہ کیسے اس شخص کا ساتھ چاہتی جو بہت پہلے اپنوں کے مفاد کی خاطر اسے چھوڑ چکا تھا۔ بہرحال نفیسہ صاحبہ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں انہوں نے بہت اچھا

اینڈ کیا۔ نیرو اتنی تکلیف' اتنے دکھ سہہ چکی تھی وہ کیسے اپنے گھر والوں کی بات مان لیتی اور اس سنان کو خوش ہونے کا موقع دیتی' جس نے کبھی اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ سمیرا شریف کا "وہ ایک لمحہ محبت" بھی اچھی تحریر تھی۔ مگر رائٹر نے یہ واضح نہیں کیا کہ بازل خان نے بینش کا کیا' کیا؟ لوگ پتا نہیں خود کو اتنا کیوں گرا دیتے ہیں اور دوسروں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔

"تشنگی" بھی اچھی تحریر تھی فاخرہ کتنی چالاک' لالچی اور خود غرض عورت تھی حد ہوتی ہے بے غیرتی کی۔ ایاز اپنے اوپر کیے احسان کا بدلہ چکا تا تو رہا تھا پھر بھی اس کی جان بخشی نہیں کی فاخرہ نے پھر ایاز بے چارے کا گھر اجاڑنے چلی تھی اور صبا کے ساتھ تو بہت اچھا ہوا۔ ماں جیسی بدفطرت لڑکی جنت کو چھوڑ کر جہنم خرید لیا اس نے' سچ کہتے ہیں نیت اچھی ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے صبا نے خود اپنے لیے کانٹے بوئے۔ "اک نئی محبت" اچھی تحریر تھی مگر ہیرو اتنا بے غیرت نکلا کہ اپنی منگیتر کے ساتھ برا کر ڈالا کومل کو اب اتنا بھی ڈر کے نہیں رہنا چاہیے تھا شہریار سے۔

روبی نور کا افسانہ "ہمارے اور ہی روگ تھے" ابرار کیسا مرد تھا جو اپنی تسلی کے لیے مریم کے مستقبل کو داؤ پہ لگانے لگا تھا وہ تو مریم نے عین ٹائم پہ محبت کی قبر پہ لات مار دی ورنہ تو بے چاری کے پاس کیا رہ جاتا والدین کی رسوائی' اپنوں کی بے اعتباری اور اس محبت سے ہاتھ دھونے پڑتے جس کے لیے گھر سے بھاگ جانے کا رسک لینے لگی تھی۔ ابرار سے شادی کر کے اب بھی تو وہ بے اماں رہی تھی۔ باقی کے افسانے سو سو رہے کوئی خاص بات' کوئی خاص تقید نہ تھی تحریروں میں۔

مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب' شاعری نئی اچھی تھی' مسکراتی کرنیں کچھ خاص نہ لگیں۔ مگر فریدہ صاحبہ کا مشابہت ویری فنی تھا۔ "یادوں کے دریچے" کے علاوہ کہیں بھی میرا انتخاب نہیں تھا۔ اچھا نہیں لگا ہوگا نا۔ اس لیے کوئی بات نہیں' پھر سہی۔

طیبہ خالد۔۔۔ گڈیالہ

سال نو کا شمارہ حسب توقع بارہ تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل گرل ریڈ ڈریس میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے فہرست پر نگاہ ڈالی افسانوں کی رائٹرز کے نام دیکھ کر حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا' ہائے میرے نام تک پہنچی اور حلق میں پھنسا آنسوؤں کا گولہ لمحوں کے رستے بہنے لگا کیونکہ میرا خط شائع ہوا نہ ہی کوئی تحریر۔

دوسری اور شاید آخری بار ایک اور تحریر بھیج رہی ہوں پلیز ضرور شائع کیجیے گا۔ اگر مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو پلیز بتائیے گا ضرور مجھے اس خط کے آخر میں جواب چاہیے۔ کیا میں ہر ماہ آپ کو اپنی تحریر بھیج دوں؟ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اب اجازت چاہتی ہوں' اللہ حافظ۔

ج : پیاری طیبہ! آپ کا افسانہ ناقابل اشاعت ہے آپ فی الحال مطالعہ پر توجہ دیں۔ مستقل سلسلوں کے لیے آپ اپنی تحریریں ہمیں ہر ماہ بھیج سکتی ہیں۔ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں ضرور شائع کی جائیں گی۔

صائمہ امتیاز ساہی۔۔۔ منگووال غربی

چھوڑ گیا وہ پرانے سال کی طرح پرانے یار
اے نیا سال بھی مبارک' نئے یار بھی

اس دفعہ مجھے کرن کے شمارے کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ عثمان بھائی 14 جنوری کو خود ہی لے آئے تھے اور یقین کریں اتنا خوب صورت ٹائٹل کہ میں تو بس دیکھتی ہی رہ گئی دل ہی نہیں کر رہا تھا کہ نظریں ہٹائی جائیں دسمبر والا شکوہ تو آپ نے میرا دور ہی کر دیا۔ باقی اپنا انتخاب اور خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ فوزیہ ثمر بٹ سے مجھے اتنا ضرور کہنا ہے کہ میں آپ کی واحد خوشی کی ہرگز دشمن نہیں بن رہی ہیں۔ آپ بے فکر رہیے کیونکہ آپ تو بہت پہلے سے کرن کی قاری ہیں ہم تو نئے ہیں۔ کہنے کا مقصد تھا کہ سب کو جگہ ملنی چاہیے نا کیونکہ ہمارے نازک نازک سے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ فرح بھٹی کا تبصرہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی ان کا کہنا تھا کہ "دست کوزہ گر" کے صفحات بڑھائیں مگر اس دفعہ تو وہ سرے سے غائب تھا اور ساتھ ہی ساتھ "در دل" بھی۔ اللہ نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کو صحت کاملہ دے۔ (آمین) ویسے مایوسی بہت ہوئی کہ ہم بہت انتظار کرتے ہیں۔

"ساڈا چڑیا دا چنبا" معذرت کے ساتھ کہ جیسا اختتام میں چاہ رہی تھی ویسا نہیں ہوا نیرو کے صبر اور خاموشی نے

بہت غصہ دلایا بہر کیف چاروں قسطیں لاجواب تھیں۔ "وہ اک لمحہ محبت" پڑھ کر دل بھی خوش ہوا اور پسند بھی بہت آیا کیونکہ تحریر واقعی دلچسپ تھی اور ساتھ میں سمیرا شریف طور کو بہت ہی عرصے بعد کرن میں پڑھا۔ ناولٹ تو ایک ہی پڑھا ہے فی الحال "اک نئی محبت" پڑھ کر بہت دکھ ہوا شہریار اتنا گھٹیا شخص اپنے گھر کی لڑکیوں کو اپنے ہی مقصد کے لیے استعمال کرنے چلا تھا اور کومل اتنی بھی کومل نہیں تھی۔ دو' دو لڑکوں کو دانتوں تلے چنے چبوا دیے اور نام کومل' حیا بخاری نے بھی خوب لکھا عالیان اور زین کی دوستی بھی لاجواب اور عالیان کا کردار بھی۔

افسانے سارے ہی زبردست تھے اور سب سے زیادہ "ہمارے اور ہی روگ تھے" پسند آیا۔ ویسے موضوع بہت ہی پرانا' مگر انداز نیا تھا۔ "احترام محبت" افسانہ بالکل ہی افسانوی سا تھا اب ایسے اتفاق کہاں؟ "بند ہونٹوں کی بات" بشریٰ احمد نے آسان سے لہجے میں خوب ہی گہرا طنز لکھا مکافات عمل ایسے ہی ہوتے ہیں اپنے دور حکومت میں ظلم اور دوسروں کے دور حکومت میں مظلوم۔

"میری بھی سنیے" "میں میکال کو دیکھ کر حلق تک کڑوا ہو گیا ہم ان کو اتنی بار پڑھ چکے ہیں پلیز۔۔۔ سمیع خان کو بلوائیے یا پھر کسی اور کو۔۔۔ 10 فروری کو میری پیاری بہن اقصیٰ امتیاز کی برتھ ڈے ہے۔ سوچا اب کی بار شمارے کے ذریعے ہی وش کر دوں۔ سو ہیپی برتھ ڈے ڈیئر اقصیٰ سسٹر' ہمیشہ خوش رہو۔

صدف سلیمان۔۔۔ شور کوٹ شہر

کرن اسٹاف اور قارئین کو نیا سال بہت بہت مبارک' خدا کرے یہ نیا سال پاکستان کے لیے خوش حالی کا سال ہو اور ہر پاکستانی کو اس ملک میں امن سے رہنا نصیب ہو۔ اب نظر کرم کرن پر تو جناب اس بار کرن ہر بار کی طرح بہت دیر سے ملا یعنی 19 دسمبر کو اب 9 دن انتظار تو لمبا ہی ہوتا ہے اور مشکل بھی' شکایتیں بعد میں پہلے کرن کی کہانیوں پر تبصرہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ ہم بھی کرن میں دیر سے پہنچیں گے اور کرن میں دیر سے پہنچنے پر معافی بھی نہیں سیدھا ردی کی نوکری کے مہمان بنا دیے جائیں گے مکمل ناول "ساڈا چڑیا دا چنبا" نفیسہ جی کمال ہے آپ نے ایسی اسٹوری لکھی ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ کوئی کہانی ہے مجھے تو سچی اسٹوری لگتی ہے نیرو کے حالات بہت افسردہ کر دینے والے ہیں اس پر چار سال کے بیٹے کی اتنی بے رخی' کیا چار سال کا بچہ ماں کے ساتھ ایسا رویہ اپنا سکتا ہے؟ یقین نہیں آتا اور سکندر اس کا تو نام بھی سکندر نہیں ہونا چاہیے تھا جب بیوی سے کوئی تعلق نہیں تو پھر بچے اسے کیوں چاہئیں۔ قسط کا اختتام حیران کن اور متاثر کن بھی تھا۔ کیا بچے صرف باپ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ابھی صرف اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھا ہے۔ اگر سارا پڑھ کر تبصرہ کروں گی تو خط شائع نہیں ہوگا۔ اس بار سارے اشعار اور ساری غزلیں زبردست تھیں۔

صائمہ۔۔۔ جہلم

میری طرف سے کرن کی ٹیم کو محبت بھرا اسلام اور ڈھیر ساری دعائیں۔ میں کرن کو چار سال سے مسلسل پڑھ رہی ہوں اور امید کرتی ہوں آپ اپنی محفل میں مجھے ضرور شامل کریں گے۔ مجھے رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے ہر مہینے کے اینڈ میں بہت انتظار کرواتا ہے۔ پر جن سے محبت ہو ان کا انتظار کرنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ کرن کے تمام ناولز بہت اچھے ہوتے ہیں بلکہ پورا رسالہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ میں نے ان چار سالوں میں کرن رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

پلیز' پلیز میرا خط لازمی شامل کیجیے گا۔ ردی کی نوکری میں مت جانے دیجیے گا۔ تمام رائٹرز کو سلام و پیار اور کرن کی ٹیم کے لیے بہت سی دعائیں' ہمارا کرن دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین ثم آمین)

شازیہ فاروق احمد۔۔۔ رحیم یار خان

میں نے ایک تحریر لکھی ہے' لکھائی بہتر نہیں اور شاید آپ کے معیار کے مطابق بھی نہیں' مگر پھر بھی میں کرن میں بھیجنا چاہتی تھی' سو بھیج دی' آپ ہر ماہ کئی تحریروں کو ناقابل اشاعت میں شامل کرتی ہوں گی؟ مجھے یقین ہے

ماڈل	ردا اصفہانی
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا
لباس	کوئینک بوتیک

میری تحریر کو تھوڑی سی جگہ ضرور ملے گی۔ میرا نام آپ کے لیے نیا ہے۔ آپ کے سامنے میری کوئی اہمیت بھی نہ ہوگی۔ مگر آپ میری تحریر کو شامل اشاعت کرکے میری زندگی سنوار سکتی ہیں اور میری گزارش ہے۔ میری تحریر کو جگہ دے دیں۔ میں نے ہدایت نام رکھا ہے۔ اگر آپ کو نام پسند نہ ہو تو بدل دیں۔ کئی جگہوں پر غلطیاں ہوں گی پر آپ مجھے مایوس مت کیجیے گا۔ میں نے کرن کبھی پڑھا نہیں، لیکن اگلے ماہ ضرور پڑھوں گی۔ اگر آپ میری تحریر کو چھاپ کر مجھے یہ اعزاز بخشیں گی تو آپ کا شکریہ۔

عفیرا صبیحہ... گاؤں چھوکر خورد

آج پہلی بار کرن میں خط لکھنے کی جسارت کررہی ہوں یہ الگ بات ہے کہ کرن ہمارے گھر بچپن سے ہی آرہا ہے۔ یہ مت سمجھیے گا کہ ہم بچپن سے ہی بہت پڑھا کو تھے، نہ جی نہ، تب تو ہمیں لگتا تھا کہ گھر والے ہمیں اسکول بھیج کر ہم پر ظلم عظیم کررہے ہیں، تب تو ہم دادی امی کو حسرت سے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ کاش ہم بھی دادی امی ہوتے، کم از کم اسکول تو نہ جانا پڑتا۔ (ہی ہی ہی) خیر بچپن سے ہمارے گھر کرن اس لیے آرہا ہے کیونکہ امی پڑھتی ہیں۔ (جو کہ اب بھی پڑھتی ہیں۔)

اس ماہ کا شمارہ حسب روایت، حسب معمول، حسب عادت 13 تاریخ کو ملا سرورق کو دیکھ کر بے ساختہ منہ سے واؤ نکلا، بہت زبردست ٹائٹل تھا۔ مکمل ناول میں "ساڈا چڑیا دا چنبا" پڑھ کے دل میں سوچ آتی ہے کہ کیا دنیا میں ایسے بھی بے حس لوگ موجود ہیں؟ میں یہ نہیں کہتی کہ دنیا ظالم اور بے حس لوگوں سے پاک ہے، لیکن اتنا ظلم اور ایسی بے حسی؟ آفرین ہے بھئی نیبرہ کے صبر اور حوصلے پر۔

اس ماہ کے افسانے سب ہی اچھے تھے۔ افسانوں میں رائٹر واقعی دریا کو کوزے میں بند کردیتی ہیں اور یہ یقیناً رائٹر کا ہی کمال ہے، آل دا بیسٹ۔

مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ مگر مجھے کرن کتاب زیادہ پسند آئی۔ اس بات سے اجازت چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کی حفاظت فرمائے اور اسے شرپسندوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ (آمین) نیا سال سب کو مبارک ہو۔

نبیلہ ملک... چوتالہ

جنوری کا شمارہ 11 کو ہی مل گیا۔ ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں دوسری دفعہ خط لکھ رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس دفعہ ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا۔ "وہ ایک لمحہ محبت کا" سمیرا شریف طور نے تو کمال کردیا۔ ویل ڈن سمیرا جی کیپ اٹ اپ۔ نفیسہ سعید نے بھی اپنے ناول کا اختتام بہت بہترین کیا ہے سنان کا کردار بہت پسند آیا۔

میکال ذوالفقار سے ملاقات اچھی رہی اور یہ جو آپ نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، لیکن آپی میں نے آپ سے ایک گزارش کرنی تھی یہ جو آپ نے تصویر کی شرط رکھی ہے تو میری آپ سے گزارش ہے کہ جو لڑکیاں اپنی تصویر دینا چاہتی ہیں، وہ دیں، مگر آپ یہ شرط ختم کردیں پلیز، غور ضرور فرمائیے گا۔

میں نے دو کہانیاں آپ کی طرف بھیجی تھیں کیا وہ آپ کو مل گئی ہیں؟ کیا وہ قابل اشاعت ہیں؟ سب دوستوں کو سلام۔ آپی پلیز میرا خط ضرور شامل کیجیے گا۔ اللہ کرن کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

ج: پیاری نبیلہ! آپ اپنا انٹرویو بغیر تصویر کے بھی بھیج سکتی ہیں۔ آپ کی دونوں کہانیاں ناقابل اشاعت ہیں۔ فی الحال آپ مطالعہ پر توجہ دیں۔

نادیہ یاسین... بکرامنڈی راولپنڈی

ہم 1996ء سے یہ ڈائجسٹ پڑھ رہے ہیں۔ تب نانی اماں کے گھر جاکر پڑھتے تھے۔ پھر 98ء میں باقاعدہ ماہانہ وار پڑھنے شروع کیے مگر آج تک کبھی خط لکھنے کی جسارت نہ کرسکی آج پہلی مرتبہ محفل میں شرکت کررہی ہوں۔ پلیز خط ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالیے گا۔ ہم ساری بہنیں اب بھانجیاں بھی تینوں ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ سارے سلسلے ہی اچھے ہیں آپ کے تینوں ڈائجسٹ ہی معیاری ہوتے ہیں۔ تمام مصنفات اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن ایک چیز کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ جس کہانی میں بھی مسائل کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس کے بارے میں مصنفات کا مطالعہ بہت کم ہوتا ہے۔ وہ مسائل میں خرابی پیدا کرتی ہیں۔

اپنا انٹرویو بھیج رہی ہوں۔ پسند آئے تو شائع کردیجیے گا ورنہ زبردستی نہیں ہے تصویر میں نے کبھی بنوائی ہی نہیں اس لیے وہ میں نے بھیجی ہی نہیں۔ تمام اسٹاف کو سلام اور ڈھیروں دعائیں۔

✡ ✡